

ابنِ صفی

جلد نمبر

5

جاسوسی دنیا

15- آتشی پرندہ

16- خونی پتھر

17- بھیانک جزیرہ



قص

مے پول ہوٹل کی وسیع قفس گاہ روشنی کے طوفان میں ہنچکولے لے رہی تھی۔ نئے سال کا یہ پہلا عظیم الشان قفس تھا۔ فرش پر ثبت اور منفی قوتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رہنا ناچ رہی تھیں اور ان کے سروں پر لال پیلے، بنفشی نارنجی اور فاسی غبارے منڈلا رہے تھے۔ نیز سرگوشیاں اور ہلکے ہلکے ہونے تو قہقہے ہال کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ آرکسٹرا دھیمے سروں میں ناچ رہا تھا۔

انور اور رشیدہ بہت دیر سے ناچ رہے تھے اور اب انور کچھ اکتا سا گیا تھا۔ قفس کے دوران ہی اُس نے اچانک رشیدہ کو گدگد دیا اور وہ چل کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بال بال بچی ورنہ ایک جوڑے سے بُری طرح ٹکرا جاتی۔ رشیدہ کو ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ اُس کے اس رویہ پر کئی جوڑوں نے اُسے گھور کر دیکھا اور رشیدہ جھینپ کر ناچنے والوں کے مجمعے سے نکل گئی۔ انور بدستور اپنی جگہ پر سنجیدگی سے کھڑا اپنے سر پر منڈلاتے ہوئے غباروں کو دیکھ رہا تھا۔ کئی جوڑے اُسے متحیرانہ انداز میں گھورتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گئے اور وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ وہاں بالکل تنہا ہو۔ بہتیری رنگین مزاج عورتیں اسے لپٹائی ہوئی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ آج وہ ضرورت سے زیادہ ”انسان“ نظر آ رہا تھا۔ لباس کے معاملے میں آج اس نے خاصی خوش سلیقگی اور نفاست برتی تھی۔ رشیدہ کا خیال تھا کہ وہ اسے آہستہ آہستہ ”انسان“ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ آج وہ ہی اسے ضد کر کے یہاں لے آئی تھی اور خود اُسی نے اس کے سیاہ سوٹ کو اپنے ہاتھ سے پریس کیا تھا۔ لیکن اس کی اس حرکت سے وہ بُری طرح جھنجھلا گئی تھی اور

پیش رس

جاسوسی دنیا کا پندرہواں ناول ”آتشقی پرندہ“ ملاحظہ فرمائیے۔

اس بار خطوط کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ مشورے، تنقید اور تنقیص یکساں انداز کی باتیں۔ لہذا ان کے بارے میں کیا لکھوں۔ البتہ ایک صاحب نے کراچی سے مجھے لکھا کہ میں خواب غفلت میں کیوں پڑا ہوا ہوں۔ قوم کو سدھارنے کی کوشش بھی کروں۔ آپکا فرمانا بجا کہ میرے ہاتھ میں قلم ہے لیکن قوم اس قلم سے صرف کہانیوں کا نزول چاہتی ہے۔ اگر کبھی ایک آدھ جملہ کسی مثال کے طور پر بھی قلم سے رہٹ گیا تو قوم جھپٹ پڑتی ہے۔ ”آخر آپ کو سیاست میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“ اور میں ہکا بکا رہ جاتا ہوں کہ قوم کو کیا جواب دوں۔ کیونکہ جواب دینے کے سلسلے میں ایک ضخیم کتاب لکھنی پڑ جائے گی۔ پہلے تو قوم کو یہ بتانا پڑے گا کہ سیاست ہے کیا چیز، پھر عرض کرنا پڑے گا کہ میرے اس حقیر جملے کو اس کسوٹی پر پرکھیے۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی سیاست پائی جاتی ہو تو جو لیڈر کی سزا وہ میری سزا..... اور پھر بھائی اگر ملک میں سیاست دانوں کی کمی ہو تو تھوڑا بہت کثرت بھی اٹھالیا جائے۔ مجھے تو بس کہانیاں لکھنے دیجئے، میری لیڈری آپ بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ پھر خواہ مخواہ قوم کا وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ۔ قوم کے لئے اسکے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ دعا کروں۔ ”اے اللہ اس قوم کو ایک آزاد اور منفرد قوم کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رکھو۔“ آخر میں ان صاحب نے پوچھا ہے کہ لیڈر کی صحیح تعریف کیا ہے؟ بڑا بے ڈھب سوال کیا ہے آپ نے۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ البتہ اکبر الہ آبادی نے اپنے زمانے کے لیڈر کی تعریف یوں کی ہے۔

یوسف کو نہ دیکھا کہ حسین بھی ہیں جواں بھی

شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

والسلام

ابن صفی

اب تو اس کا غصہ اور بھی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ آخر یہ وہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ انور اس طرح اپنے اوپر اڑتے غباروں کو گھور رہا تھا جیسے اس کے جیب سے کوئی غبارہ نکل کر اُن میں جا ملا ہو اور وہ اب اسے پہچان کر دوبارہ پکڑنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ دفعتاً آکر شرا خاموش ہو گیا؟ ہال میں قہقہے گونج اٹھے۔ رقص کرنے والے ایک دوسرے کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالے میزوں کی طرف بڑھنے لگے۔

رشیدہ جھنجھلا کر انور کی طرف بڑھی۔

”تم پاگل ہو گئے ہو کیا۔“

”اوں.....!“ انور چونک کر بولا۔ ”میں پاگل کب نہیں تھا۔“

”اگر یہ سب حماقتیں کرنی تھیں تو آئے کیوں تھے؟“

”بھلا اس میں حماقت کی کیا بات ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”یہاں سب ہی ایک دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ سارے ہال والوں کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔“

”اگر متوجہ ہی کرتا تھا تو گدھے کی بولی بولنا شروع کر دیتے۔“

”اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ایسا نہ کروں گا۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لوگ اب بھی انہیں گھورے جا رہے تھے۔

”خدا کیلئے انسان بنو۔“ رشیدہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ”لوگ ہمیں احمق سمجھ رہے ہیں۔“

”تو اس سے ہماری شخصیت پر کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ارے تو کیا یہیں کھڑے رہو گے۔“ رشیدہ زچ ہو کر بولی۔

”تو چلو نا.....!“

دونوں ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ رشیدہ خاموش تھی۔ انور نے ایک بیرے کو بلا کر اسے کافی کا آرڈر دیا۔ اُن دونوں کے قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ انہیں ابھی تک تخریر آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کافی آئی۔ انور نے نظر ہچا کر رشیدہ کی پیالی میں شکر کی بجائے نمک گھول دیا اور کافی کا ایک گھونٹ لے کر سرگرمیٹ سلگانے لگا۔

رشیدہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انور کو پھٹکارنے کیلئے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک انور کو گھورتی رہی پھر اچانک بولی۔

”آدمی بنو آدمی..... اس قسم کی حرکتیں سوسائٹی میں پسندیدگی سے نہیں دیکھی جاتیں۔ لوگ ابھی تک ہمیں مہینکے خیز انداز میں گھور رہے ہیں۔ نہ جانے تم کب.....!“

”یہ غبارے کتنے حسین لگ رہے ہیں۔“ انور نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”تمہارا سر.....!“ رشیدہ نے جھلا کر کہا اور کافی کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی لیکن دوسرے ہی لمحے پیالی والا ہاتھ پیالی سمیت جھٹکے کے ساتھ میز پر آ رہا۔ کافی کا گھونٹ ابھی تک اس کے منہ میں تھا اور وہ انور کو گھور رہی تھی جو نہایت سنجیدہ اور انہماک کے ساتھ گیس بھرے غباروں کا جائزہ لے رہا تھا۔

رشیدہ نے بدقت تمام وہ گھونٹ حلق سے اتارا اور بے اختیار ہنس پڑی۔

اس ہنسی میں بیچارگی، جھنجھلاہٹ، لطف اندوزی کبھی کچھ شامل تھا۔ انور چونک کر اس کی طرف مڑا۔

”میں کچ کہتی ہوں انور کسی دن.....!“

”تم آخر میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔“ انور جھنجھلا کر بولا۔

”خیر! چلو آج گھر چل کر تمہیں اس مکاری کا مزہ چکھاؤں گی۔“

”آخر بات کیا ہے۔“

”تم نے میری پیالی میں نمک.....!“

رشیدہ جملہ پورا نہیں کر پائی تھی ایک معمر اور وجیہ عورت ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سفید ساری پہن رکھی تھی اور گلے میں ایک بیش قیمت ہار تھا۔ کلائیوں میں سونے کی جڑاؤ چوڑیاں تھیں، چہرے پر عجیب قسم کی نرمی تھی جیسے مامتا کی زیادتی کے علاوہ اور کسی دوسری چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ خدو خال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جوانی میں بے مثال خوبصورتی کی مالک ہوگی۔ عمر کافی ڈھل جانے کے باوجود بھی اس میں جاذبیت موجود تھی۔

”بچو! اگر میں یہاں بیٹھ جاؤں تو.....!“ عورت کچھ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

”شوق سے شوق.....!“ رشیدہ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

عورت ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔ انور اسے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم لوگوں میں بہت دیر سے دلچسپی لے رہی ہوں۔“ عورت مسکرا کر بولی۔

لیکن اس کی مسکراہٹ میں تضحیک کا پہلو نہیں تھا۔ لہجے میں بزرگانہ شفقت کے آثار تھے۔

رشیدہ شرمیلے انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ لیکن انور کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تھی۔

”میرا خیال ہے کہ یہاں اس وقت تمہارے علاوہ اور کوئی کافی نہیں پئی رہا ہے۔“

”ہم لوگ شراب نہیں پیتے۔“ رشیدہ بولی۔

”خوب! خوب..... مجھے ایسے بچے پسند ہیں۔“ عورت دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولی۔

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رشیدہ نے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انور اس

وقت کوئی کیلی کڑی بات کہے۔ عورت کے لہجے میں چھپا ہوا پیار اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا انور

دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ عورت نے رشیدہ سے کہا۔ انور اپنی پیالی خالی کر چکا تھا۔

”وہ..... وہ..... کچھ نہیں ٹھیک ہے۔“ رشیدہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”اوہ تو میں یقیناً یہاں بیٹھ کر خنجر ہوئی۔“ عورت اٹھنے کا ارادہ کرتی ہوئی بولی۔

”نہیں..... نہیں..... یہ بات نہیں۔“ رشیدہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔

عورت بیٹھ گئی لیکن وہ انور کی طرف بار بار دیکھ رہی تھی، جو اکتائے ہوئے انداز میں جلدی

جلدی سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

”بات یہ ہے کہ اس کافی میں دو چمچے نمک ہے۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی اور انور کی طرف

دیکھنے لگی۔

وہ عورت مسکرا کر انور کی طرف مڑی۔ پھر دفعتاً ذرا بلند آواز میں بولی۔ ”محمود! محمود میں

ادھر ہوں۔“

رشیدہ نے مڑ کر دیکھا ایک آدمی ایک نوجوان عورت کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ تھا تو جوان ہی لیکن اس کی چڑھی ہوئی گھنی مونچھوں نے اسے قبل از وقت معمر اور سنجہ و نڈا

تھا۔ پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی۔ لباس کے رکھ رکھاؤ سے خوش سلیقہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے

ساتھ والی عورت خدو خال کے تیکھے پن کی وجہ سے مزاج کی چڑچڑی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں

آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ عورت بڑی مونچھوں والے کی طرف مخاطب

ہو کر بولی۔

”آپ لوگوں کی تعریف.....!“ وہ انور اور رشیدہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

پھر دفعتاً انور پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔ وہ اُسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔

”ان لوگوں سے یہیں ملاقات ہوئی ہے۔“ معمر عورت بولی۔

اجنبی انور کو برابر گھورے جا رہا تھا۔ انور کی نگاہیں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اجنبی۔

انداز میں تھیرتا تھا۔ انور اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اسے پہچانتا ہو لیکن اس کے اظہار میں پہل

نہیں کرنا چاہتا۔

”آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔“ اجنبی مسکرا کر آہستہ سے بڑبڑایا۔

انور مسکرانے لگا۔ رشیدہ اور وہ دونوں عورتیں انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

”تم اتنے باسلیقہ کب سے ہو گئے ہو۔“ اجنبی مسکرا کر بولا۔

”اور تم نے اپنے ہونٹ پر یہ ابائیل کب سے پالی ہے۔“ انور نے پوچھا۔

اجنبی جھینپ کر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”ارے تو کیا تم ایک دوسرے سے واقف ہو۔“ معمر عورت گرجوٹی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”اس طرح جیسے داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ سے۔“ اجنبی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تین دن سے

اس کی تلاش میں ہوں۔“

”تو کیا یہ انور ہیں۔“ معمر عورت متعجبانہ انداز میں بولی۔

”ہاں.....!“ اجنبی مسکرا کر بولا۔ ”انور! یہ میری چچی اماں رانی صاحبہ ہری پور ہیں اور یہ

میری بیوی شاہدہ۔“

انور ان دونوں سے ہاتھ ملا کر کرسی کی پشت سے نکل گیا۔

”آخر تم نے بھی شادی کر ہی ڈالی۔“ انجی نے انور سے کہا۔

”تم غلط سمجھے..... یہ میری دوست خان بہادر رشیدہ خاں ہیں۔“ انور نے کہا اور رشیدہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ میرے کلاس فیلو محمود علی خاں ہیں۔ ہری پور کے جاگیردار۔“

”رشیدہ..... کون رشیدہ۔“ رانی صاحبہ چونک کر بولیں۔ ”کیا وہی جس نے داراب کو قتل کر کے دس ہزار کا انعام حاصل کیا تھا۔“

”جی وہی.....!“ انور مسکرا کر بولا۔

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ رانی صاحبہ گرم جوشی سے رشیدہ کا ہاتھ دباتی ہوئی بولیں۔ ”لیکن یقین نہیں آتا..... تم بہت پیاری بچی ہو! تم نے اسے کس طرح قتل کیا ہوگا۔“

”باقاعدہ مقابلہ کر کے.....!“ رشیدہ نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک بار ذرا سا چوکھا تھا کہ میرے پستول کی گولی نے اس کا بھیجا اڑا دیا۔“

”تم واقعی دلیر لڑکی ہو۔“

انور نے دوبارہ کافی کا آرڈر دیا۔ محمود کی بیوی بدستور خاموش تھی۔ اس دوران میں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہ دکھائی دی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ انور اور رشیدہ کو کمتر سمجھ کر ان سے اکتا رہی ہو۔ کافی آئی لیکن اس نے اپنی پیالی الٹ کر رکھ دی۔ محمود کے چہرے پر غبار سا چھا گیا۔ شاید اسے اپنی بیوی کی یہ حرکت ناگوار گذری تھی۔

”یہ کافی نہیں پیتیں۔“ محمود نے ندامت آمیز لہجے میں کہا اور اس کی بیوی ہونٹ سکڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”بہت اچھا کرتی ہیں۔“ انور نے لا پرواہی سے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”تم میں واقعی حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ہے۔“ محمود نے انور سے کہا اور پھر رانی صاحبہ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرا اور ان کا لباس کا مقابلہ رہتا تھا۔ مگر یہ ظالم قیمتی سے قیمتی سوٹ اتنے بے ڈھنگے پن سے استعمال کرتا تھا کہ کلیجہ خون ہو جاتا۔ شرارتوں کی دھوم سارے کالج میں تھی۔“

”اور اس وقت بھی ایک شرارت ہی کی بناء پر مجھے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔“ رانی صاحبہ ہنس کر بولیں اور پھر انہوں نے پورا واقعہ دہرا دیا۔ محمود بے ساختہ ہنسنے لگا لیکن اس کی بیوی

بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

”میں دراصل ایک مسئلہ پر غور کرنے لگا تھا۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں یہ سوچ رہا تھا کہ آدمی اب سے ہزاروں سال پہلے ہی اچھا تھا۔ جب وہ ڈھولکوں کی تھاپ پر اچھل کود کر اُسے ناچ کہتا تھا۔ اس طرح کم از کم اُسکے جسم میں توانائی ہی آتی تھی۔ بھلا آج کے مہذب ناچ میں کیا رکھا ہے۔ آرکسٹرا کی روں روں اور گھوں گھوں کے ساتھ کیڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔“

”یارتہاری اس لڑی کھوپڑی نے تمہیں تباہ کیا ہے۔“ محمود متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ”ورنہ اتنی بڑی جائیداد.....!“

”محمود پلیز.....!“ انور احتجاجاً ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں پرانی باتیں سننا پسند نہیں کرتا۔“

”خیر..... خیر.....“ محمود سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ ”اور سناؤ کیسی گذر رہی ہے۔“

”تم مجھے تلاش کیوں کر رہے تھے۔“ انور نے پوچھا۔

”بھی ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے۔“ محمود نے کہا اور رانی صاحبہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ یہ کسی آدمی کے بس کا روگ نہیں۔“ رانی صاحبہ متفکرانہ انداز میں بولیں۔

”ہم لوگ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“ محمود رانی صاحبہ کا جملہ نظر انداز کر کے انور سے بولا۔ ”ایک خوفناک پرندہ ہری پور والوں کی پریشانیوں کا باعث بنا ہوا ہے۔“

”پرندہ.....!“ انور ہنس کر بولا۔ ”تم کیا مجھے چڑے مار تصور کرتے ہو۔“

”مذاق نہیں انور یہ بہت اہم معاملہ ہے۔“ محمود نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ انور خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

”اُسے آتش پرندہ کہنا چاہئے۔“ محمود آہستہ سے بولا۔ ”ایک ایسا پرندہ جس کے پروں سے آگ نکلتی رہتی ہے۔ اڑان کے انداز سے کبوتر معلوم ہوتا ہے۔“ انور بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ رشیدہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

”یارتہ محمود ابھی تک ویسے ہی ہو۔ تمہاری شاندار غمیں اکثر یاد آیا کرتی ہیں۔“ انور ہنس کر بولا۔ محمود جھنجھلا کر اُسے گھورنے لگا۔

”یہ حقیقت ہے۔“ رانی صاحبہ سنجیدگی سے بولیں۔ ”لیکن محمود کا یہ خیال غلط ہے کہ تم اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکو گے۔“

انور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”لیکن قصبہ والے پریشان کیوں ہیں۔“ انور نے کہا۔ اُس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”جس عمارت پر وہ اترتا ہے اس میں آگ لگ جاتی ہے۔“ محمود نے کہا شروع کیا۔

”اب تک کتنی پختہ عمارتوں اور متعدد جھوپڑوں میں آگ لگ چکی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی بھوت ہے، جو قصبہ والوں کے پیچھے پڑ گیا ہے لیکن میں اسے تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔“

”کیوں؟ یقین نہ کرنے کی وجہ؟“ انور نے پوچھا۔

”میں ان چیزوں کا قائل نہیں۔“ محمود نے کہا۔

”تم نے اپنی آنکھوں سے اس پرندے کو دیکھا ہے۔“

”ہاں..... دوبار.....!“

”اور پھر بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ کوئی خبیث روح نہیں ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”قطعی.....!“

”آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔“ انور رانی صاحبہ کی طرف مڑا۔

”میں یقیناً اُسے کوئی خبیث روح سمجھتی ہوں اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ میں نے آج تک کسی آتش پرندے کے متعلق نہیں سنا اور پھر ایک پتھر کا مقبرہ بھی جلتا ہوا دیکھا گیا جس میں لکڑی یا کسی جلنے والی چیز کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ خالص پتھر کا مقبرہ۔“ رانی صاحبہ خاموش ہو کر انور کی طرف مٹی خیز انداز میں دیکھنے لگیں۔

”تو کیا وہ پرندہ روز دکھائی دیتا ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں..... دوسرے تیسرے دن۔“

”اور کب سے نظر آنے لگا ہے۔“

”تقریباً پندرہ یا بیس یوم سے۔“

”آتشزدگی کے علاوہ کوئی اور حادثہ۔“ انور نے پوچھا۔

”ابھی تک تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا۔“

”کبھی کسی نے اس پرندے کا تعاقب بھی کیا ہے۔“

”نہیں! کسی کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔“ رانی صاحبہ بولیں۔ ”محمود نے کئی بار کوشش کی لیکن میں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔“

”کیا وہ ہمیشہ ایک ہی سمت سے نمودار ہوتا ہے۔“

”لوگ یہی کہتے ہیں۔“ محمود بولا۔ ”وہ جنگل کی طرف سے آتا ہے۔ تم شاید ہری پور کبھی نہیں گئے۔ قصبہ کے مشرق تیکنارے سے کچھ دور ہٹ کر جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ سلسلے کچھ دور کے بعد سے ناقابل عبور ہو گئے ہیں۔ میلوں تک کروندے کی کانٹے دار جھاریاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں پار کرنا ناممکن ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ منحوس پرندہ اسی طرف سے آتا ہے۔ ایک بار میں نے سوچا تھا کہ اس پر فائر کروں مگر چچی اماں نے سختی سے روک دیا۔“

انور کچھ سوچنے لگا۔ بقیہ لوگ اُسے گھور رہے تھے۔

”اور اس پتھر کیوں بھول گئے۔“ محمود کی بیوی شاہدہ تیوری چڑھا کر بولی۔

محمود چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے انداز میں بیچارگی تھی۔ احتجاج تھا۔

رانی صاحبہ موقع کی نزاکت کا احساس کر کے فوراً بولیں۔

”بہورانی کا خیال کچھ اور ہے۔ ہری پور میں ایک دیوانی لڑکی بھی لوگوں کے خوف کی وجہ بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر کسی جن کا سایہ ہے اور وہی اس بتائی کی ذمہ دار ہے، جیسے ہی پرندہ دکھائی دیتا ہے اس لڑکی کی ڈراؤنی چیخیں اور دل ہلا دینے والے قہقہے سارے قصبہ میں گونجنے لگتے ہیں۔“

”میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔

”آپ کیوں تسلیم کرنے لگے۔“ شاہدہ زہر خند کے ساتھ بولی۔

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر اداسی سی پھیل گئی اور کوئی چھپا ہوا غم اُس کی آنکھوں میں کر دٹیں لینے لگا۔

”وہ لڑکی کون ہے؟“ انور نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ڈاکٹر کی بہن ہے۔“

”ڈاکٹر کیسا آدمی ہے۔“

”اگر میں اُسے فرشتہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔“ رانی صاحبہ بولیں۔ ”اس نے اپنی زندگی خدمت خلق کے لئے وقف کر دی ہے۔ آج سے دو سال قبل وہ ہری پور میں آیا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی خدمات کی وجہ سے لوگوں کے دل جیت لئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دیوانی بہن سارے قے میں اودھم مچاتی پھرتی ہے کوئی کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتا۔“

”کیا وہ ہری پور میں پاگل ہوئی ہے یا اس سے پہلے سے تھی۔“

”ڈاکٹر کا بیان ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایسی ہے۔“

”لیکن تعجب ہے کہ ڈاکٹر اسے اس طرح آزادانہ پھرنے دیتا ہے۔“ انور نے سگریٹ

سلاگتے ہوئے کہا۔

”وہ تو اُسے بعض اوقات باندھ کر رکھتا ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح نکل جاتی ہے۔“

”ڈاکٹر کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی وہیں ہری پوری میں رہتے ہیں۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں..... صرف وہ اور اس کی بہن۔ دو تین نوکر۔“ رانی صاحبہ نے کہا۔

”وہ ملٹری میں ڈاکٹر تھا۔ کسی وجہ سے اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ اکثر ہری پور میں بھی

فوج کے آفیسر اس کے پاس آتے رہے ہیں۔“

”اس کی مالی حالت کیسی ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”کافی مالدار آدمی ہے۔“ رانی صاحبہ نے کہا۔ ”ہری پور کے مضافات میں اس نے کچھ

جائیداد بھی خریدی ہے۔“

انور کچھ سوچنے لگا۔

”تو اب تم چاہتے کیا ہو۔“ اُس نے محمود سے پوچھا۔

”ہمارے ساتھ ہری پور چلو۔“

”معاملہ ہے تو دلچسپ۔“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اچھا خیر میں کوشش کروں گا۔“

”کوشش نہیں۔“ محمود نے کہا۔ ”تمہیں چلنا پڑے گا۔“

”چلو نا.....!“ رشیدہ ٹھٹھک کر بولی۔ ”میں تھوڑی تفریح چاہتی ہوں۔“

”اچھا تو کیا تم بھی چلو گی۔“ انور بولا۔ ”مگر تمہیں کسی نے نہیں مدعو کیا۔“

”ارے بھی شوق سے..... شوق سے..... مجھے بڑی ہوشی ہوگی۔“ محمود جلدی سے بولا۔

شاہدہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ رشیدہ نے شاید اس کے خیالات بھانپ لئے تھے۔

لہذا وہ جلدی سے بولی۔

”ارے بھلا میں کہاں جا سکتی ہوں۔“

”کیوں.....؟“ رانی صاحبہ نے پوچھا۔

”یونہی! میں آج کل بہت مصروف ہوں۔“

”تمہیں تو چلنا ہی پڑے گا۔ تم بہت پیاری بچی ہو۔“ رانی صاحبہ نے کہا۔

”نہ جانے کیوں میرا دل چاہا تھا کہ تم سے جان پہچان پیدا کروں۔ ویسے یہاں اور بھی

میزیں خالی ہیں۔“

”خیر میں پرسوں ہری پور پہنچ جاؤں گا۔“ انور نے کہا۔

”اور تمہا نہیں آؤ گے۔“ رانی صاحبہ مسکرا کر بولیں۔

”رشتہ کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔ بعض اوقات یہ اس لڑکی سے بھی زیادہ پاگل ہو جاتی

ہے، جس کا تذکرہ ابھی آپ لوگوں نے کیا تھا۔“

رشیدہ نے انور کو گھور کر دیکھا اور انور سگریٹ سلاگنے لگا۔

”نہیں تم انہیں ضرور لاؤ گے۔“ رانی صاحبہ نے کہا۔

”تمہاری موٹھیں بہت خوفناک ہیں۔“ انور نے محمود سے کہا۔

”مضحکہ اڑانا شروع کر دیا تم نے۔“ محمود مسکرا کر بولا۔

”لیکن ان حالات میں ان کا وجود غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔“

محمود پہلے تو کچھ نہیں سمجھا لیکن انور کی نگاہیں اپنی بیوی کی طرف اٹھی دیکھ کر وہ اس کے

طنزیہ ریمارک کی تہہ تک پہنچ گیا۔

”خیر تو پرسوں تم ہری پور پہنچ رہے ہو۔“ محمود گلا صاف کرتا ہوا بولا۔

”اسی لئے تو میں نے ایک ماہ کی چھٹی لی ہے تاکہ تم کم از کم ایک ماہ تک تو سکون کی زندگی

بسر کر سکو۔“ انور ہنس کر بولا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ظاہر ہے کہ مہمانوں کی موجودگی میں تم پر عتاب نازل ہونے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر اضمحلال پھیل گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کی کار ہری پور کی طرف جارہی تھی۔

”تو تمہاری ازدواجی زندگی ناکام رہی۔“ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔

محمود اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ اس تذکرے سے پہلو تہی کرنا چاہتا ہو۔

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد گلا صاف کرتا ہوا بولا ”شادی ایک قسم کا جوا

ہے..... اندھی چال۔“

”مجھے خوشی ہے کہ میں جواری نہیں ہوں۔“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

”لیکن عورت بہر حال ضروری ہے۔“ محمود پھکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”چاہے وہ بیوی

ہو چاہے دوست۔“

رشیدہ نہ جانے کیوں خود بخود مسکرانے لگی۔

”جب رشو نہیں تھی تب بھی میں مطمئن تھا۔“

”لیکن آدمی نہیں تھے۔“ محمود نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ فخریہ انداز میں کار کے باہر

دیکھنے لگی۔

”جسے تم آدمی سمجھتے ہو وہ آدمی تو میں اب بھی نہیں ہوں۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”تو تم اب بھی مشین ہو۔“ محمود ہنس کر بولا۔ ”میں سمجھا تھا شاید اس عرصے میں نظریات

تبدیل کر دیئے ہوں گے۔“

”یہ نظریہ نہیں بلکہ میرا ایمان ہے۔“ انور جلتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے سے سگریٹ

سلگاتا ہوا بولا۔

رشیدہ اس گفتگو سے اکتا رہی تھی۔ اُسے خوف ہوا کہ کہیں یہ دونوں کسی فلسفہ میں نہ الجھ

”ہاں..... آں.....!“ انور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ محمود زیادہ تر کالج کی پچھلی زندگی کے بارے

میں گفتگو کر رہا تھا۔

پراسرار لڑکی

دو دن بعد انور اور رشیدہ ٹرین پر بیٹھے ہوئے احمد نگر کی طرف جارہے تھے۔ احمد نگر ایک

چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے ہری پور کا فاصلہ آٹھ میل تھا۔ اسٹیشن سے قصبے تک ایک پختہ

سڑک تھی جو قصبے والوں نے اپنی ضروریات کے لئے بنوائی تھی۔ رانی صاحبہ ہری پور کی ایک ترقی

پسند عورت تھی۔ اس سڑک کی تعمیر میں ان کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ کچھ اس ایک سڑک ہی پر منحصر

نہیں، قصبے والوں کے آرام و آسائش کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا تھا۔ قصبے میں متعدد جگہ

بورنگ پائپ لگوائے تھے۔ ایک شفا خانہ اپنے خرچ سے تعمیر کرایا تھا۔ بچوں کے لئے چھوٹے

چھوٹے کئی سکول قائم کئے تھے جہاں جدید طریقہ تعلیم رائج تھا۔ قصبے میں ایک ہائر سکینڈری سکول

بھی تھا لیکن اس کا تعلق براہ راست حکومت کے محکمہ تعلیم سے تھا۔ ویسے یہ سکول بھی رانی صاحبہ کی

کوششوں سے قائم ہوا تھا اور وہ اس کی انتظامیہ کمیٹی کی صدر تھیں۔ بہر حال انہوں نے اس بات

کی حتی الامکان کوشش کی تھی کہ ہری پور ایک ترقی یافتہ قصبہ سمجھا جائے۔ احمد نگر کے اسٹیشن پر محمود

کار لئے موجود تھا جیسے ہی ٹرین رکی محمود کے ملازمین انور کے سامان پر ٹوٹ پڑے۔

”میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اپنی پرانی عادت کے مطابق بھول نہ جاؤ۔“ محمود نے اس

سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”تم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”ہم ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئے ہیں

اور چھٹی ختم کئے بغیر یہاں سے واپس نہ جائیں گے۔“

”بھئی خدا کی قسم تم نے یہ کہہ کر مجھ میں نئی زندگی ڈال دی ہے۔“ محمود اُسکا ہاتھ دباتا ہوا بولا۔

جائیں اس لئے کہ قبل اس کے کہ محمود کوئی جواب دیتا وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

”کیا یہ سارا علاقہ ہری پور سے تعلق رکھتا ہے۔“

”جی ہاں.....!“ محمود نے کہا۔ ”ابھنکر تو صرف ریلوے اسٹیشن کا نام ہے، ورنہ اور

سارا علاقہ ہری پور کا زرعی علاقہ ہے۔“

”مجھے دیہات کی زندگی بہت پسند ہے۔“

”محض اس لئے کہ آپ شہر میں رہتی ہیں۔“ محمود ہنس کر بولا۔ ”اگر آپ خدا نخواستہ کم

دیہات سے متعلق ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کہتیں۔“

”اُن تار کے درختوں میں وہ تالاب کتنا حسین لگ رہا ہے۔“ رشیدہ ایک طرف انگلی اٹھا

ہوئی بولی۔

”اس سے بھی اچھا لگ رہا ہے رشو.....!“ انور مسکرا کر بولا۔ ”اب ہم بقول تمہارے کڑا

خشک بحث نہ چھیڑیں گے ورنہ تم کسی جگہ کی ہوئی بھینس کی طرف انگلی اٹھا کر کہو گی.....“

دیکھو ملکہ صحرا پاں چبا رہی ہے..... کسی بندر کی طرف اشارہ کر کے کہو گی وہ دیکھو راجپور آواں

ہو گیا..... کسی گیدڑ.....!“

محمود بے اختیار ہنس پڑا اور رشیدہ جھلا کر انور کو گھورنے لگی۔

”میں سچ کہتا ہوں کہ یہ آدمی نہیں ہے۔“ محمود نے کہا۔

”بنتے ہیں۔“ رشیدہ منہ سکڑ کر بولی۔ ”اپنے کو عام آدمیوں سے الگ تھلک ظاہر کرنے کا

خط ہو گیا ہے۔“

”دیکھو یہ فرق ہوتا ہے بیوی اور دوست میں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”رشو کتنی آزادی

میرے متعلق اظہار خیال کر رہی ہے۔“

”اچھا بس چپ رہو۔“ رشیدہ بگڑ کر بولی۔

”چپ ہو گیا۔“ انور نے کہا اور محمود کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ محمود ان کی لڑائی میں کافی

دلچسپی لے رہا تھا۔

”اگر تمہاری بیوی تمہیں کسی اجنبی کے سامنے ڈانٹ دیتی۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”تو تمہارا

کیا عزت ہوتی؟ نہ تو تم اسے کچھ کہہ سکتے اور نہ برداشت ہی کر سکتے۔ محض اس لئے کہ آج کا

آدمی قدامت اور نئی تہذیب کی درمیانی دلدل میں نرمی طرح پھنسا ہوا ہے۔ ایک طرف تو اُسے

آج کی مساوات سمجھتی ہے اور دوسری طرف صدیوں پرانا ضمیر، جو عورت کی حکومت کا عادی ہو چکا

ہے۔ ذہن کے چور دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔ نتیجہ قہر درویش پر جان درویش۔ تب دن

میں مبتلا ہو جائے نہ آپ صحیح معنوں میں مساوات برت سکتے ہیں اور نہ کھلم کھلا عورت پر اپنی

حاکمیت جتا سکتے ہیں۔ بس گھٹتے رہئے۔ اس کے برخلاف اگر عورت بیوی کے بجائے دوست

ہے تو اس قسم کی الجھنیں پیدا ہی نہیں ہونے پاتیں۔ یقین کرو میں اور رشیدہ ایک دوسرے کی پٹائی

تک کر بیٹھتے ہیں لیکن ہمارے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہوتے۔“

”پھر تم نے فضول کو اس شروع کی۔“ رشیدہ جھلا کر بولی۔

”ارر..... لا حول..... لا..... اچھا محمود اب بس۔“ انور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتا ہوا بولا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر محمود بولا۔

”میں تم سے بالکل متفق ہوں۔ سچ سچ آج کی ازدواجی زندگی بہت بھیا تک ہے اور تم نے

اس کی جو وجہ بتائی ہے اُسے میں درست سمجھتا ہوں۔ یہی الجھاوا مجھے خاموش رکھتا ہے اور میں

سارے خاندان میں زن مرید مشہور ہو گیا ہوں اور مجھے زن مرید کہنے والے جاہل نہیں بلکہ اعلیٰ

تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔“

”تعلیم یافتہ“ انور ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”یہ سب جاہل ہیں، انہیں میں کتوں اور سٹوروں سے

بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ ان میں کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ نہ یہ خود کو پہچان سکتے ہیں

اور نہ دوسروں کو۔“

محمود خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔

”اور میرا خیال ہے کہ تم بھی انہیں لوگوں کی صف میں آتے ہو۔“ رشیدہ بولی۔

”میں تمہارے خیال کی قدر کرتا ہوں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”اور آئندہ بھی کرنے کی کوشش

کروں گا۔“

تھوڑی دیر بعد کار قصبے میں داخل ہو رہی تھی۔

یہاں چاروں طرف بڑی بڑی نئی اور پرانی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ راستوں اور گلیوں میں گندگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ محمود کا مکان جو قصبے کے مغربی کنارے پر واقع تھا قصبے میں ”حولی“ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ حویلی تین یا چار مربع فرلانگ میں پھیلی ہوئی تھی۔ درمیان میں قدیم وضع کی ایک شاندار عمارت تھی اور چاروں طرف قد آدم چہار دیواری تھی، جو مختلف قسم کے بانگوں کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھی۔

اماٹے میں کار داخل ہوتے ہی کئی نوکر اٹھ کر کار کی طرف دوڑے۔

”ذرا ان کی حفاظت اور فرمانبرداری دیکھو“ محمود مسکرا کر بولا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اگر یہ اس طرح دوڑیں گے نہیں تو ہم بُرا مان کر واپس چلے جائیں گے۔“

”تم جاگیرداروں کی عجیب حالت ہے۔ ایک طرف تو تم یہ چاہتے ہو کہ یہ تمہارے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا رہیں اور دوسری طرف ان کا احساس کمتری مضحکہ خیز بھی معلوم ہوتا ہے۔“

”یاد تم تو بات بات پر تنقید کرنے لگتے ہو۔“

نوکروں نے کار کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ کار ایک بہت ہی طویل وعریض برآمدے کے سامنے جا کر رکی۔ رانی صاحبہ برآمدے ہی میں موجود تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ رشیدہ کو اندر لے گئیں۔

اُسی دن شام کو رشیدہ محمود اور انور پائیں باغ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ محمود کی بیوی کسی بات پر جھنجھلا کر ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی اور انور اس پر محمود کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔

”یاد مجھے تو دماغ کا ایک آدھ اسکر یوڈھیلا معلوم ہوتا ہے۔“

”تم سچ کہتے ہو۔ میں پاگلوں میں گھرا ہوا ہوں۔“ محمود نے کہا۔

”اچھا اب ختم بھی کر دے قصہ۔“ رشیدہ انور کو گھور کر بولی۔

”صحیح معنوں میں رشیدہ صاحبہ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”وہ سمجھتی ہیں کہ یہ“

میرا ایک کمزور پوائنٹ ہے اور میں اس پر تبصرہ نہیں چاہتا۔“

”خیر..... گھبراؤ نہیں۔ مجھے اس جڑے پن کی گہرائیوں میں کچھ نظر آرہا ہے۔“ انور

نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ محمود چونک کر بولا۔

”تمہاری کوئی غلطی یا شاہدہ کی غلط فہمی۔“ انور اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

محمود کے ہونٹوں پر بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ کسی فوری جذبے کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے؟ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ دراصل انور یہاں آ کر کچھ مضحکہ خیز ہو گیا تھا۔ یہاں کی پرسکون فضا اس کے ہنگامہ پسند مزاج کے لئے سازگار نہ تھی۔ ہر لحظہ زندگی میں ایک نئی تبدیلی کی توقع رکھنے والے ماحول کی یکسانیت کو پسند نہیں کرتے۔ وہ یہاں کبھی نہ آتا لیکن تجسس پسند طبیعت سمجھتی ہی آئی۔ وہ بے چینی سے اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”ہاں بھی.....!“ وہ تھوڑی دیر بعد محمود کو مخاطب کر کے بولا۔ ”کیا تم مجھے وہ جگہ بتا سکتے ہو جہاں سے وہ تمہارا آتش پرندہ آتا ہے۔“

”اگر جگہ معلوم ہوتی تو تمہیں کیوں تکلیف دیتا۔“

”میرا مطلب سمت سے ہے۔ تم نے جنگلوں کے کسی سلسلے کا تذکرہ کیا تھا۔ کیوں نہ ہم لوگ ادھر ہی چلیں.....“ انور نے کہا۔

”اس وقت..... کمال کر دیا۔ ارے تھوڑی دیر بعد رات ہو جائے گی؟ اور رات کو اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں۔“

”اچھا تو کیا پھر تم نے محض اُس پرندے کی زیارت کے لئے یہاں بلایا تھا؟“ انور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہ بات نہیں! ابھی پچھلے ہی ہفتے اس طرف قتل کی ایک واردات ہو چکی ہے۔“

”قتل.....!“ انور دلچسپی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ”کس کا قتل۔“

”مقتول یہاں کا باشندہ نہیں تھا۔“

”یعنی یہاں اس قصبے میں کوئی اُسے پہچان نہ سکا؟“

”ہاں.....!“

”معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”جب اُسے کوئی جانتا ہی نہیں تھا تو حیثیت کے متعلق کیا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔“

”تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔“ انور سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا بولا۔ ”پوچھنا یہ ہے کہ وہ تمہاری طرح مہذب تھا یا تمہارے نوکروں کی طرح گنوار۔“

”میں نے اس کی لاش نہیں دیکھی تھی۔“

”ارے بھی کچھ سنا تو ہوگا۔ اُس کا لباس کیسا تھا؟“

”چونکا دینے والا۔“ محمود مسکرا کر بولا۔

”یعنی.....!“

”وہ بالکل بچکا تھا.....!“

”میں سنجیدگی چاہتا ہوں.....!“ انور تلخ لہجے میں بولا۔

”جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے۔“

”پولیس کس نتیجے پر پہنچی۔“

”ابھی تک تو کسی نتیجے پر نہیں۔“

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً چوک پڑا۔ ابھی ابھی اس نے کچھ سنا تھا۔ اُس نے معنی خیز انداز میں محمود کی طرف دیکھا اور پھر پھانک کے قریب ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ وحشیانہ قہقہہ۔ ایسا قہقہہ جس میں مسرت کے بجائے خوفناک قسم کا کھوکھلا پن تھا۔ ایسا قہقہہ جس میں کسی قسم کی تحریک کا شائبہ بھی نہ تھا۔

انور پھانک کی طرف مڑا۔ چوکیدار نے پھانک بند کر دیا تھا۔ ایک لڑکی سلاخیں تھامے پھانک کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اُس نے دھانی رنگ کے سائٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ انگارہ ہو رہا تھا اور بڑی بڑی آنکھیں اندھیری رات کے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ انور محمود کی طرف مڑا۔

”یہ وہی ہے۔“ محمود آہستہ سے بولا۔ اُس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔

”کون..... وہی پاگل لڑکی۔ جس کا تم نے تذکرہ کیا تھا۔“

محمود نے سر ہلا دیا۔

”چوکیدار کو کہو پھانک کھول دے۔“ انور نے کہا۔

”نہیں.....!“

”کیوں.....!“ انور اُسے گھورتا ہوا بولا۔

”اگر اس کی جان لینا چاہتے ہو تو ضرور کھلوادو۔“

”کیوں.....!“

”اگر شہیدہ کو خبر ہوگی تو وہ اسے شکاری کتوں سے نچوڑا لے گی۔“

”کیوں.....!“

”وہ کہتی ہے کہ جس دن اس نے ہمارے کمپاؤنڈ میں قدم رکھا میں اُس پر شکاری کتے

چھوڑ دوں گی۔“

”اس کی وجہ۔“

”بھئی وجہ میں کیا جانوں۔“ محمود اکتا کر بولا۔

”انور اٹھ کر پھانک کی طرف بڑھا۔ اُس کے اٹھتے ہی رشیدہ بھی اس طرح اٹھی جیسے وہ

بھی انور ہی کے جسم کا ایک حصہ ہو۔ انور پھانک کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لڑکی کو قریب سے دیکھتے ہی وہ مبہوت ہو گیا۔ اس کی دشت زدہ آنکھوں میں ہلاکی کی کشش تھی اور ہونٹوں پر ایک بیباک مسکراہٹ چہرہ تمنا بھرا تھا۔ رشیدہ انور کے پیچھے کھڑی اُسے گھورتی رہی تھی۔

”تم کیا چاہتی ہو۔“ انور نے پوچھا۔

”تمہارا سر.....! تمہارے سنہری بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر تمہاری گردن اتار لوں گی اور پھر راستے بھر تمہارے کٹے ہوئے سر سے خون کے قطرے ٹپکتے جائیں گے۔ میں جلد بے کی بیٹی ہوں۔ میرے گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے۔“

”تم بہت خوبصورت ہو۔“ انور آہستہ سے بولا۔

”تم بھی خوبصورت ہو۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”خوبصورت مردوں کا خون بہت لذیذ ہوتا

ہے۔ اس بڑی مونچھوں والے کو بھی یہاں بلاؤ۔ میں اس کے گالوں کا گوشت چباؤں گی۔“

انور نے مڑ کر دیکھا محمود اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا تھا۔

”ہٹاؤ بھی کیوں پاگل کے منہ لگتے ہو۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

”اٹا یہ کون رنگلی ہے۔“ لڑکی رشیدہ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اس کی رگوں میں خون کی بجائے شہد معلوم ہوتا ہے۔ جاؤ اسے کھا جاؤ۔ اسکی بوئیاں نوچ کر ہولے ہولے چباؤ۔“

”لیکن میں تو تمہاری بوئیاں چبانا چاہتا ہوں۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”ادھر ہٹو.....!“ رشیدہ نے انور کا بازو پکڑ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور خود لڑکی سے بولی۔

”جاؤ..... بھاگ جاؤ..... نہیں تو جویلی والے تمہارے پیچھے شکاری کتے چھوڑ دیں گے۔“

لڑکی نے ایک فلک شکاف تہقہ لگایا اور بولی۔ ”تو کیا میں اس بڑی مونچھوں والے ڈرتی ہوں۔ وہ میرے پیر چاٹتا ہے اور میں کسی دن جویلی کو الٹ دوں گی۔ میں خود ایک شکار کتیا ہوں۔ تمہاری گردن میں اپنے نوکیلے دانت چھو کر خون چوس سکتی ہوں۔“

”بھاگ جاؤ..... بھاگ جاؤ..... میں سچ کہتی ہوں شکاری کتے تمہیں نوچ ڈالیں گے۔“

”میں اس سے نہیں ڈرتی۔“ لڑکی سنجیدگی سے بولی۔ ”میں تو چاہتی ہوں کہ میرے جسم پر نچے اڑ جائیں۔ خون کے نوارے اڑیں جب میں اپنی زخمی ہونٹوں پر زبان پھیر دوں تو نمکین خون..... نمکین خون۔“ وہ اس طرح اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی جیسے سچ مچ اس کے ہونٹوں میں خون ہو۔

دفعتاً اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ رشیدہ نے پلٹ کر دیکھا۔ محمود کی بہن شاہدہ تین خطرناک کتوں کی زنجیریں تھامے برآمدے سے اتر رہی تھی۔

”انور خدا کے لئے اسے بھگا دو.....!“ محمود چیخا۔

شاہدہ آہستہ آہستہ پھانک کی طرف آرہی تھی۔

”وہ دیکھو.....! وہ رہے کتے۔ جلدی بھاگو۔“ رشیدہ نے سلاخوں سے باہر ہاتھ نکال کر اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”یہ جویلی الٹ جائے گی۔“ لڑکی چیخ کر بولی۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ میں ان کتوں کو جاؤں گی۔“

انور پھانک کی طرف جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے میں وہ پھانک کے باہر تھا۔ چونکدار پھر پھانک بند کر دیا۔ انور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر گھسٹتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔ لڑکی پہلے تو لڑکھائی

پھر وہ بھی کوئی تعرض کئے بغیر اس کے ساتھ دوڑنے لگی۔

ادھر محمود اپنی بیوی سے الچھ پڑا۔

”کیا تم بھی پاگل ہو گئی ہو۔“

”میں اپنے معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔“ شاہدہ نے تلخی سے کہا۔

”لوگ کیا کہیں گے۔“ محمود بے بسی سے بولا۔

”مجھے کسی کی پروا نہیں۔“

”مگر..... وہ اندر کب آئی تھی۔“

”خیر کبھی تو ہاتھ لگے گی۔“ وہ کتوں کو لے کر جویلی کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔

”آخر کیوں؟“ محمود میساختہ بولا۔

شاہدہ قہر آلود انداز میں بیٹی اور شعلہ باز نگاہوں سے محمود کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کتوں کی زنجیریں کھینچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

آتش پرندہ

انور لڑکی کا ہاتھ تھامے قصبے کے ویران حصے میں دوڑ رہا تھا۔

”ٹھہرو..... ٹھہرو..... سڑک کے بچے اب مجھ سے نہیں دوڑا جاتا۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

انور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ ایک کھیت میں گر پڑی۔

”اگر میں اس وقت نہ ہوتا تو شکاری کتے تمہارا خاتمہ کر دیتے۔“ انور کھیت کی مینڈھ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

لڑکی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم کسی شکاری کتے سے کم ہو۔“ لڑکی تہقہ لگا کر بولی۔ ”کیا تم مجھے نہیں نوچو گے۔“

”فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔“ انور سرگرمیت سلگاتا ہوا بولا۔

”ایک سگریٹ مجھے بھی دو۔“ لڑکی نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”کہیں اپنے کپڑوں میں آگ نہ لگالیتا۔“

”کیا مجھے پاگل سمجھتے ہو۔“

”نہیں قطعی نہیں۔“ انور اُس کی طرف سگریٹ کیس بڑھاتا ہوا بولا۔

لڑکی نے سگریٹ لے کر سلگایا اور پہلے ہی کش میں نرمی طرح کھانسنے لگی۔

”تم بہت اچھے آدمی ہو۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں کے لوگ بہت نرمے ہیں۔ کوئی

مجھ سے بات تک نہیں کرتا۔ عورتیں مجھے گھروں میں گھسنے نہیں دیتیں۔ بچے مجھ سے ڈرتے ہیں۔

میرا بھائی بہت ظالم ہے وہ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔“

”چہ چہ.....!“ انور ہمدردانہ انداز میں بولا۔ ”واقعی بہت نرمی بات ہے۔“

”میں کسی دن سب کو تباہ کر دوں گی۔“

”ضرور..... ضرور..... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ بہروپ کیوں بھرا ہے۔“

”بہروپ..... کیسا بہروپ..... ضرور تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

دفعتاً انور کی نگاہ جنگل کی طرف اٹھ گئی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اسے باتوں کی

رو میں وقت کا بھی احساس نہیں رہ گیا تھا۔

”چلو تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔“ انور نے لڑکی سے کہا۔

”میں کوئی بچہ ہوں۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”جب میرا دل چاہے گا خود چلی جاؤں گی۔“

دفعتاً انور چونک پڑا۔ جنگل کی طرف سے کوئی روشن اور متحرک چیز فضا میں پرواز کرتی ہوئی

اسی طرف آرہی تھی۔ لڑکی نے ایک چیخ ماری اور بے تحاشہ جنگل کی طرف دوڑنے لگی۔ انور نے

اسے پکڑنا چاہا لیکن پودوں کے جھکڑ میں الجھ کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کے قہقہے کہیں دور سنائی

دے رہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد پرواز کرتی ہوئی روشن چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ یہ وہی آتش پرندہ تھا

جس کے لئے انور یہاں آیا تھا۔ اس کا جسم انگارے کی طرح دھبہ رہا تھا۔ اڑان سچ مچ کبوتر

جیسی تھی۔ انور خائف تو نہیں ہوا لیکن حیرت کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر جم سا گیا تھا۔

اُس کی زندگی میں یہ اپنی طرز کا انوکھا واقعہ تھا جسے وہ کوئی معنی نہ پہناتا تھا۔

دوسرے لمحے میں وہ اُس کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔

پرندے نے پورے قہبے کا چکر لگایا اور پھر ایک عمارت کے گرد منڈلانے لگا۔ پورے قہبے

میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ پرندہ اسی عمارت کا

طواف کر رہا تھا۔ دفعتاً اندر سے ایک آدمی ہاتھ میں رائفل لئے ہوئے نکلا۔ اُس کے ساتھ دو

آدمی اور تھے جیسے ہی اُس نے رائفل اٹھائی دونوں آدمیوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

”پاگل نہ بنو ڈاکٹر معلوم نہیں کیا حادثہ ہو۔“ ایک بولا۔

”تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اپنا گھر جلتا ہوا دیکھوں۔“ رائفل والا بولا۔

”پھر بھی یہ خطرناک ہے۔“

”میں ڈرپوک نہیں ہوں۔“ رائفل والے نے کہا اور نال سیدھی کرنے لگا۔ اُن دونوں

نے پھر اُسے روک دیا۔

پرندہ بدستور عمارت کا چکر لگا رہا تھا۔

انور آہستہ آہستہ اُن لوگوں کی طرف بڑھا۔ قبل اس کے وہ لوگ اس کی طرف مڑتے انور

رائفل چھین چکا تھا۔ ان لوگوں کی حیرت رُفح ہونے سے پہلے ہی اس نے پرندے پر گولی

چلا دی۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور فضا میں بے شمار چنگاریاں منتشر ہو گئیں۔ پرندے کے

پر نچے اڑ گئے تھے۔ چنگاریاں زمین پر گرنے سے قبل ہی ٹھنڈی ہو گئیں اور پھر چاروں طرف

ایک بے کراں سناٹا چھا گیا۔

”تم کون ہو۔“ ایک آدمی انور کی طرف بڑھتا ہوا خوفزدہ آواز میں بولا۔

لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اُن کے گرد اکٹھا ہونے لگے تھے۔

انور نے کوئی جواب دینے کی بجائے رائفل خاموشی سے اس کے ہاتھ میں تھادی۔ کسی

نے اس کے چہرے پر برقی نارنج کی روشنی ڈالی۔

”آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔“ کسی نے پوچھا۔

”حویلی کا ایک مہمان۔“ انور پر اطمینان لہجے میں بولا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”لیکن یہ آپ نے کیا کیا؟“

”تو کیا آپ لوگوں کو اس خوفناک پرندے سے محبت تھی۔“ انور نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی نہیں۔“ ایک آدمی سخت لہجے میں بولا۔ ”اب اگر ہمارے اوپر کوئی نئی مصیبت نازل

ہوئی تو۔“

”مجھے اس کی توقع نہیں۔“

”لیکن یہ دھماکہ کیسا تھا۔“ کسی نے کہا۔

”روایات کے مطابق شاید آج اس عمارت کی باری تھی۔“ انور نے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ رافیل والا انور کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ”میں آپ کا

شکر گزار ہوں یہ لوگ مجھے کبھی گولی نہ چلانے دیتے۔“

پھر وہ انور کا ہاتھ پکڑ کر اسے عمارت کے اندر لے جانے لگا۔

”آج یقیناً یہ عمارت راکھ کا ڈھیر ہوتی۔“ وہ آدمی بولا۔ ”مجھے قطعی اس بات کا خوف نہیں

ہے کہ اب کیا ہوگا۔“

انور اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک طویل القامت اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر تیس اور

چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنے حلقوں میں ساکت آنکھیں اس کی دانشمندی اور ذہانت کا

ثبوت دے رہی تھیں۔ لہجے میں ٹھہراؤ اور گفتگو کا پرسکون انداز مستقل مزاجی کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں ڈاکٹر ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”مجھے نصیر الرحمان کہتے ہیں۔“

”میرا نام انور سعید ہے۔“

”آپ یہاں کب آئے۔“

”آج ہی۔“

”آپ کو اس پرندے کے متعلق پہلے سے معلوم تھا۔“

”نہیں، اس قسم کا پرندہ میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔“ انور نے کہا۔

”اور ہم تو ہفتوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نصیر مضمحل آواز میں بولا۔ ”متعدد مکانات

جل گئے۔“

”آپ کا اس پرندے کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”میرا خیال۔“ ڈاکٹر نصیر فکر مند لہجے میں بولا۔ ”قدیم اور جدید پرندوں کی تاریخ میں کہیں

ایسے پرندے کا تذکرہ نظروں سے نہیں گذرا۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرح یہ بھی نہیں کہہ سکتا

کہ وہ کوئی خبیث روح ہے۔ حقیقت تو یہ ہے انور سعید صاحب کہ میں خود ابھی تک کسی نتیجے پر

نہیں پہنچ سکا۔“

”اور اس دھماکے کے متعلق جو اس پر گولی پڑتے ہی پیدا ہوا تھا۔“

”وہ بھی تجریر خیز تھا اور وہ چنگاریوں کا انتشار.....“ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا اور انور کے

چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دوسرے کمرے میں اُسی پاگل لڑکی کا قہقہہ سنائی دیا اور ڈاکٹر کا

چہرہ تاریک ہو گیا۔

”اودہ معاف کیجئے گا مسٹر انور۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں ابھی حاضر ہوا۔“

ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور انور آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

لڑکی کے چیخنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر واپس

آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پلکیں میگی ہوئی تھیں۔

”وہ میری بہن تھی۔“ ڈاکٹر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اُس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے

اور میں بالکل بے بس ہوں۔ میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔“

”مجھے افسوس ہے اور ساتھ ہی آپ سے ہمدردی بھی۔“ انور نے کہا۔ ”میں اُس کے متعلق

سن چکا ہوں کیا یہ صحیح ہے کہ وہ زنجیریں توڑ ڈالتی ہے۔“

ڈاکٹر خاموشی سے انور کو دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔

”قطعی غلط! لوگ مبالغہ آرائی کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں یہ افواہ بھی سنی جاتی ہے

کہ وہ آتش پرندہ کوئی آسیب تھا جس سے سلیہ متاثر ہے۔ بات یہ نہیں ہے۔ میں خود تک آ کر

اسے کھول دیتا ہوں۔ اُس کی دردناک چیخیں مجھ سے نہیں سنی جاتیں۔ انور صاحب میں اسے

بہت چاہتا ہوں، وہ پاگل ضرور ہے لیکن آج تک اس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”یہ کیفیت کب سے ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”بچپن ہی سے۔“ ڈاکٹر کے لمبے میں ہلکی ہٹ تھی۔

”واقعی افسوس ناک بات ہے۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ڈاکٹر بولا۔

”کیا آپ حویلی والوں کے کوئی عزیز ہیں۔“

”نہیں..... محمود میرا دوست ہے۔ میں چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

”آپ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔“

”جی ہاں.....!“ انور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب اجازت دیجئے۔“

”مسٹر انور آپ کا احسان مند ہوں۔“ ڈاکٹر نے اٹھ کر اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

انور باہر نکل آیا۔ چاروں طرف اتھاہ سناٹا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں اور روشندانوں سے مدہم روشنی چھن رہی تھی۔ انور کے قدموں کی آواز سناٹے میں گونج رہی تھی۔ دفعتاً کتے بھونکنے لگے۔ دو ایک نے انور پر چھپنے کی بھی کوشش کی، لیکن وہ مدہم سروں میں سیٹی بجاتا ہوا نہایت اطمینان سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر سے کسی نے اُس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور قدموں کی آہٹیں اُس کے قریب آتی گئیں۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ کسی نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

”کون محمود.....!“ انور رک کر بولا۔

”میں تمہاری تلاش میں نکلا تھا۔“ محمود نے کہا۔ ”چچی اماں بہت ناراض ہیں۔ پرندے؛

رائفل چلانے کی خبر اُن تک پہنچ گئی ہے۔ دھماکے کی آواز تو ہم لوگوں نے بھی سنی تھی لیکن“

رائفل کی آواز سے کئی گنا زیادہ تھا۔“

”ہاں.....!“ انور آگے بڑھتا ہوا بولا۔ دونوں حویلی کی طرف واپس جا رہے تھے۔

”اس دوران میں رشیدہ نے انہیں تمہارے جنگلی پن کے بہترے قصے سنا ڈالے ہیں۔“

محمود نے کہا۔

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”میں کل واپس چلا جاؤں گا۔“

”کیوں.....؟“

”میں اسی پرندے کی حقیقت کا انکشاف کرنے کے لئے آیا تھا۔ لہذا جس طرح میرا دل

چاہے گا کام کروں گا۔“

”میں نے کچھ نہیں کہا۔“ محمود جلدی سے بولا۔ ”تم اُن کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔“

”میں ان تکلفات اور ڈھکوسلوں کا عادی نہیں۔“ انور منہ بنا کر بولا۔ ”ہاں یا نہیں.....“

درمیانی گفتگو سے مجھے چڑھ ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ محمود بے چینی سے بولا۔

”خیر چھوڑو.....! ڈاکٹر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“ انور نے کہا۔

”اچھا آدمی ہے..... بہت نیک اور بہت شریف۔“

”اور اس کی بہن..... اُسے تو تم خود ہی دیکھ چکے ہو۔“ محمود نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کا دماغی خلل زیادہ پرانا نہیں۔“

”کیا مطلب.....!“ محمود چونک کر بولا۔ ”لیکن..... لیکن..... ڈاکٹر کا تو یہی بیان ہے۔“

”یہ مرض جوانی سے پہلے کا نہیں معلوم ہوتا۔“

”کیوں یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو؟“

”تجربے کی بناء پر..... اس کی ساری باتیں اذیت پسندوں جیسی ہوتی ہیں۔ خون پینا.....

گوشت چبانا وغیرہ وغیرہ..... کیا یہ سب چیزیں اس کی کچلی ہوئی جنسیت کی طرف اشارہ نہیں

کرتیں۔ جنسی احساس سے پہلے کی خلل دماغی کی یہ علامات نہیں ہوتیں۔“

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شاہدہ اس پر شکری کتے کیوں چھوڑنے جا رہی تھی۔“ انور نے پوچھا۔

”میں خود یہی سوچتا ہوں کہ وہ اس سے پر خاش کیوں رکھتی ہے۔“ محمود نے کہا۔

”شاہدہ تمہارے خاندان ہی کی لڑکی ہے۔“

”ہاں.....!“ محمود چونک کر بولا۔ ”لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں، یونہی۔“ انور نے کہا اور رک کر سگریٹ سلگانے لگا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر محمود نے پوچھا۔

”تم ڈاکٹر کے یہاں تھے۔“

”ہاں.....!“ انور بولا۔ ”مجھے سلیمہ سے ہمدردی ہے۔“

”یعنی.....!“

”یعنی کیا؟ کیا میں اس یعنی کامطلب پوچھ سکتا ہوں۔“

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔ میں دراصل شاہدہ کے آج کے رویے کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

”آخر تم اس سے خائف کیوں رہتے ہو۔“

”خائف؟ نہیں تو..... بات یہ ہے کہ میں ہنگامہ نہیں پسند کرتا۔“

”تو تم دونوں کے تعلقات ناخوشگوار ہیں۔“

”نہیں ایسا بھی نہیں ہے؟“

”تو کیا بنائے خامصمت ڈاکٹر کی بہن ہے۔“

”نہیں تو..... نہیں تو..... بھلا وہ کیوں ہونے لگی..... بالکل نہیں۔“

”مجھ سے اڑنے کی کوشش فضول ہے۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”تم نہ جانے کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔“

”بالکل سیدھی ہانک رہا ہوں پیارے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میری نظریں دور تک پہنچ رہی ہیں۔“

”بیکار باتیں مت کرو۔“

”خیر..... خیر..... دیکھا جائے گا۔“

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اُس کی رفتار کچھ سست پڑ گئی تھی۔

جنگل

دوسرے دن صبح ہی صبح انور نے شکار کھیلنے کی تجویز پیش کر دی۔ پچھلی رات رانی صاحبہ اُس

آتش پرندہ

جلد نمبر 5

سے بڑی دیر تک بحث کرتی رہی تھی، لیکن انور نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے اُن کی بزرگی

پر حرف آتا۔ رشیدہ کے لئے یہ بات تعجب خیز رہی تھی۔ اُس نے انور کو کبھی ایسے موڈ میں نہیں

دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں انور کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے۔ اس کے دل

میں رانی صاحبہ کے لئے بے پناہ احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی محرک رانی صاحبہ کی مامتا

تھی۔ انور کو برا بھلا کہتے وقت بھی اُن کے لہجے میں تلخی کے بجائے مامتا تھی لیکن حقیقت تو یہ ہے

کہ انور اس چیز سے قطعی متاثر نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ اگر وہ رانی صاحبہ

سے لڑ بیٹھا تو اُسے حویلی سے چلا جانا پڑے گا اور آتش پرندے کا وجود ہمیشہ کے لئے پردہ راز

میں چھپ جائے گا۔ گاؤں والے اُس کی رات والی حرکت پر اُس سے الجھ چکے تھے۔ انہیں صرف

اس بات کا خیال تھا کہ انور رانی صاحبہ کا مہمان تھا اور نہ شاید اس کو اُسی وقت گاؤں چھوڑ دینا

پڑتا۔ پھر بھی گاؤں میں اس کے خلاف کافی پروپیگنڈا ہو گیا تھا اور گاؤں والے کسی تازہ میسر

کے خنجر تھے۔

حویلی میں قریب قریب ہر فرد نے اس واقعے پر تہرہ میں حصہ لیا تھا لیکن محمود کی بیوی

شاہدہ بالکل خاموش تھی اور خاموشی بھی ایسی جس سے بے تعلقی ظاہر ہوتی تھی۔

انور محمود اور رشیدہ شکار کے لئے تیار ہی تھے کہ ایک شخص کُشی میں داخل ہوا جسے دیکھتے ہی

محمود کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اُس نے سفید پتلون اور سفید قمیض پہن رکھی تھی۔ عمر پچیس اور تیس

کے درمیان تھی۔ قد متوسط چال سے رعونت ظاہر ہوتی تھی۔ کسی طرح دیکھتے وقت پر غرور انداز

میں بھنوں تان لیتا تھا۔

رانی صاحبہ بھی اس کی آمد پر خوش نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ انور کی نظریں بے اختیار شاہدہ

کی طرف اٹھ گئیں جو آنے والے کو خاص توجہ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

”کیوں بھی محمود تم نے بھی شکار کھیلنا شروع کر دیا۔“ وہ محمود کی رائفل کی طرف اشارہ کرتا

ہوا بولا۔

”کیوں.....؟“ محمود ایسے لہجے میں بولا جیسے اُس پر جھپٹ پڑے گا؟

”میں نے کہا اس کی آواز سے تمہارا دل نہ دھڑکنے لگے گا۔“ اُس نے کہا اور بے ڈر پن سے ہنسنے لگا۔

”عمران.....!“ رانی صاحبہ غصے سے بولیں۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا خالہ صاحبہ۔“

”محمود اسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے کچا چٹا جائے گا۔“

”اور یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے رات اُس پرندے پر گولی چلائی تھی۔“ اس نے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جناب والا.....!“ انور قد رے جھک کر بولا۔

”آدی رنگ باز معلوم ہوتے ہو۔“

”عمران.....!“ رانی صاحبہ پھر گرھیں۔

”میں اس وقت نشے میں نہیں ہوں خالہ صاحبہ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”عمران.....!“ رانی صاحبہ کھڑی ہو کر بولیں۔ ”ادھر آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ایک دوسرے کمرے کی طرف مڑیں۔ عمران اُن کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے مسکرا کر رشیدہ کی طرف دیکھا اور رشیدہ نے اپنی مٹھیاں بھیجنے لیں۔

محمود کا موڈ خراب ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی خوش مزاجی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُن کی تیل گاڑی اونچے اونچے نیچے راستوں سے گذرتی ہوئی جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ محمود کی تجویز تھی کہ شکار کے لئے کاروباری استعمال کی جائے لیکن رشیدہ تیل گاڑی پر گئی۔ وہ دیہاتی زندگی سے اچھی طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

”یہ کون بزرگوار تھے۔“ انور نے محمود سے پوچھا۔

”چچی اماں کے بھانجے ہیں۔“ محمود تفریح آمیز لہجہ میں بولا۔

”رانی صاحبہ اس سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔“

”خاندان میں کوئی خوش نہیں ہے۔ کسی دن میرے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگا۔“

”کیوں.....؟“

”تم نے دیکھا نہیں شاہدہ کو میرے خلاف بھڑکانے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔“

”آخر ایسا کیوں۔“

”حد! محض اسلئے کہ میں چچا کی جائیداد کا وارث ہوں اور چچی اماں اسے منہ نہیں لگاتیں۔“

”شاہدہ کا اُس سے یا رشتہ ہے۔“

”پھوپھی زاد بہن ہے۔“

انور خاموش ہو گیا۔ اُس کی نظریں دور تک پھیلے ہوئے جنگل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ابھی تک ہمیں شکار نہیں ملا۔“ رشیدہ بولی۔

”جھیل پر کچھ آبی پرندے ملیں گے۔“ محمود نے کہا۔

”رشو کا خیال تھا کہ شاید شکار ہاتھ باندھے ہوئے ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا اور

کہے گا جو مزاج یار میں آئے یا شاید.....!“ انور کچھ اور کہتے کہتے رک گیا۔ اُس کی نگاہیں

کروندے کی کانٹے دار جھاڑیوں کے سلسلے پر جم گئیں تھیں۔

”کیا یہی وہ کروندے کا جنگل ہے۔“ انور نے محمود سے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”اور اسے پار کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔“

”میں نے خود کبھی کوشش نہیں کی..... ویسے سنا یہی ہے۔“

”لیکن..... وہ دھواں کیسا ہے۔ کیا ادھر بھی آبادی ہے۔“

”ہاں..... ادھر بھیلوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں، جنہیں کروندے کے جنگل نے کم از کم

ہمارے قصبے سے الگ کر دیا ہے۔“

”یہ سلسلہ کتنا وسیع ہے۔“

”شاید پندرہ یا بیس میل..... دوسری طرف شوری ندی درمیان میں حائل ہو گئی ہے اور اس

طرح مہذب علاقے بھیلوں کی دستبرد سے آزاد ہو گئے ہیں۔ لیکن گرمیوں کے زمانے میں جب

ندی کا پانی کم ہو جاتا ہے وہ دوسری طرف کے علاقے میں ڈاکے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔“

”تم نے شاید یہی بتایا تھا کہ وہ پرندہ اسی طرف سے آیا کرتا تھا۔“

”تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔“ رشیدہ نے انور سے پوچھا۔

”کسی آدمی کی شرارت۔“

”لیکن یہ چیز میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ کل رات میں نے اُسے حویلی سے دیکھا تھا۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں بدستور گردنہ کی جھاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”وہ دیکھو..... اس کینخت نے فائر شروع کر دیے“ محمود جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
”خواہ مخواہ پرندوں کو اڑا رہا ہے۔“

”ممکن ہے شکار ہی کھیل رہا ہو۔“ انور نے کہا۔

”اگر وہ پوائنٹ ٹو ٹو بور کی رائفل لے کر گیا ہوتا تو میں قطعی یہ نہ کہتا۔“

تھوڑی دیر بعد وہ جھیل پر پہنچ گئے۔ عمران کی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی تھی اور وہ گھاس پر اوندھا لیٹا پائپ پی رہا تھا۔

”کیا یہاں جھیل پر گھڑیاں بھی ہیں۔“ انور بلند آواز میں بولا۔

”نہیں تو.....!“ محمود نے کہا۔

”وہ پھر ادھر کنارے پر کیا پڑا ہے۔“ انور اسی لہجے میں بولا۔ ”اوہ لاجول ولا قوہ..... کوئی آدمی ہے۔“

عمران اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی اور آنکھیں رشیدہ پر جمی ہوئی تھیں۔

”رشو.....!“ انور آہستہ سے بولا۔ ”کیا خیال ہے۔“

”اس سے ہم لوگوں کا تعارف کرا دیجئے۔“ رشیدہ نے محمود سے کہا۔

”میں اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”ہماری خاطر.....!“ انور مسکرا کر بولا۔

محمود ایک لمحہ کے لئے بالکل ساکت ہو گیا۔ پھر عمران کو مخاطب کر کے بولا۔

”تو تم نے سب پرندے اڑا دیئے۔“

”پھر.....؟“ انور اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”قصبے میں یہی مشہور ہے..... خود مجھے اتفاق نہیں ہوا۔“

دفعتاً کہیں دور موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔

”کیا یہ پھیل موٹر سائیکل بھی چلاتے ہیں۔“ رشیدہ چونک کر بولی۔

”آواز ادھر سے نہیں آرہی ہے۔“ محمود ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”یہ عمران معلوم ہوتا ہے اور ادھر ہی آ رہا ہے۔ اس میں یہ خطبہ ہے۔ وہ تم لوگوں کے سامنے مجھ پر اپنی برتری جتانے کی کوشش کرے گا۔“

”خوب..... آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل دکھائی دی۔ عمران اپنے کانڈھے پر رائفل لٹکائے نیل گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اُنکے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان پر دھول جھونکتا ہوا موٹر سائیکل آگے نکال لے گیا۔

”غالباً جھیل کی طرف گیا ہے۔“ محمود غصے میں بولا۔ ”اب شکار ملنے کی توقع نہیں۔“

”فکر مت کرو۔“ انور نے کہا۔ ”میں اس سے جان پہچان پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جھیل کتنی دور ہے۔“

”قرب ہی ہے تمہیں اس سے مل کر خوشی نہ ہوگی۔“ محمود بولا۔

”کیوں انور کوئی نئی شرارت سوچھی۔“ رشیدہ نے کہا۔

”نہیں رشو..... وہ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے کسی مقصد کے لئے اُسے استعمال بھی کر سکوں۔“

”کس مقصد کے لئے.....!“ محمود چونک کر بولا۔

”جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

”مگر تم نے تو کل ہی اُسے نشانہ بنادیا۔“

”نہیں پیارے تمہارا خیال غلط ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”وہ آسانی سے اس قصبے کا پتہ نہیں چھوڑ سکتا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”مطلب یہ کہ شاید مجھے آج بھی اُس پر فائر کرنا پڑے۔“

محمود اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بڑا شکار تو اس طرف ہے۔“ عمران کروندے کے جنگل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
”یعنی.....؟“

”جنگلی لڑکیاں.....!“ عمران نے کہا اور ہنسنے لگا۔

”تو پھر ادھر ہی۔“

”کوئی راستہ نہیں۔“

انور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔

”وہ آتش بازی والی بارت کیا تھی۔“

”محمود پر رعب ڈال رہا تھا۔“ عمران بچوں کی طرح ہنس کر بولا۔ ”وہ مجھے بدنام کرتا ہے

لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ ذلیل ہے۔ آپ جیسے شریف آدمیوں کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔“

”لیکن وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔“

”مکار ہے..... شایدہ کے دکھوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔“

”یعنی.....!“

”اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں بہت کمینہ ہوں انور صاحب۔ مگر پھر بھی مجھ میں تھوڑی بہت انسانیت ہے۔“

”خیر..... خیر..... مگر وہ پرندہ کیسا تھا۔“ انور نے کہا۔

”آپ نے اس پر گولی چلا کر اچھا نہیں کیا۔ قصبے والے کسی نئی مصیبت کے منتظر ہیں۔“

”آخر وہ ہے کیا بلا.....؟“

”بھیلوں کا کوئی جادو..... وہ کروندے کے جنگل ہی کی طرف سے آتا ہے۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ اس کا تعلق ڈاکٹر نصیر کی پاگل بہن سے ہے۔“ انور نے کہا۔

عمران کے منہ سے بے اختیار بھانت بھانت کی گالیوں کا طوفان پھوٹ پڑا۔

”یہ بھی اسی محمود کے پٹھے کی حرکت ہے۔“

”یعنی.....!“

”یہ وہ رائفل ہے جس سے ہاتھیوں کا شکار کیا جاتا ہے۔“ وہ اپنی رائفل کی طرف اشارہ کر کے بولا اور انور نے اپنی ناک سکوڑی کیونکہ اس کے منہ سے دیسی شراب کا بھپکا نکلتا تھا۔

”کوئی ہاتھی شکار کیا آپ نے؟“ انور چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

عمران اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”آپ خود کو تیس مار خاں سمجھتے ہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”کل رات والی آتش بازی پر

رائفل چلا کر آپ کچھ مغرور ہو گئے ہیں۔“

”آتش بازی.....؟“ انور خمیر ظاہر کرتا ہوا بولا۔

”جناب.....؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”کسی شریر لڑکے کی حرکت۔“

”چھوڑو بھی۔“ محمود انور کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ”یہ اس وقت نشے میں ہے۔“

عمران نے قہقہہ لگایا اور رشیدہ کی طرف دیکھنے لگا۔ رشیدہ جواباً مسکرائی۔

”آپ لوگوں کی تعریف.....!“

”میرے دوست مسٹر انور اور مس رشیدہ۔“ محمود منہ سکوڑ کر بولا۔

”آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میرا نام عمران ہے اور میں اس

قصبے کا ایک شریف آدمی ہوں۔ ویسے کچھ لوگ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن میں انہیں ایک دن سیدھا کر دوں گا۔“

”ضرور ضرور.....!“ انور نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ پھر محمود اور رشیدہ کی طرف مڑ کر کہنے

لگا۔ ”تم لوگ تیل گاڑی پر شکار کھیلو۔ میں عمران صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتا ہوں۔“

”اوہو..... ضرور..... بڑی خوشی سے۔“ عمران موٹر سائیکل کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

قبل اس کے محمود کچھ کہتا..... رشیدہ بول اٹھی،

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم لوگ یہاں انتظار کریں گے۔ شاید کچھ پرندے جھیل میں گریں۔“

عمران نے موٹر سائیکل اشارت کی اور انور کیریر پڑ بیٹھ گیا۔

”کس طرف.....!“ عمران نے پوچھا۔

”کوئی بڑا شکار عمران صاحب۔“ انور آہستہ سے بولا اور موٹر سائیکل چل پڑی۔

”اس قسم کی افواہیں ہمیشہ حویلی سے اڑا کرتی ہیں۔“ عمران جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
”آخر کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے۔“ عمران آہستہ سے بولا۔
”مجھے اُس حویلی کی ایک ایک اینٹ سے نفرت ہے۔“
”مگر رانی صاحبہ تو آپ کی خالہ ہیں۔“
”ہوں گی۔“ عمران لا پرواہی سے بولا۔

انور کی نظریں کروندے کے جنگل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ واقعی یہ ایک ناقابلِ عبور جگہ تھا۔ کروندے کی گھنٹی اور کانٹے دار جھاڑیاں میلوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ اتنی گھنی اور بلند کہ دوسری طرف نظریں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ان کے درمیان کہیں کہیں اکاؤ کا پتیل کے درخت نظر آ رہے تھے۔

”تو کیا جنگلی لڑکیاں واقعی اچھی ہوتی ہیں۔“ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔
”غضب کی..... اب میں کیا بتاؤں۔“

”تو پھر ادھر چلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دو۔“ انور نے کہا۔
”راستہ.....!“ عمران ہنس کر بولا۔ ”وہ راستہ ہمیں جہنم میں پہنچا دے گا۔“
”یعنی.....!“

”اول تو راستہ ہی ملنا ناممکن ہے اور اگر کسی طرح وہاں پہنچ بھی گئے تو وہ ہمیں نیزوں کا بیج پر سلا دیں گے۔“

”محمود ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ انور آہستہ سے بڑبڑایا۔
”کیا.....!“

”بہی کہ تم ڈر پوک ہو۔“

عمران نے موٹر سائیکل روک دی اور پلٹ کر انور کو گھورنے لگا۔
”یہاں سے چند میل کا سفر کرنا پڑے گا۔“ عمران بولا۔
”پرواہ نہیں۔“

”بڑے رنگیلے معلوم ہوتے ہو اور اگر تمہارے ساتھ والی لڑکی کو اس کی اطلاع ہوگئی تو۔“
”تو کیا ہوگا..... وہ صرف میری دوست ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں فرماتے۔“
”اچھا تو پھر کل پر رکھو۔“ عمران نے کہا۔ ”ہمیں کچھ انتظامات بھی کرنے پڑیں گے۔
دیے تم بہت دلچپ آدمی ہو۔ کچھ دن اگر میرے مہمان رہو تو کیا حرج ہے۔ تم نے آم کی شراب کبھی نہ پی ہوگی۔ یہ میری ایجاد ہے۔ اگر رانی کی دسکی کا مزہ نہ آجائے تو میرا ذمہ۔“
”میں شراب نہیں پیتا۔“ انور نے کہا۔

”تب تم ڈیوٹ ہو۔“ عمران ہنس کر بولا۔ ”آؤ واپس چلیں..... تو پھر شام کو مل رہے ہوتا۔
قبے میں سب سے اونچا مکان میرا ہی ہے۔ بڑی مسجد کے پاس۔“
”میں تم سے ضرور ملوں گا۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”لیکن جنگل والی اسکیم نہ بھول جانا۔“
”یار واقعی تم خطرناک معلوم ہوتے ہو۔“ عمران نے ہنس کر کہا۔
وہ جھیل کی طرف لوٹ پڑے۔

محمود اور رشیدہ بیل گاڑی میں بیٹھے اوگھ رہے تھے۔ عمران انور کو چھوڑ کر قبے کی طرف روانہ ہو گیا۔

”کیوں بھی کچھ ملا.....!“ انور نے محمود سے پوچھا۔
”کچھ بھی نہیں۔“ محمود انگڑائی لیتا ہوا بولا۔ ”تم کدھر چلے گئے تھے۔“
”کروندے کے جنگل میں گھسنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔“
”اوہ..... یار کہیں یہ حماقت بھی نہ کر بیٹھنا۔ ادھر وحشی رہتے ہیں۔“
”لیکن عمران نے ایک ایسی بات بتادی ہے کہ اب جانا ہی پڑے گا۔“
”کیا.....؟“ محمود نے تحیرانہ انداز میں پوچھا۔
”جنگلی لڑکیاں۔“ انور مسکرا کر بولا۔
”کیا مطلب.....؟“ رشیدہ نے اُسے گھور کر کہا۔
”جنگلی لڑکیوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ انور نے کہا اور رشیدہ خاموش ہوگئی۔
”ہم لوگوں کی برائی تو خوب کی ہوگی۔“ محمود نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں تو..... تم لوگوں کا تذکرہ ہی نہیں آیا تھا۔ وہ زیادہ تر آدموں کی شراب اور لڑکیوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔“

”بھئی اب چلنا چاہئے۔“ رشیدہ بولی۔

تھوڑی دیر بعد نیل گاڑی قصبے کی طرف واپس جاری تھی۔

دوسرا فائر

شام کو انور عمران کے گھر سے لوٹتے وقت طرح طرح کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا، جس مقصد کے تحت وہ عمران سے ملا تھا اس میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی نئے میں ڈوبا بہکی بہکی باتیں کرتا رہا تھا۔ پرندے سے زیادہ اُسے ڈاکٹر کی بہن کے ساتھ محمود اور اس کی بیوی کے متصاد رویے کے متعلق تشویش تھی اور پھر وہ یہ بھی سن چکا تھا کہ ڈاکٹر کی بہن اور اس پرندے کے پراسرار تعلق کے بارے میں حویلی ہی والوں نے افواہیں پھیلائی تھیں۔

اُس نے رشیدہ کے ذریعے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ رانی صاحبہ بدستور مامتا کی ندیاں بہاتی رہیں اور شاہدہ نو خیر ہر بلب تھی ہی۔ وہ رشیدہ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ خود انور نے کئی بار اس سے گفتگو کرنی چاہی لیکن اس نے موقع ہی نہ دیا۔ بہر حال اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی سلوٹیں کسی وقت بھی غائب نہیں ہوئی تھیں۔

انور حویلی میں لوٹ آیا۔ اس نے اس وقت ڈاکٹر کو ملنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔

حویلی پہنچتے ہی اس نے سارے خیالات اپنے ذہن سے نکال دیئے اور ادھر ادھر کی تفریحی باتیں کرنے لگا۔

آہستہ آہستہ دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ شام بہت خوشگوار تھی۔ رانی صاحبہ نے پائیں باغ میں کرسیاں ڈلوادی تھیں اور سب لوگ وہیں بیٹھے انور کے لطیفوں اور چٹکوں سے محظوظ ہو رہے

تھے۔ صرف شاہدہ خاموش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں طوعاً و کرہاً بیٹھی ہو۔

دفعتاً کسی نے پھانک ہلایا اور سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔ یہ ڈاکٹر کی بہن تھی۔

”کیا یہ پھانک ہمیشہ بند رہے گا۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”اوہ..... یہ حرفہ پھر آگئی۔“ شاہدہ نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بہو رانی.....!“ رانی صاحبہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتی ہوئی بولیں۔ ”پاگلوں کے منہ لگنے

سے کیا فائدہ۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ پاگل ہے، جو کچھ بکتی ہے کہنے دو۔“

شاہدہ بیٹھ گئی۔ لیکن وہ قہر آلود نظروں سے پھانک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا کوئی میری بات کا جواب نہ دے گا۔“ وہ پھانک کو ہلا کر پھر چیخی۔ ”میں کہتی ہوں یہ

حویلی پتھروں کا ڈھیر ہو جائے گی۔ اس پر مونچھیں ہی مونچھیں آگ آئیں گی۔“

رشیدہ بے اختیار ہنس پڑی اور انور حیرت سے زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ محمود تو اس طرح خاموش تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

ڈاکٹر کی بہن نے قہقہہ لگایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس قہقہے کی آواز آہستہ آہستہ کہیں دور سے آئی ہو اور پھانک کے قریب پہنچ کر یک بیک تیز ہو گئی ہو۔

ایک ایک انور چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ پٹرول کی بوتلیاں سے آئی۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔

”گیراج کی طرف سے آئی ہوگی۔ شاید ڈرائیور کار کی ٹینکی بھر رہا ہے۔“ رانی صاحبہ بولیں۔

انور بیٹھ گیا۔ ادھر ڈاکٹر کی بہن نے پھر قہقہہ لگایا اور اندھیرے میں دور تک دوڑتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر انور بولا۔

”آخر شاہدہ صاحبہ اس سے اس قدر متفر کیوں ہیں؟“

”میں اپنے نجی معاملات پر تبصرہ نہیں پسند کرتی۔“ شاہدہ تلخ لہجے میں بولی۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ عنقریب یہ نجی معاملہ بین الاقوامی مسئلہ بننے والا ہے۔“ انور نے ہنس کر کہا۔

شاہدہ جھلا کر انھی اور حویلی کے اندر چلی گئی۔

”کیا بتاؤں؟“ رانی صاحبہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مضطرب انداز میں بولیں۔

”آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ رانی صاحبہ نے کہا اور وہ بھی اٹھ کر حویلی میں جانے لگیں۔

دفتر رشیدہ چیخ اٹھی۔ اس کا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

”ارے یہ تو پھر دکھائی دیا۔“ محمود بے ساختہ بولا۔

آتش پرندہ کافی بلندی پر پرواز کرتا ہوا حویلی کی طرف آ رہا تھا۔

”لو یہ نئی مصیبت آئی۔“ رانی صاحبہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”محمود راقع!.....!“ انور نے جلدی سے کہا۔

”قطع نہیں جناب۔“ رانی صاحبہ جھلا کر بولیں۔ ”آج یقیناً یہ آفت ادھر ہی آئے گی۔

نے اس پر گولی چلا کر اچھا نہیں کیا تھا۔“

”کل میں نے اسی طرح ڈاکٹر کا مکان بچایا تھا۔“ انور نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور

چارہ نہیں۔“

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔“ رانی صاحبہ چیخ کر بولیں۔

پرندہ کوشی کے گرد چکر لگاتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ رانی صاحبہ شاہدہ کو آواز دینی

ہوئی حویلی کی طرف بھاگی۔ شاہدہ شاہدہ نے اُسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر آ گئی۔

اچانک انور نے ایسا منہ بتایا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”محمود راقع!.....!“ وہ پھر چیخا۔

”انور خاموش رہو۔“ رانی صاحبہ گرج کر بولیں۔

انور پھر کچھ سننے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرندہ حویلی کی چھت پر اتر آیا۔ پھر حویلی کے

پچھلے حصے سے شعلے بلند ہونے لگے۔ نوکروں نے غل جانا شروع کر دیا۔ انور تیزی سے اُپر

بھاگ رہا تھا۔

آگ بجھانے کی کوشش جاری تھی اور انور کا کہیں پتہ نہ تھا۔

”ارے احمق یہ پٹرول جل رہا ہے۔“ انور کی آواز سنائی دی۔ وہ چہار دیواری پر کھڑا تھا۔

پھر وہ دوسری طرف کود گیا۔

آگ پر بہت جلیقہ قابو پایا گیا۔ کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ کئی نوکر چھت پر کھڑے شور

مچا رہے تھے۔ آگ تو بجھ گئی تھی لیکن خوف کے مارے وہ ابھی تک اپنی آوازوں پر قابو نہیں پاسکے

تھے۔ دفعتاً وہ آتش پرندہ اپنے پر پھینکنا ہوا ان کے سروں پر سے نکل گیا وہ اور زیادہ چیخنے لگے

اور ایک تو چکر اکر گر بی پڑا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ ہنگامہ رفع ہو گیا تو انور کی تلاش شروع ہوئی۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

رشیدہ کچھ سوچ رہی تھی۔ محمود انور کو تلاش کرنے کے لئے ملازمین کو قصبے میں بھیج چکا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن وہ واپس نہ آیا۔ رشیدہ اپنے کمرے میں آئی اور سوٹ کیس سے

ریپولور نکالا۔

جب وہ برآمدے سے گزر کر پائین باغ میں جانے لگی تو رانی صاحبہ نے اُسے ٹوکا۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ رشیدہ بولی۔

”کہاں جا رہی ہو۔“

”عمران صاحب کے یہاں..... ممکن ہے انور وہیں ہو۔“

”کسی نوکر کو بھیج دو۔“

”نہیں میں خود جاؤں گی..... جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“

”تو کسی نوکر کو ساتھ لیتی جاؤ۔“

”میں چلتا ہوں۔“ محمود بولا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ رشیدہ نے کہا اور چل پڑی۔ پھانک سے نکلنے کے بعد اُس

کارخ قصبے کے بجائے جنگل کی طرف تھا۔

رات تاریک تھی۔ رشیدہ چل تو پڑی لیکن جنگل میں داخل ہوتے ہی جسم کے سارے

دھنکے کھڑے ہو گئے۔ جنگل جھینگروں کی تیز آوازوں سے گونج رہا تھا۔ کروندے کی دیو پیکر

جھاڑیاں اس وقت اور زیادہ خوفناک نظر آرہی تھیں۔ رشیدہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ

رہی تھی۔ دفعتاً کسی درخت پر الو کی چیخ سنائی دی اور وہ جھک پڑی۔ دل شدت سے دھرنے لگا۔

وہ ایک لمحے کے لئے رک گئی لیکن پھر اس کے ذہن نے دلیر بننے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور دوسرے ہی لمحے میں وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

پھر کہیں دور قدموں کی آہٹ سنائی دی جولوہ بہ لحوہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ایک متحرک ہاتھ دکھائی دیا اور رشیدہ ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گئی۔

”خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ آنے والا اچھل کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا بولا۔

رشیدہ نے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ اسکے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی

”میں تمہارے جوابی حملے کا انتظار کر رہی ہوں۔“ رشیدہ چیخ کر بولی۔ ”لیکن میں جاؤں

ہوں کہ تمہارے پاس پستول نہیں ہے۔“

جواب ندارد..... رشیدہ پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی نے پیچھے سے اُسے دبوچ لیا۔

ساتھ ہی قہقہے کی آواز سنائی دی۔

”اب تو پستول ہے میرے پاس۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

رشیدہ نے کوئی جدوجہد نہ کی لیکن اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ حملہ آور کے کان کی طرف بڑھ

رہا تھا۔

”ارے ارے کان چھوڑو..... چھوڑو.....!“ وہ کراہ کر بولا۔

”نہیں..... انور میں تمہارے دونوں کان اکھاڑ ڈالوں گی۔“

”چھوڑو..... چھوڑو.....!“

رشیدہ اُسے کھینچتی ہوئی واپس لوٹ رہی تھی۔

”میں کہتا ہوں کان چھوڑو.....!“ انور بگڑ کر بولا۔

”تمہارے چیخنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ رشیدہ سنجیدگی سے بولی اور انور جم کر کھڑا ہو گیا۔

”کھینچو..... اور..... اور زور سے کھینچو..... لیکن یاد رکھو کہ تمہارے ساتھ کان ہی کا

جائے گا۔“

رشیدہ رک گئی اور اس نے کان چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک کھڑی خاموشی سے اُسے گھبرا

رہی پھر چل پڑی۔ انور اُس کے پیچھے تھا۔ رشیدہ نے جس ہاتھ سے انور کا کان پکڑا تھا اس

اُسے کچھ چچاہٹ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے جیب سے گھڑی دیکھنے کی ننھی سی ٹارچ نکالی اور اپنا ہاتھ دیکھنے لگی۔

”خون.....!“ وہ چونک کر رک گئی۔ انور جیسے ہی اس کے قریب سے گذرا اس نے

اُسے پکڑ لیا۔ دوسرے لمحے میں ٹارچ کی مدھم روشنی انور کے چہرے پر پڑی تھی، پیشانی اور گالوں

سے خون بہہ رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا.....؟“ رشیدہ بے اختیار بولی۔

”کان اکھڑ گیا ہو گا؟“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

رشیدہ نے دوڑ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اسے سہارا دینے لگی۔

”چیخ.....!“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میرا بیہوش ہونے کا ارادہ نہیں۔“

”انور.....!“ رشیدہ ایسی پشیمان آواز میں بولی جسے سسکی سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔

انور نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

”لیکن تم کیوں آئی تھیں۔“

”مجھے یقین تھا کہ تم ادھر ہی آئے ہو گے۔“

”میں پوچھتا ہوں تم آئی ہی کیوں تھیں۔“

”تمہارے لئے۔“

”بکومت..... میں اسے پسند نہیں کرتا۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی۔ اگر اس نے اس کے چہرے پر خون نہ دیکھ لیا ہوتا تو شاید جھپٹ

پڑتی۔ اس وقت اُسے انور کے اس حکمانہ لہجے پر غصہ نہیں آیا لیکن وہ اُس حادثے کے متعلق

معلوم کرنے کے لئے بے چین تھی جس کی بناء پر انور زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے اُسے کریدنا مناسب

نہ سمجھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد حویلی پہنچ کر انور کی مرہم پٹی کرے۔ ویسے خود اُسے تو اُن

زخموں کی رتی برابر پرواہ نہ ہوگی اور اس کی لاپرواہی تو وہ کچھ دیر پہلے دیکھ ہی چکی تھی۔ انور کی جگہ

اور کوئی ہوتا تو اس حالت میں کم از کم کسی قسم کے مذاق کے لئے تیار نہ ہوتا۔ اس کی آواز پہچان

کر اس نے اسے ڈرانے کے لئے ہوائی فائر کیا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس پستول

نہیں ہے۔ وہ چاہتا تو اسکی آواز سننے کے بعد سامنے آ جاتا لیکن نہیں اس وقت بھی اس کی رگ شرارت بھڑک اٹھی تھی اور اس نے پیچھے سے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”غصہ.....!“ انور ایک گرے ہوئے درخت کے تنے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔
”میں وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیوں گا۔“

وہ دونوں جنگل سے نکل کر قصبے کی کچی سڑک پر پہنچ گئے تھے۔

”اب..... یں چل کر پیٹا۔“ رشیدہ اسے پکڑ کر آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

”رشو.....!“ انور تیز لہجے میں بولا اور ہاتھ چھڑا کر درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ مجبوراً رشیدہ کو بھی بیٹھ جانا پڑا۔

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ..... یہ خون۔“

”حویلی والوں پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہے۔“ انور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”انہیں سب سے زیادہ اس بات پر حیرت ہے کہ تم کیوں غائب ہو گئے۔“

”آگ کا کیا رہا۔“

”بجھا دی گئی کوئی نقصان نہیں ہوا۔“

”انور خاموش ہو گیا.....“ پھر دو تین کش لینے کے بعد بولا۔

”آگ اس پرندے کی وجہ سے نہیں لگتی۔“

”جہنم میں گیا پرندہ.....!“ رشیدہ جھلا کر بولی۔ ”تم زخمی کیسے ہوئے اور اب یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کیا اب ان زخموں کو سمرانے کا ارادہ ہے۔“

”زخموں کی حالت تشویش ناک نہیں۔“ انور لاپرواہی سے بولا۔ ”یہ جھاڑیوں کے کانٹے ہیں۔“

”کیا تم ان میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”نہیں..... بلکہ مجھے زبردستی ان میں گھسیڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”اڑے.....!“

”ہاں..... میں جس آدمی کا تعاقب کر رہا تھا وہ غیر معمولی طور پر طاقتور ثابت ہوا۔“

”آدمی کا تعاقب.....!“ رشیدہ نے تحیر آمیز انداز میں دہرایا۔

”ہاں وہی آدمی جو کوشی میں آگ لگا کر بھاگا تھا۔ پٹرول کی بو پر میں پہلے ہی چونکا تھا۔“

لیکن ان لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ جس وقت وہ پرندہ کوشی پر چکر لگا رہا تھا میں نے

ہلکی ہلکی سیٹیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ اور یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ پرندہ انہیں آوازوں پر نیچے اترا

تھا۔ میں اس وقت حویلی کی پشت پر پہنچا تھا۔ جب پرندے کو سیٹیوں پر بلانے والا آگ لگا کر

بھاگ رہا تھا تعجب ہے کہ قصبے والوں نے کچھلی وارداتوں میں اس چیز کی طرف توجہ نہیں دی۔

بہر حال میں اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں

نے آج تک اتنا تیز دوڑنے والا نہیں دیکھا۔ جھیل کے قریب پہنچ کر وہ ایک لخت میری طرف پلٹا

اور قبل اس کے کہ سمجھتا اس نے مجھے پکڑ کر اچھال دیا۔ جیسے میں آدمی نہیں بلکہ ریڑی گیند ہوں

اور میں لاکھ سٹپلے کے باوجود بھی اپنا سر جھاڑیوں سے نہ بچا سکا۔ مجھے اس کی طاقت پر حیرت

ہوتی ہے اگر کہیں دو چار آدمیوں کے سامنے اس نے مجھے اس طرح اٹھا کر پھینکا ہوتا تو میں کسی کو

منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔“

”اور تم نے اسے نکل جانے دیا۔“ رشیدہ نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

”پھر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میں کافی دیر تک اسے تلاش کرتا رہا لیکن یہ بتاؤ کہ تم

اس طرح اکیلے کیوں نکل آئی تھیں۔“

”میری خوشی! جب تم میرا کوئی اعتراض برداشت نہیں کر سکتے تو مجھے کیوں اس پر مجبور

کرتے ہو۔“

”یہ بات نہیں رشو.....!“ انور نرم لہجے میں بولا۔ ”یہ جنگل بہت بھیانک ہے۔“

”تو کیا اب یہیں بیٹھے بیٹھے رات ختم کر دو گے۔“

”نہیں صرف سگریٹ ختم کروں گا۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”حویلی والوں کو اس واقعے کی

اطلاع نہ ہونی چاہئے۔“

”مگر پٹرول والا معاملہ تو.....!“

”اس کی فکر نہیں..... بات جہاں تھی وہیں رہنی چاہئے۔“

”اور یہ زخم.....!“

”یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پرندے کا تعاقب کرتے وقت جھانپوں میں گر پڑا تھا۔“
”لوگ تمہیں پاگل سمجھے لگیں گے۔“

”تب تو اور اچھا ہے۔ میں ڈاکٹر کی بہن سے شادی کر لوں گا۔“

”اچھا تو کیا تم.....!“

”ہاں میں اس پر عاشق ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”بس اب اٹھو چلو.....!“ رشیدہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

انور نے سگریٹ ایک طرف پھینک دی اور پھر وہ حویلی کی طرف چل پڑے۔ پھانک

قریب عمران ملا۔

”اوہ..... انور صاحب آپ لوگ آگئے۔ بھی مجھے بڑی تشویش ہو گئی تھی۔“

عمران آگے بڑھ کر بولا۔ ”یہاں معلوم ہوا کہ رشیدہ صاحبہ میرے گھر گئی ہیں لیکن“

کر کے اور تشویش ہو گئی کہ وہ میرے گھر تک پہنچی ہی نہیں۔“

”کوئی خاص بات نہیں ہم لوگ ذرا کھیتوں میں ٹہل رہے تھے۔“ انور نے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ.....!“ یہاں تو نہ جانے کتنی افواہیں اڑ گئیں۔

”اچھا.....!“ انور دلچسپی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”جی ہاں..... مگر بھی آپ لوگ بُرا نہ مانئے گا۔ گاؤں والے گنوار ہی ہوتے ہیں۔“

”اندھیرا ہونے کی وجہ سے عمران انور کا زخمی چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ چند لمحے ادھر اُدھر

باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ خواہ مخواہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

”مجھے تو یہ آدمی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

”میں بھی اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”اور شاہدہ کے متعلق

خیال ہے۔“

”مجھے تو اس کا دماغ بھی خراب ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”اس پر کڑی نظر رکھنا۔“ انور نے کہا اور پھانک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔ شاید چوکیدار مالی کے جھونپڑے میں چلم پی رہا تھا۔

”ہم لوگ ہیں۔“ رشیدہ بولی اور چوکیدار اپنی لائین لے کر انہیں راستہ دکھانے کیلئے دوڑا۔

”ارے صاحب.....!“ وہ انور کو چہرہ دیکھتے ہی چیخ پڑا۔

”شش شش..... کچھ نہیں آگے چلو.....!“ انور نے کہا۔

”کیا بات ہے۔“ کسی نے برآمدے سے آواز دی۔

”مہمان ہیں۔“ چوکیدار بولا۔

”بھئی تم لوگوں نے پریشان کر ڈالا۔“ محمود کی آواز سنائی دی۔ ”آج تم لوگوں کی خاصی

مرمت ہوگی۔“

”ذرا آہستہ گاؤں میرے بیٹے۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”پس نازک است شیشہ دل در کنار ما۔“

ایک نئی واردات

تھوڑی دیر بعد انور پلنگ پر لیٹا تھا اور رشیدہ اُس کے چہرے میں چبھے ہوئے کانٹے نکال

رہی تھی۔ محمود تو ڈاکٹر کو بلوانے جا رہا تھا۔ مگر انور نے روک دیا۔ اس نے کہا کہ اس طرح یہ بات

سارے قصبے میں پھیل جائے گی اور میں پاگل مشہور ہو جاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کا تذکرہ کسی

سے نہ کیا جائے۔

”لیکن آخر اس وحشت کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ رانی صاحبہ بولیں۔

”میں اُس پرندے کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ پنجرے میں خوشنما معلوم ہوگا۔“

”بھئی تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ رانی صاحبہ نے اکتا کر کہا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ رشیدہ ہنس کر بولی۔ ”اکثر ان کی باتیں خود انہیں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”وہ بات ہی کیا جو سمجھ میں آجائے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”مثلاً یہ بات ابھی تک میری سمجھ

میں نہیں آئی کہ پٹرول کی بو گیراج سے آئی تھی یا.....!“

”یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ محمود نے کہا۔ ”آگ یقیناً پٹرول میں لگی تھی مگر پٹرول دیواروں پر کہاں سے آیا۔“

”میں نے دیکھا تھا.....!“ انور مسکرا کر بولا۔ ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں چار دیواری پر کڑھا تھا۔ وہاں سے چھت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا.....!“

انور خاموش ہو گیا۔ بقیہ لوگ توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ البتہ ریشہ ضرور متحیر تھی۔ کیونکہ انور نے اسے اصل واقعہ بتانے سے روک دیا تھا اور اب خود ہی بیان کرنا جارہا تھا۔

”کیا دیکھا.....؟“ رانی صاحبہ بے چینی سے بولیں۔

”پرندے نے اپنی چونچ میں پٹرول کا کنسٹر دبا رکھا تھا۔ پٹرول چھت اور دیواروں پر انڈیل کر وہ اس میں لوٹنے لگا تھا۔“

ریشہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور رانی صاحبہ اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“ انور تیز لہجے میں بولا۔

”بھلا پرندے کے پاس پٹرول کہاں سے آیا۔“ ریشہ ہنسی روک کر بات بنانے لگی۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے بیٹی۔“ رانی صاحبہ سنجیدگی سے بولیں۔ ”خدا ہم لوگوں پر رحم کرے۔“

محمود کچھ نہیں بولا۔ وہ انور کو گھور رہا تھا اور خود کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ابھی نہ جانے کتنی مصیبتیں نازل ہوں۔“ شاہدہ منہ سکوڑ کر بولی۔ ”اگر اس پر رائلز

چلائی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔“

انور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی قاتل مسکراہٹ تھی۔

شاہدہ گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”اس پرندے کا گوشت بہت لذیذ ہوگا۔“ انور نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کو یقین دلانا

ہوں کہ ایک نہ ایک دن اُسے دستر خوان کی زینت ضرور بناؤں گا۔“

”بھئی اب چپ بھی رہو۔“ رانی صاحبہ خوفزدہ لہجے میں بولیں۔

ریشہ نے کانٹے نکال کر انور کے چہرے کو پیٹوں سے ڈھک دیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد

سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے انور کی بے تکلی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے اور ریشہ کسی نئے خطرے کی بوسنگھ رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انور کن موقعوں پر خود کو ضرورت سے زیادہ احمق ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

کھانا کھا کر وہ لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف جا ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر نصیر کے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع ملی۔ ایک ہی رات میں دو مکانوں میں آگ لگنے کی یہ پہلی واردات تھی۔

”پیارے ڈاکٹر پر بھی میری ہی وجہ سے مصیبت نازل ہوئی۔“ انور متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ”مگر اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خصوصاً رانی صاحبہ بہت زیادہ متشکر نظر آ رہی تھیں۔ شاید انہیں خوف تھا کہ کہیں پھر کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ریشہ اور انور کے کمروں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ دونوں کمروں کی کھڑکیاں پائیں باغ کی طرف کھلتی تھیں جن کے نیچے کچھ دور ہٹ کر مہندی کی باڑھ تھی جس کا سلسلہ ایک روش کے کنارے کنارے پائیں باغ کی چہار دیواری تک چلا گیا تھا اور یہ روش باغ کے عقبی دروازے کے پاس جا کر ختم ہو گئی تھی۔

باہر آسمان سیاہیاں بکھیر رہا تھا۔ پودوں اور جھاڑیوں میں دبکے ہوئے جھینگروں کی جھانیں جھانیں فضا پر مسلط تھیں۔ انور سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ اُسکے زخموں میں جلن شروع ہو گئی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دیر تک نہ سو سکے گا۔ اس نے کھڑکی سے سر نکال کر آہستہ سے ریشہ کو آواز دی۔ وہ بھی ابھی جاگ ہی رہی تھی۔ انور کی آواز سن کر کھڑکی کے قریب آ گئی۔

”ریشو مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔“

”زخموں میں تکلیف زیادہ بڑھ گئی ہے۔“

”ہاں.....!“

”تو کیا میں آؤں۔“

”ہاں.....!“

”لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

”بھئی یہ قصہ بہت وسیع ہے۔“ انور اکتا کر بولا۔ ”یہاں عمران کے علاوہ بھی کئی اور لوگ ہیں، جو اس سے بھی زیادہ بدنام ہیں۔ عمران کے سلسلے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ صرف حویلی والوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ قصبے کے بقیہ لوگوں کو پریشان کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”ایک بات اذرا.....!“ رشیدہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”اگر وہ صرف حویلی ہی والوں کو نقصان پہنچانے چاہتا ہے تو اس کا پکڑا جانا یقینی تھا۔ اس لئے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ گاہے گاہے ان لوگوں پر بھی حملہ کرتا رہتا ہے جن سے اُس کے تعلقات بُرے نہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کی نظروں میں مشتبہ ہونے سے بچ رہا ہے۔“

”خیال تو بُرا نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”لیکن حویلی والوں کے اور دشمن بھی ہوں گے۔ اس سلسلے میں محض عمران ہی کا نام کیوں لیا جائے۔“

”اس کی بھی ایک وجہ ہے۔“

”کیا.....؟“

”ظہر و.....“ رشیدہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ اُس نے کمرے کا دروازہ کھول کر ادھر ”مقصد ہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے یا تو کوئی آدمی پورے قصبے سے کسی بات کا انتقام لے ادھر دیکھا اور پھر واپس آ گئی۔ انور اُسے گھور رہا تھا۔

”عمران شاہدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا..... اور خود شاہدہ کی بھی یہی خواہش تھی۔“

”اوہ.....!“ انور چونک کر بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”مجھے یہ بات رانی صاحبہ نے بتائی تھی۔ لیکن شاہدہ کے متعلق خود میں نے ہی اندازہ لگایا ہے۔ عمران کی موجودگی میں اس کا سارا دیکھا پن غائب ہو جاتا ہے اور محمود سے تو شاید وہ کبھی نرمی سے گفتگو نہیں کرتی۔“

انور کچھ سوچنے لگا۔

”لیکن وہ عمران نہیں ہو سکتا جس نے مجھے جھاڑیوں میں پھینکا تھا۔“

”اس مقصد کے لئے وہ کسی دوسرے کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”تمہارا اشارہ شاید جنگلوں کی طرف ہے۔“ انور بولا۔

انور نے دو تین گہرے گہرے کش لیے اور سگریٹ پھینک کر مڑا۔

”بیٹھ جاؤ.....!“ وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ رشیدہ شب خوابی کے لہر میں اس وقت کچھ زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

”میری طبیعت یہاں سے بُری طرح اکتا گئی ہے۔“ انور بولا۔

”تو واپس چلو.....!“

”یہ ناممکن ہے۔“

”کیوں.....!“

”یہ زخم زندگی بھر ہرے رہیں گے۔“ انور اپنے چہرے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”تو تم انتقام کی آگ میں جل رہے ہو۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”میں سمجھی تھی شاید زخم میں جلن ہے۔“

”مذاق نہیں رشو..... میں اُسے پکڑے بغیر واپس نہیں جاسکتا۔“ انور نے کہا اور دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

”اگر واقعی یہ کسی آدمی کی حرکت ہے تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“ رشیدہ نے کہا۔

”مقصد ہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے یا تو کوئی آدمی پورے قصبے سے کسی بات کا انتقام لے ادھر دیکھا اور پھر واپس آ گئی۔ انور اُسے گھور رہا تھا۔

”عمران شاہدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا..... اور خود شاہدہ کی بھی یہی خواہش تھی۔“

”اوہ.....!“ انور چونک کر بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”مجھے یہ بات رانی صاحبہ نے بتائی تھی۔ لیکن شاہدہ کے متعلق خود میں نے ہی اندازہ لگایا ہے۔ عمران کی موجودگی میں اس کا سارا دیکھا پن غائب ہو جاتا ہے اور محمود سے تو شاید وہ کبھی نرمی سے گفتگو نہیں کرتی۔“

انور کچھ سوچنے لگا۔

”لیکن وہ عمران نہیں ہو سکتا جس نے مجھے جھاڑیوں میں پھینکا تھا۔“

”اس مقصد کے لئے وہ کسی دوسرے کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”تمہارا اشارہ شاید جنگلوں کی طرف ہے۔“ انور بولا۔

”لیکن وہ عمران نہیں ہو سکتا جس نے مجھے جھاڑیوں میں پھینکا تھا۔“

”اس مقصد کے لئے وہ کسی دوسرے کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”تمہارا اشارہ شاید جنگلوں کی طرف ہے۔“ انور بولا۔

”یقیناً.....!“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان جھاڑیوں میں گھسنے کا کوئی ذریعہ ہے۔“

”میں تو یہی سمجھتی ہوں۔“

”کیوں.....!“

”اگر جنگلی اس طرف آسکتے تو یہاں آئے دن چوریوں اور ڈاکوؤں کی وارداتیں ہوتی رہتیں۔“

”تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ پرندہ بھی اس جنگل سے نہیں آتا۔“

”میں یہی سمجھتا ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کروندے کے جنگل

آتا ہے محض اس لئے کہ وہ اُسے جنگلیوں کا کوئی جادو سمجھتے ہیں۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی انور اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس

سگریٹ کا ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

رشیدہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور اس

کی طرف دیکھنے لگی۔

”تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔“

”نی الحال مجھے اس پرندے کی فکر ہے۔“ انور بولا۔ ”یہ ثابت ہو گیا کہ وہ محض ایک شہ

ہے۔ آتش زنی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں جلد ہی اُسے پکڑ لوں گا۔“

”ذرا سوچ سمجھ کر۔“ رشیدہ چونک کر بولی۔ ”یہ مت بھول جانا کہ اس پر گولی پڑنے

ایک زوردار دھماکہ ہوا تھا۔“

”مجھے یاد ہے۔“

”تم اسے کس طرح پکڑو گے۔“

”جس طرح خدا پکڑوائے گا۔“ انور جھلا کر بولا۔ ”اچھا جاؤ اب سو رہو۔“

”تم نے مجھے خواہ مخواہ بلایا تھا۔“ رشیدہ بھی اسی لہجے میں بولی۔

”ایک نظر دیکھنے کے لئے۔“ انور مضحکہ خیز انداز میں آہ بھر کر بولا۔ ”تا کہ میں رات

آرام سے جاگ سکوں۔ اچھا اب جاؤ۔ کل رات پھر ایک نظر دیکھ لوں گا۔“

رشیدہ اسے تیز نظروں سے گھورتی رہی پھر اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

انور نے اس انداز سے دروازہ بند کر لیا جیسے اس نے کوئی بہت نیک کام کیا ہو۔ پھر وہ

آنکھیں بند کر کے مسدہی پر لیٹ گیا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک تو زخموں کی

چہر چہرہ ہی بے خوابی کے لئے کافی تھی اس پر آج کی توہین۔ شاید انور نے پہلی بار زندگی

میں یہ چیز محسوس کی تھی کہ اس سے بھی زیادہ طاقت ور لوگ اس زمین پر رہتے ہیں۔ اس کے ذہن

میں اس وقت تک صرف ایک ہی سوال تھا وہ یہ کہ اس پر اسرار آدمی سے دوسری لمبھٹ کب اور

کس طرح ہوگی۔ اس کی غیر معمولی طاقت سے خائف ہونے کی بجائے انور اس سے دوبارہ

نکرانے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور کھڑکی کے

قریب آ گیا لیکن دوسرے لمحے سگریٹ زمین پر تھی اور وہ اسے پیر سے مل رہا تھا۔ ساتھ ہی اس

کی نظریں اندھیرے میں کسی متحرک چیز کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کوئی مہندی کی باڑھ کی اوٹ لیتا

ہوا آہستہ آہستہ کوشی کی چہار دیواری کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر سب سے

زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ کپاؤنڈ میں چکر لگاتے ہوئے شکاری کتوں کے کان پر جوں تک نہ

رسنگی۔ انور نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ یہ حویلی ہی کا کوئی فرد تھا۔ ورنہ کتے آسمان سر پر

اٹھا لیتے۔ عقبی دروازے کے قریب پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ شاید ادھر ادھر کی آہٹ

لے رہا تھا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

انور کے کمرے کی کھڑکی زمین سے تقریباً چھ سات فٹ اونچی تھی۔ وہ آہستہ سے نیچے اتر

گیا۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں کوئی کتا بھونکتا نہ شروع کر دے لیکن شاید قدرت مہربان تھی کسی نے

اس طرف دھیان بھی نہ دیا۔ یا شاید یہ بات تھی کہ وہ اس کی بو میں اجنبیت نہیں محسوس کر سکتے

تھے۔ وہ بہ احتیاط دروازے سے گذر گیا۔

تاروں کی چھاؤں میں دور ایک سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ انور تیزی سے اس کا تعاقب

کرنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر وہ جنگل کی طرف گیا اور انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل

اس کے چہرے کے زخموں میں ہڑک رہا ہو۔ سایہ تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے

چلنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جانی پہچانی منزل کی طرف جا رہا ہو۔ جنگل
 رہ کر ڈراؤنی آوازوں سے گونج اٹھتا تھا۔ کبھی کبھی تو کروندے کی جھاڑیوں میں کچھ اس قسم کی
 سرسراہٹ پیدا ہوتی جیسے کوئی وحشی درندہ جھپٹ کر حملہ کرنے جا رہا ہو۔ چند گھنٹے پیشتر انور اصرار
 سے دوبارہ گذر رہا تھا۔ لیکن اب کی وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ مشین نہیں بلکہ آدمی
 ہے۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی رات کا خوفناک طلسم اس کے مشینی فلسفے پر مسلط ہوتا جا رہا تھا اور
 پھر اس بھیانک ماحول میں اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ ڈاکٹر کی پاگل بہن کے قہقہے کی آواز تھی
 جو کہیں دور تاریکیوں کا سینہ چیر کر پینل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں مدغم ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی
 کسی درخت پر دو تین چگادڑ بیک وقت چیخ کر خاموش ہو گئے۔ لیکن وہ سایہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے
 آگے بڑھتا جا رہا تھا اور اب تو اس کی چال میں کچھ دیوانگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ جنگل اپنی بے شمار
 آوازوں میں چیخ رہا تھا اور سایہ آگے بڑھ رہا تھا۔ قہقہے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ انور کی رفتار
 سست ہو چلی تھی کہ یک بیک اس کے اندر سویا ہوا وحشی بیدار ہو گیا۔ وہ وحشی جس کا جاگنا عموماً
 کسی خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہوا کرتا ہے۔

آخر کار وہ سایہ رک گیا۔ انور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی بہن کی آواز
 قریب ہی کہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی سے لڑ رہی ہو۔ پھر کچھ لمبا
 آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی کسی کو پیٹ رہا ہو۔ سائے کا رخ آوازوں ہی کی طرف تھا۔ انور
 سائے سے تین چار قدم پیچھے ہی رک گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ شخص غائب ہوا تھا جس کے ہاتھوں انور نے چند گھنٹے پیشتر نکلت
 کھائی تھی۔ سامنے تھوڑی ہی دور پر جھیل لہریں لے رہی تھی۔ جس کے کنارے دو دھندلے
 سائے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو ڈاکٹر کی بہن تھی اور دوسرا کوئی اور..... ڈاکٹر کی بہن
 اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہی تھی اور وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چپچیپ
 جا رہی تھی۔

”کہنے..... کتے..... میں تیری بوٹیاں اڑا دوں گی۔ تیرے گالوں کی بوٹیاں نوجا
 چباؤں گی۔ تیرے ہونٹوں کے پر نچے اڑا دوں گی۔ سُر کے بچے! تو نے میری چوڑیاں توڑا

میری آنکھوں کے کاجل سے آسٹریلیا کا نقشہ بنایا ہے۔ یو ڈرنی سوائین..... میری پلکوں
 تلے صنوبر کے سائے تھے۔ میرے گالوں میں چناروں کی آگ تھی۔ تو نے اس آگ میں اُلو
 اگا دیئے۔ بکری کے خصم تیرا ناتا شو پنہار تھا۔ ٹرائسکی کے بچے! تیرے منہ پر تھوکتی ہوں۔ سنو
 سُر کے بچے خزاں آگئی۔ کلیاں مرجھا گئیں۔ باغ ویران ہو گیا۔ سنگترے اداس ہیں۔ سنگترے کی
 پھانسیں اداس ہیں۔ میں تیری ہڈیاں توڑ توڑ کر ان کا سارا گودا چوس لوں گی۔“
 اس نے ایک وحشت ناک قہقہہ لگایا اور اسے شدت سے سینے لگی۔

دفعاً انور اپنے آگے کھڑے ہوئے سایہ کی طرف متوجہ ہوا جس کا داہنا ہاتھ آہستہ آہستہ
 اٹھ رہا تھا اور ستاروں کی چھاؤں میں کسی پتھدار چیز کی مدھم سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ انور
 نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر پستول چل چکا تھا۔ انور نے جھٹکا دیا اور سایہ ایک بے جان
 لاش کی طرح اس پر آ رہا۔ یک بیک اس کی نظریں جھیل کی طرف اٹھ گئیں۔ ڈاکٹر کی بہن شاید
 جھیل میں گر گئی تھی۔ اس کے ساتھی نے بھی دیکھتے ہی دیکھتے چھلانگ لگا دی۔ انور پستول چلانے
 والے کو ایک طرف سرکندوں کی جھاڑیوں میں گھسیٹ لے گیا۔ شاید وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ انور کی
 کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دفعاً کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جھاڑیوں
 سے سر نکال کر دیکھا۔ کوئی کسی کو کاندھے پر لادے ہوئے دوڑتا ہوا اس کے قریب نکل گیا۔ دور
 تک قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر سناٹا چھا گیا۔

انور نے بیہوش کو بائیں ہاتھ پر سنبھال کر دیا سلائی روشن کی۔

”شاید.....!“ اُس نے آہستہ سے کہا اور اس طرح مسکرانے لگا جیسے ابھی جو کچھ بھی
 ہو چکا ہے اُس پر وہ مطمئن ہے۔ اُس نے اس کی مٹھی میں جکڑا ہوا پستول نکال کر اپنی جیب میں
 رکھ لیا۔

شاید ابھی تک بیہوش تھی۔ وہ اسے کاندھے پر لاد کر جھیل کے کنارے لے آیا اور اس
 کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ ہوش میں آگئی۔ انور اس پر
 جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ شاید وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر انور کو پہچاننے کی کوشش
 کر رہی تھی۔

”ڈرو نہیں۔“ انور نے آہستہ سے کہا اور وہ اٹھ کر بھاگی لیکن انور نے اُسے پکڑ لیا۔

”یہ کیا حرکت تھی۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“

”اگر میں نہ ہوتا تو تم نے انہیں قتل ہی کر دیا تھا۔“

شاہدہ کے منہ سے ایک دہی دہی سی سسکی نکلی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
قریب کی جھاڑیوں میں جھینگروں کی جھانکیں جھانکیں تیز ہو گئی۔

جھگڑا

انور تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ شاہدہ خود بولے گی۔ لیکن اس خیال غلطی سے شاہدہ بغیر کچھ کہے سے واپس جانے کے لئے اٹھنے لگی۔ انور بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ اس نے پستول کے کارٹوس نکال کر جھیل میں پھینک دیئے تھے۔
”یہ لو.....!“ وہ اسے پستول دیتا ہوا بولا۔ ”اول تو اس کا استعمال ہی میں پسند نہیں کرتا۔
ویسے اگر ضرورت پڑی جائے تو کافی سمجھ بوجھ کر کام لینا چاہئے۔“

شاہدہ نے پستول لے لیا لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

”اس لڑکی کے ساتھ کون تھا؟“ اس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”لیکن تم نے گولی کس پر چلائی تھی۔“

”میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔“ شاہدہ آہستہ سے بولی۔

”بے وجہ دماغ بھی نہیں خراب ہوتا۔“

شاہدہ خاموش ہو گئی۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے کسی طویل بیماری سے نئی۔

”تمہیں اس سے کیوں دشمنی ہے۔“ انور نے پھر پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”تو پھر تم جانتی کیا ہو۔“ انور جھنجھلا کر بولا۔ ”میں ڈاکٹر سے تمہارے خلاف پولیس میں

رپورٹ درج کرادوں گا۔“

”میں تمہارے دوست کی بیوی ہوں۔“ شاہدہ آہستہ سے بولی۔

”میں مجرموں کو اپنا دوست نہیں سمجھتا۔“

”کیا مطلب.....!“ شاہدہ چلتے چلتے رک کر خوفزدہ آواز میں بولی۔

”میں نہیں جانتا۔“

شاہدہ پھر چلنے لگی۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔

”مجھے سہارا دو، ورنہ میں گر پڑوں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ انور نے اُسے بازو پر سنبھال لیا۔

شاہدہ کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔

”تم رو بھی سکتی ہو۔“ انور طنز آمیز لہجے میں بولا۔

شاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ برابر روئے جارہی تھی۔

”اگر واپسی میں تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو تم کیا جواب دو گی؟“ انور نے پوچھا۔

شاہدہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

”میں تم سے اب کچھ نہ پوچھوں گا! میں سب کچھ جانتا ہوں۔“ انور نے کہا۔

”خدا کے لئے تم ہری پور سے چلے جاؤ۔“ شاہدہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

”مجھے خاندان کی عزت اپنے غصے سے زیادہ عزیز ہے۔“

”میں کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد اسے ادھورا نہیں چھوڑا کرتا۔“

”میں تم سے استعفا کرتی ہوں۔“

”مجھے انسوس ہے۔“

شاہدہ پھر کچھ سوچنے لگی

”اس واقعے کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

”میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“

شایدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“

”میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”تم جانو.....!“ انور نے لا پرواہی سے کہا۔

شایدہ چلتے چلتے رک گئی۔

”میں تم سے خائف نہیں ہوں۔“ وہ گرج کر بولی۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ جاؤ تمام

ڈھنڈورا پیٹ دو..... مجھے پرواہ نہیں ہے..... اور تم..... تم کتے ہو۔“

انور حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور وہ تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ حویلی نزدیک ہی

تھی۔ انور صلیح وہیں رکا رہا۔ اس نے ایک سگریٹ نکالی اور سلکا کر پینے لگا۔ اس کا دماغ بہت

تیزی سے سوچ رہا تھا۔ بے شمار واقعات اور کام کے نکتے سامنے بکھرے ہوئے تھے بس انہیں

ترتیب دینا باقی رہ گیا تھا۔

شروع سے آخر تک کڑیاں ملتی گئیں۔ مگر وہ آتش پرندہ..... اور پھر وہ بھیا نک آدمی؟ انور

چونک پڑا۔ وہ سوچنے لگا ابھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں جلدی نہ کرنی چاہئے۔ ظاہری اسباب کی

ترتیب میں ذہن دھوکا بھی کھا سکتا ہے۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ حویلی کی طرف چل پڑا۔

باغ کا عقبی دروازہ دوسری طرف سے بند نہیں تھا وہ آہستگی اپنے کمرے کی کھڑکی کے پیچھے پہنچ

گیا اور پھر دوسرے ہی لمبے میں وہ اوپر تھا۔ چراغ بجھا کر وہ بستر میں گھس گیا۔ نہ جانے کیوں دو

کتے اس کی کھڑکی کے نیچے آ کر بھونکنے لگے تھے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر انور نے محسوس کیا کہ شایدہ کی حالت میں کسی قسم کا فرق

نہیں پیدا ہوا۔ اس کی تیوریاں بدستور چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے انور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی

نہیں دیکھا چائے کے دوران میں وہ اپنی عادت کے مطابق جلی کٹی باتیں کرتی رہی۔ اس کے اس

روئے سے انور کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے پچھلی رات کے واقعات میں کوئی سچائی نہ رہی ہو۔

وہ محض خواب رہے ہوں۔ انور کو اس کی اداکاری پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اسے ایک تعلیم یافتہ مگر

قطعی گھریلو عورت سمجھتا تھا۔

”تب پھر مجھے واپس نہ جانا چاہئے۔“ وہ ایک طرف ہنسی ہوئی بولی۔

”یعنی.....!“ انور مٹھکے خیز انداز میں بولا۔

”میرے لئے خودکشی ہی بہتر ہوگی۔“ وہ جھیل کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔

”تو ادھر کہاں جا رہی ہو۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”جھیل شاید زیادہ گہری نہیں ہے۔“

شایدہ رک گئی۔

”تمہارے پاس پستول بھی تو ہے۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لو میں یہاں سے ہٹا

ہوں شاید میری موجودگی میں تمہیں خودکشی کرتے وقت کچھ جاب محسوس ہو۔“

”تم درندے ہو۔“ شایدہ آہستہ سے بولی۔ ”محمود ٹھیک کہتے تھے۔“

”بھلا اس میں درندگی کی کیا بات ہے۔ میں تو تمہیں ایک معقول مشورہ دے رہا تھا۔“

شایدہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

”یہ اداکاری دکھانے کا وقت نہیں۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈھائی بج رہے ہیں

کسی نے واپسی پر ہمیں دیکھ لیا تو محمود تمہیں کل ہی طلاق دے دے گا۔“

شایدہ اس طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”خدا کے لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”بس فضول باتیں بند کرو..... گھر کا راستہ ادھر ہے۔“ انور ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا ہوا ہوا

دونوں پھر چلنے لگے۔

”میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں کسی سے کہنا نہیں۔“

”تمہاری پچھلی بد اخلاقیوں مجھے انتقام پر مجبور کر رہی ہیں۔“

”تم نہیں جانتے میری ساری زندگی زہر بن گئی ہے۔ میں اپنے لئے بھی عذاب ہوں

دوسروں کے لئے بھی۔“

”میں جانتا ہوں..... اور اسی دن سے جانتا ہوں جس دن تم پہلی بار رقص گاہ میں لی گئی

”بعض اوقات میں پاگل ہو جاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ان دونوں میں سے کس پر گولی.....“

”آخربات کیا ہے۔“ رانی صاحبہ نے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں.....!“

”تم لوگ مجھے سچ پاگل بنادو گے۔“

”رشو.....!“ انور نے رشیدہ کی طرف گھور کر دیکھا۔

رشیدہ وہاں سے چلی گئی۔

شورن کر شاہدہ بھی آگئی تھی۔ لیکن اب بھی اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”محمود تم بتاتے کیوں نہیں۔“ رانی صاحبہ پھر بولیں۔

”کیا بات ہے۔“ شاہدہ نے آہستہ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں.....!“ محمود سند لہجے میں بولا۔

رانی صاحبہ سر پکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔

رشیدہ دونوں سوٹ کیس لے کر آگئی تھی۔

”ارے..... ارے..... تو کیا واقعی۔“ رانی صاحبہ اٹھتی ہوئی بولیں۔

”ہاں رانی صاحبہ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔“ انور سوٹ کیس لے کر برآمدے کی

طرف بڑھتا ہوا بولا۔ رشیدہ اس کے پیچھے تھی۔ اچانک انور مڑا اور محمود کو مخاطب کر کے بولا۔

”لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ہری پور سے جا رہا ہوں۔“

”ہری پور تمہیں آج ہی چھوڑنا ہوگا۔“ محمود گرج کر بولا۔

”محمود.....!“ رانی صاحبہ چیخیں۔ ”بے شرم! بدتمیز..... چپ رہو۔“

”جی امّاں.....!“

”تم بدتمیز ہو..... اس گھر میں کبھی کسی مہمان کی بے عزتی نہیں ہوئی۔“

رانی صاحبہ محمود پر گر جتی ہیں اور یہ دونوں وہاں سے چل پڑے۔

”لیکن ہم جائیں گے کہاں۔“ رشیدہ نے کپاؤٹھ کے باہر آ کر پوچھا۔

”عمران کے گھر.....!“

”آخربات کیا تھی۔“

اس کا دماغ نرّی طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے پچھلی رات کو محض ایک شے کی یاد شاہدہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ڈاکٹر کی بہن کے ساتھی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاہدہ جو اس کی حقیقت سے واقف تھی کہ اگلے دے گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ وہ توقعات سے بڑھ کر سخت ثابت ہوئی۔ بہر حال انور کے ذہن میں جو شبہ رہا تھا اس نے حقیقت کی سرحدوں کو چھونے کے لئے ایک نئی شکل اختیار کر جیسے ہی محمود ماتھے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لہ انور نے اُسے دیکھ کر متحیر انداز میں سر ہلا دیا اور مسکرا کر آنکھ ماردی۔

”شرارت نہیں پیارے..... شرافت.....!“

”یعنی.....!“

”اپنے کمرے میں چلو.....!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ وہ آنکھوں سے شاہدہ کی طرف دیکھتا تھا۔ اس کے اطمینان میں قطعی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پھر انور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یقیناً انور کے دماغ میں بھی فتور ہے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد جب رانی صاحبہ اپنے مرغی خانے کی دیکھ بھال کے سلسلے نوکروں کو ہدایات دینے جا رہی تھیں انہوں نے محمود کے کمرے میں تیز تیز آوازیں سنیں اور ان کے کمرے سے نکلے دیکھا۔ جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ کیساتھ رشیدہ بھی تھیں۔

”رشو.....!“ انور تیز لہجے میں بولا۔ ”اپنا سامان درست کرو۔“

”ہائیں کیا بات ہے۔“ رانی صاحبہ نے اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں اب جانا چاہتا ہوں۔“ انور بے رخی سے بولا۔

”آخر کیوں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو وجہ نہ بتا سکوں گا۔“

”تو کیا کسی بات پر ناراض ہو کر جا رہے ہو۔“

”میں اس پر بھی اظہار خیال کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔“

اتنے میں محمود بھی آ گیا۔ اس کی آنکھیں بھی غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”پھر بتاؤں گا۔“

وہ دونوں تیزی سے قصبے کی طرف جارہے تھے۔

”ایک بات اور.....“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”محمود نے مجھے دھمکی دی ہے۔“
”دھمکی! کیسی دھمکی؟“

”یہی کہ اگر میں آج ہی ہری پور سے نہ چلا گیا تو.....!“

”لاشیں گرجائیں گی انور صاحب۔“ عمران اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”میرے مہمان

کو بڑھی نظر سے دیکھنے والا زمین پر پیر نہ ٹیک سکے گا۔ یہ حویلی نہیں عمران کا گھر ہے۔“

”ایسا نہ کہو..... وہ یہاں کا سب سے بڑا جاگیردار ہے۔“

”تو انور صاحب آپ کا یہ خادم بھی کسی سے گیا گذرا نہیں۔“ عمران اکڑ کر بولا۔ ”بخدا

میں اس وقت نشے میں نہیں ہوں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ۔ میں سچ کہتا

”انور صاحب میں نے آپ کو پہلے ہی حویلی والوں کے چھچھورے پن سے مطلع کر ہوں کہ میں تو صرف موقع کی تلاش میں تھا۔ ذرا محمود بول کر تو دیکھئے۔“

انور خاموش ہو گیا اور عمران اپنے چوڑے چکلے بازوؤں کی طرف دیکھتا رہا۔

”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ عمران کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”محمود آپ لوگوں کو خاص

طور سے یہاں لایا تھا۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“

”یہ بات سارے قصبے میں مشہور ہے۔“

”لیکن لوگوں کو یہ بات معلوم کیسے ہوئی۔“

”حویلی ہی والوں کے ذریعے سے۔“

”اوہ.....!“ انور کچھ سوچنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ نے شاید انہیں منع کر دیا تھا کہ آپ کے آنے کا مقصد کسی سے نہ

بتائیں۔“ عمران مسکرا کر بولا۔

”آپ کا خیال صحیح ہے۔“ انور اسے گھورتا ہوا بولا۔

”اور ان لوگوں نے اس کے خلاف کیا..... آخر کیوں؟“

”یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ انور نے کہا۔

”آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے۔“ عمران ہنس کر بولا۔ ”آپ محمود کو نہیں جانتے۔ وہ

نیا میزبان

عمران نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ انور اور رشیدہ سے اس طرح کھل مل کر باتیں کر رہا

جیسے برسوں سے انہیں جانتا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز زیادہ تر رشیدہ تھی۔

”انور صاحب میں نے آپ کو پہلے ہی حویلی والوں کے چھچھورے پن سے مطلع کر ہوں کہ میں تو صرف موقع کی تلاش میں تھا۔ ذرا محمود بول کر تو دیکھئے۔“

تھا۔“ عمران نے کہا۔ ”میں یہ مان نہیں سکتا کہ آپ کسی ناخوشگوار واقعے کے شکار نہیں ہوئے

میں ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“

”میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں یونہی تفریبا آپ کا مہمان بنا ہوں۔“ انور ہنس کر بولا۔

”مہمان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں..... خصوصاً بڑے

صاحبہ کی موجودگی تو میرے لئے باعث فخر ہے۔ انور صاحب میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔

اور پھر رشیدہ صاحبہ نے تو داراب جیسے خوفناک ڈاکو کو ختم کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ مشرقی عورتیں

کسی سے کم نہیں۔“

”آپ کو ہم لوگوں کے متعلق کس نے بتایا۔“ انور نے پوچھا۔

”حویلی ہی میں معلوم ہوا تھا۔“ عمران ہنس کر بولا۔ ”اور اس کے بعد ہی میں آپ لوگوں

کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ محمود مجھے کبھی آپ

لوگوں سے نہ ملنے دے گا۔ اسی لئے میں نے وہ کل والا بے تکا طریقہ اختیار کیا تھا۔ آپ لوگوں

میری حماقت پر ہنسی تو بہت آئی ہوگی اور سچ پوچھئے تو وہ تھا بھی بچکانہ طریقہ۔ میں نے آپ

شکار کا سارا مزہ کر کر کر دیا تھا۔“

رشیدہ ہنسنے لگی۔

انہائی مکار اور کینہ تو ز آدی ہے۔ ایک طرف تو وہ آپ کو اس پرندے کی حقیقت معلوم کرنے لے لایا اور پھر آپ کی تاکید کے باوجود بھی اس نے اس کا تذکرہ دوسرے لوگوں سے کر دیا۔
 سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔“

”نران صاحب..... آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔“ انور اسے مصنوعی حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ”نہی سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔“

”اور مجھے یقین ہے کہ یہی سوال آپ کو اس پرندے کی حقیقت تک لے جائے گا۔“
 انور کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ سے بولا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“
 ”محمود سے کوئی قصبہ میں خوش نہیں ہے۔“ عمران نے کہا۔

”آخریوں؟“

”محض اس کی کینہ پروری کی بناء پر۔“

”ایک بات تو میں بھی کہوں گا۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”شاہدہ جیسی نیک لڑکی ہرگز کے قائل نہ تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ عمران زہر خند کے ساتھ بولا۔ ”دولت زندگی کی دوسری قدروں سے ہے۔ وہ خود کبھی بد اخلاقی سے پیش نہیں آئی۔ شادی سے قبل بھی اس کا یہی رویہ تھا حالانکہ میرے اہم ہے۔“

”تو کیا اس کی شادی محمود کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے۔“ انور نے انجان بننے ہوئے کہا۔
 ”یہ ایک لمبی داستان ہے انور صاحب۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ شاہدہ رضا مند نہیں تھی اس سمجھوتے کی وجہ دولت ہی تھی۔ محمود کے چچا لاؤلد تھے یعنی رانی صاحبہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے محمود کو گود لے لیا تھا اور راجہ صاحب شاہدہ کو بھی بے حد چاہتے تھے۔ خواہش تھی کہ محمود اور شاہدہ کی شادی ہو جائے۔ لہذا انہوں نے وصیت کی کہ محمود اسی حالت ان کی پوری جائیداد کا وارث ہو سکتا ہے جب وہ شاہدہ سے شادی کر لے، ورنہ نہیں۔ لیکن میں آپ خود سوچ سکتے ہیں۔“

”تو کیا شاہدہ رضا مند نہیں تھی۔“

”میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔“

”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔“ انور اسے آنکھ مار کر مسکراتا ہوا بولا۔

عمران ہنسنے لگا۔ مگر اس کا قہقہہ بالکل کھوکھلا اور بے جان تھا۔

”یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔“ عمران نے کہا اور ایک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد

بولا۔ ”میں کینہ تو نہیں ہوں انور صاحب..... محمود اچھی طرح جانتا ہے کہ جب بھی مجھے موقع مل

گیا اسے نقصان پہنچانے سے باز نہ آؤں گا۔ اگر اس کے حصے میں آئی ہوئی دولت شاہدہ کو خرید

سکتی ہے تو میرا انتقامی جذبہ بھی کچھ کر سکتا ہے۔ میں افلاطونی عشق کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی

ایک آدمی ہوں۔ میں نے شراب کا پہلا پیگ اس وقت پیا تھا جب میں دس برس کا تھا۔“

”شاہدہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔“ انور نے پوچھا۔

”میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔“

”تو پھر کوئی بات ہی نہ ہوئی۔“ انور بولا۔

”یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہو۔“ عمران کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اب بھی جب کبھی

کے افراد مجھ سے نفرت کرتے ہیں شاہدہ اس معاملے میں ان سے بالکل الگ تھلگ نظر آتی

ہے۔ وہ خود کبھی بد اخلاقی سے پیش نہیں آئی۔ شادی سے قبل بھی اس کا یہی رویہ تھا حالانکہ میرے

اعزہ مجھ سے ہمیشہ نفرت کرتے رہے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ وہ ازراہ شرافت ایسا کرتی رہی ہو۔“ انور نے کہا۔

”تو میں کب اسے کینہ پن سمجھتا ہوں۔“ عمران ہنس کر بولا۔ ”مجھے اس سے محبت تھی اور

اب یا تو محمود کو مرنا پڑے گا یا شاہدہ کو طلاق دینی پڑے گی..... آپ ہنس رہے ہیں۔ بخدا

میں نشے میں نہیں ہوں۔ آپ کو یہ باتیں عجیب لگتی ہوں گی مگر میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں اپنی

کمزوریوں کو فلسفے یا منطق کی چادر میں چھپانے کا قائل نہیں۔ میں شاہدہ کی گلو خلاصی چاہتا ہوں

چاہے وہ جس صورت میں ہو۔“

”خیر چھوڑو.....!“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ شاہدہ شادی سے قبل بھی

چڑچڑی تھی۔“

”ہرگز نہیں.....!“ عمران بولا۔

”پھر آخر اس کے چڑے پن کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”محمود کی عیاشی اور اوباشی۔“

”اگر یہ بات ہے تو تمہیں بتاؤ کہ وہ تم جیسے بدنام آدمی سے کیسے شادی کر لیتی۔“

”خدا کی قسم اگر وہ مجھ سے کہتی تو میں شراب قطعی ترک کر دیتا۔ حالانکہ شراب میری

کا جزو لازم بن کر رہ گئی ہے۔ میں مرجاتا مگر شراب نہ پیتا۔ انور صاحب وہ جس طرح کئی

اسی طرح زندگی بسر کرتا۔ انور صاحب میں مرجاتا..... مگر!“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ مگر میں نے سنا ہے کہ محمود قصبے میں بہت نیک نام ہے۔“

”میں پھر کہتا ہوں انور صاحب کہ وہ بڑا مکار ہے۔ اس کے سیاہ کارناموں سے

واقف ہوں۔“

”مثلاً.....!“ انور نے کہا اور اپنی ساری توجہ اس کی طرف منعطف کر دی۔

عمران نے محمود کی عیاشی کی ایک داستان چھیڑ دی لیکن انور کو اس میں کوئی ایسی چیز نہ

جو اس کے کام کی ہوتی۔

رشیدہ اس گفتگو میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ محمود اور انور کی اچانک لڑائی

وجہ جاننا چاہتی تھی آخر یہ یک بیک کیا ہو گیا۔ رانی صاحبہ پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہو گا۔ اُسے

دوران میں اس سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ اُن کے لہجے میں اتنی گھلاوٹ اور مامت تھی کہ

اوقات اس کا بے اختیار یہ دل چاہتا تھا کہ ”ماں“ کہہ کر اس سے لپٹ جائے۔

کبھی وہ یہ سوچتی کہ شاید انور نے یہ سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا ہے۔

اس کی لڑائی مصنوعی تھی مگر خیال آتا کہ اتنی بے ساختہ قسم کی جنگ مصنوعی نہیں ہو سکتی۔ اُسے

سرخ سرخ اور اپنے حلقوں سے ابلتی ہوئی آنکھیں اچھی طرح یاد تھیں۔ غصہ مصنوعی ہو سکتا

لیکن اس کا خارجی رد عمل ہرگز مصنوعی نہیں ہو سکتا۔ مصنوعی غصے میں آدمی چیخ تو سکتا ہے

کی آنکھیں نہیں سرخ ہو سکتیں۔

تھوڑی دیر دونوں ادھر ادھر ہر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد انور نے پھر مطلب

باتیں شروع کر دیں۔

”تم نے میرا میزبان بننا تو منظور کر لیا ہے لیکن اگر اس سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں

ذمہ دار نہ ہوں گا۔“

”کس قسم کا نقصان.....؟“ عمران چونک کر بولا۔ ”کیا واقعی آپ مجھے محمود سے کمزور سمجھتے ہیں۔“

”محمود کی بات نہیں..... میرا اشارہ اس آتش پرندے کی طرف تھا۔“

عمران خاموش ہو گیا اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا

ہے۔ انور اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ رشیدہ بھی اس کی اس اچانک تبدیلی پر حیران ہوئی۔ حیرت کی

بات بھی تھی کیونکہ عمران ابھی کچھ ہی دیر قبل بہت بڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔

”عابلاً تمہاری میزبانی کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”یہ بات نہیں انور صاحب۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سچ مجھے بھی اسی حادثے سے

دوچار ہونا پڑا تو آگ پر قابو پانے کے لئے کون سی تدبیر اختیار کی جائے گی۔“

انور ہنسنے لگا۔

”خیر جی دیکھا جائے گا۔“ عمران اٹھتا ہوا بولا۔ ”قبل از مرگ واویلا سے کیا فائدہ۔ ہاں

یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کروندے کے جنگل کے متعلق کیا رہا۔ میں نے سارے انتظامات

مکمل کر لئے ہیں۔“

”بیکار ہے۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا۔ ”خواہ مخواہ در دسری مول لینے سے کیا فائدہ۔“

”میں کل ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ اس مقصد سے ادھر نہیں جانا چاہتے جو آپ نے ظاہر کیا تھا۔“

”تم غلط سمجھے۔“ انور نے کہا۔ ”میں اسے جنگلیوں کا جادو نہیں سمجھتا۔“

”پھر.....!“

”کسی انتہائی احمق آدمی کا کارنامہ..... جو محض مکانوں میں آگ لگانے کے لئے اتنی

”دسری مول لیتا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”عنقریب سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”تو کیا تم نے اُسے شاہدہ کے متعلق بتا دیا تھا۔“ اُس نے پوچھا۔

”قطعاً نہیں۔“ انور نے کہا۔ ”میں نے صرف اس سے اتنا کہا تھا کہ رات ڈاکٹر کی بہن جھیل کے کنارے کسی کی مرمت کر رہی تھی۔ اس پر وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر یکایک خود بخود پاگل کتے کی طرح بھونکنے لگا۔ پچھلی باتیں نکال بیٹھا۔ کہنے لگا اگر تم یہاں رہے تو حویلی راگھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔ گاؤں والے الگ بدظن ہو گئے ہیں اس طرح بات بڑھ گئی۔“

رشیدہ کچھ سوچنے لگی۔

”لیکن وہ کون تھا جسے تم نے ڈاکٹر کی بہن کے ساتھ دیکھا تھا۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

”محمود.....!“ انور نے کہا اور سگریٹ نکالنے کے لئے جیب ٹٹولنے لگا۔

”محمود.....!“ رشیدہ نے تحیر آمیز انداز میں دہرایا۔

”ہاں محمود! یہاں کوئی خطرناک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔“ انور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے

کہا۔ ”محمود کو شبہ ہو گیا ہے کہ شاید میں نے ہی ان دونوں پر گولی چلائی تھی۔“

”اگر اس نے یہ سمجھا ہے تو بالکل احمق ہے۔ بھلا تم اس پر گولی کیوں چلانے لگے؟“

”اتنی ہی عقل ہوتی تو جاگیردار کیوں ہوتا۔“

”تم نے اسے بتا کیوں نہیں دیا کہ گولی شاہدہ نے چلائی تھی۔“

”نہیں میں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔“

”اور کیا وہ جانتا ہے کہ تم نے اسے پہچان لیا تھا۔“

”ظاہر ہے، جیسی تو وہ اس پر مصر ہے کہ میں ہری پور سے چلا جاؤں۔“

”لیکن تم نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم اسے پہچان گئے تھے۔“

”نہیں.....!“

رشیدہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

”شام کو ہم لوگ جھیل میں مچھلیوں کا شکار کھیلیں گے۔“ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔

”بس تمہیں ہی مبارک رہے۔“ رشیدہ بے دلی سے بولی۔

”خیر! یہ اور اچھا ہے کہ تم میری دم میں نہ بندھو گی۔“

عمران کچھ سوچنے لگا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر ان کی طرف مخاطب ہوا۔

”اچھا اب آپ لوگ آرام کیجئے۔ میں کچھ دیر کے لئے اجازت چاہوں گا۔“

”کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں۔“ انور نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں میرا دل چاہتا ہے جھیل میں مچھلیوں کا شکار کھیلوں۔“

”ضرور..... ضرور..... میں کانٹے وغیرہ مہیا کر دوں گا۔“

”کانٹے نہیں جال.....!“ انور نے کہا۔

”جال کے شکار میں کیا لطف آئے گا۔ خیر جال بھی مل جائے گا۔“

عمران چلا گیا اور انور اٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس مکان میں عمران دو ملازمین

ساتھ تنہا رہتا تھا۔ اس کے خاندان کے بقیہ افراد دوسرے مکان میں رہتے تھے۔ شاید خود

لوگوں نے عمران کو الگ کر دیا تھا یہاں وہ سارے لوازمات مہیا تھے جو ایک عیاش رئیس کے

ضروری ہو سکتے تھے۔

رشیدہ ان سب چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو صرف

سوال گونج رہا تھا کہ واقعات کا یہ نیا موڑ کیا معنی رکھتا ہے۔

”انور.....!“ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرنے والے ہو۔“

”میں محبت کرنے والا ہوں۔“

”دیکھو مجھے خواہ مخواہ الجھن میں مت مبتلا کرو۔“

”میں نے ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔“

”تم محمود سے کیوں لڑ گئے۔“

”میں نہیں لڑا بلکہ وہ خود لڑ گیا۔“

”آخر کیوں؟“

”انور نے اُسے رات کے سارے واقعات بتا دیے اور رشیدہ اسے تحیر آمیز نظروں

دیکھنے لگی۔“

رشیدہ اٹھ کر دو خانے کی طرف چلی گئی۔

”ہاں تو انور صاحب.....!“ ڈاکٹر میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر انور کی طرف جھکتا ہوا بولا۔
”پرسوں رات کو میں آپ کی شخصیت سے واقف نہیں تھا۔“
انور صرف مسکرا کر رہ گیا۔

”اس کی اطلاع تو آپ کو ملی ہوگی کہ کل رات کو میرے گھر میں بھی آگ لگ گئی تھی۔“
ڈاکٹر بولا۔ ”قبل اس کے کہ میں اس پرندے پر گولی چلاتا وہ چھت پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن انور صاحب کل مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اس حرکت میں کسی آدمی کا ہاتھ ہے۔“
”وہ کیسے.....؟“ انور حیرت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”کسی نے پٹرول چھڑک کر مکان کے عقبی حصے میں آگ لگائی تھی اور میں نے ایک آدمی کو بھاگتے بھی دیکھا تھا۔ قبل اس کے کہ میں اس کا تعاقب کرتا وہ کہیں غائب ہو گیا۔“
”آپ کے علاوہ اور کسی نے اس قسم کی اطلاع نہیں دی۔“

”مجھ میں اور دوسروں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”دوسرے لوگ اس پرندے سے خائف تھے لیکن میں نہیں تھا۔ دوسروں کے اوسان ہی بجا نہیں رہتے کہ وہ ان چیزوں کی طرف غور کر سکیں۔“

”جس وقت آگ لگی تھی آپ کے ہاتھ میں رائفل تو رہی ہوگی۔“ انور نے کہا۔

”ہاں تھی تو..... میں اس پرندے کی تاک میں تھا۔“

”تو پھر آپ نے اس بھاگنے والے پر فائر کیوں نہیں کیا۔“

”یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی۔“ ڈاکٹر سوچتا ہوا بولا۔ ”مگر غلطی کیوں۔ بات دراصل یہ ہے انور صاحب کہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے کہ میں کسی آدمی پر اس قسم کا حملہ نہیں کر سکتا جس سے اس کی جان جانے کا احتمال ہو۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیوار پر لگے ہوئے ایک چارٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس کا تذکرہ آپ نے کسی اور سے بھی کیا ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”میں دراصل اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔“ ڈاکٹر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

شکار اور شکاری

”تم ڈاکٹر سے ملی ہو۔“ انور نے رشیدہ سے پوچھا۔

”نہیں.....!“

”چلو تمہیں اس سے ملاؤں۔ بہت معقول آدمی ہے۔“

”بھئی میں نہ جانے کیوں کل رات سے تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ سر میں بھی درد ہے۔“

”تو پھر تمہیں تو ڈاکٹر سے ضرور ملنا چاہئے۔“

”ہاں..... اچھا..... خیر چلو۔“ رشیدہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

دس بج گئے تھے۔ انور عمران کے نوکر کو اطلاع دے کر ڈاکٹر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

رشیدہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ یہ لوگ اس وقت پہنچے جب ڈاکٹر مطب سے اٹھ کر جانے کی تیار

کر رہا تھا۔ انور اور رشیدہ کو دیکھ کر وہ بزرگانہ انداز میں مسکرایا۔

”آئیے آئیے!“ وہ انور سے مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ ”اس رات کے بعد سے تو پھر آپ۔“

ملاقات ہی نہ ہوئی۔ میں دراصل اس وقت حویلی ہی کی طرف جا رہا تھا۔ محض آپ سے ملنے کے لئے۔“

پھر وہ رشیدہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کی تعریف۔“

”یہ میری دوست مس رشیدہ ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی۔“ ڈاکٹر نے رشیدہ سے مصافحہ کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”انکی طبیعت کچھ بھاری تھی۔“ انور نے کہا۔ ”لہذا میں نے سوچا کہ آپ ہی پاس چلوں۔“

ڈاکٹر تھوڑی دیر تک رشیدہ کی طبیعت کا حال پوچھتا رہا پھر کہا ”ڈاکٹر کو آواز دے کر اسے

ہدایتیں دیں۔“

”بس ایک ڈونپی لیجئے بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ابھی تک میں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“

”کیا کسی خاص خیال کے تحت آپ نے ایسا کیا ہے۔“

ڈاکٹر چونک کر انور کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”کیوں؟ کیا آپ پر یہ خیال واضح نہیں ہوا۔ کیا اس واقعے کو شہرت دینے سے مجرم ہوشیار نہ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن وہ پرغہ۔“

”میں ابھی تک اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”حوالی والوں سے آپ کے کیسے تعلقات ہیں۔“ انور نے اچانک پوچھا۔

ڈاکٹر اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹ ایسے انداز میں سکڑ گئے جیسے

انور کا مٹھکا اڑانے کا ارادہ کر رہا ہو۔

”اس سلسلے میں آپ کا یہ سوال قطعی غیر متعلق معلوم ہوتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”بہر حال میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ میں یہاں ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے جواب دوں! ایک عام آدمی کی حیثیت سے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ دونوں حیثیتیں آپ کی شخصیت سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔“ انور

نے انتہائی خشک لہجے میں کہا۔

”بحیثیت ڈاکٹر میرے ان کے تعلقات کاروباری ہیں اور بحیثیت ایک عام آدمی حوالی کا

انکثر دعوؤں میں شرکت کر چکا ہوں۔ اگر تعلقات سے آپ کی مراد زیادہ ربط و ضبط ہے تو میں اس کا قائل ہی نہیں۔ میرا کبھی کسی سے زیادہ ربط و ضبط نہیں رہا۔“

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رشیدہ اور ڈاکٹر کی بہن دکھائی دیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے

رشیدہ کی گردن میں ہاتھ ڈالے دواخانے سے آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے بجائے متانت اور بنییدگی تھی۔ کپڑے بھی اس نے کافی سلیقے سے پہن رکھے تھے۔

”بھیا یہ میری سہیلی ہیں۔“ وہ ڈاکٹر سے بولی۔

ڈاکٹر اسے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گیا۔

”ٹھیک ہے سلیمہ..... ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”لیکن گردن میں ہاتھ نہیں ڈالا کرتے۔“

”کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ رشیدہ مسکرا کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

دونوں بیٹھ گئیں۔ سلیمہ کا ہاتھ اب بھی رشیدہ کی گردن میں تھا۔

”تم بہت اچھی ہو۔“ وہ رشیدہ کے گال پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ ”شاید تم شتر مرغ کی

بہن ہو۔“

”سلیمہ.....!“ ڈاکٹر ملتجیانہ انداز میں بولا۔

”آپ فکر مت کیجئے۔“ رشیدہ نے پھر کہا۔

”رانی صاحبہ کے خاندان میں محمود سب سے زیادہ نیک ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا.....؟“

انور نے اچانک پوچھا۔

ڈاکٹر جو اپنی بہن کی طرف دیکھ رہا تھا چونک کر انور کی طرف مڑا۔

”محمود واقعی اچھا آدمی ہے۔ اس قصبے میں اس کا دم غنیمت ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”محمود.....!“ سلیمہ چیخ کر بولی۔ ”وہ سُرور کا بچہ ہے۔“

”سلیمہ خدا کے لئے۔“ ڈاکٹر اٹھتا ہوا غمزہ آواز میں بولا۔ پھر انور کی طرف متوجہ ہو کر

معذرت کرنے لگا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”اچھا اب ہم اجازت چاہیں گے۔“

”تم بھی جاتی ہو۔“ سلیمہ رشیدہ کو کھینچ کر بٹھاتی ہوئی بولی۔ ”میں نہیں میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔“

رشیدہ ہنسنے لگی۔

”اچھا میں نہیں جاؤں گی۔“ رشیدہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر انور سے کہنے لگی۔ ”تم جاؤ

میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔“

والہی میں انور رشیدہ کی ذہانت کی تعریف کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ یقیناً کوئی کام کی

بات معلوم کر کے واپس آئے گی۔

ادھر عمران نے صحن میں تین چار جال پھیلا رکھے تھے۔ اُن میں سے کچھ بوسیدہ تھے جن کی

مرمت کی جارہی تھی۔

”بھئی کمال کر دیا۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”ارے ایک کافی تھا۔“

”ان میں سے جو پسند ہو منتخب کر لیجئے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تقریباً مچھلی کا شمار کروالے کبھی جال استعمال نہیں کرتے لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ شاید یہ جال آپ آسمان پر لگا کر انور صاحب میں کبھی آپ کو مشورہ نہ دوں گا۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں معلوم ہوتا۔ شہر میں قصبہ والوں نے کئی بہت بڑے بڑے عالموں کی اعانت حاصل کی تھی لیکن وہ منحوس ہونے کا توں رہا۔

”لیکن اب میں اسے جوں کا توں نہیں رہنے دوں گا۔“ انور سرسرا کر بولا۔ ”تم ڈرو نہیں اس سلسلے میں تم سے اور کوئی مدد نہیں لوں گا۔“

”شاید آپ مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔“ عمران تلخ لہجے میں بولا۔

”یہ بات نہیں..... میں خود زیادہ بھیڑ نہیں چاہتا۔“

”آپ کی مرضی.....!“

”ہاں ایک بات اور.....“ انور نے کہا۔ ”آج ذرا ہوشیار رہنا۔ ممکن ہے کہ آج تمہارا ہی مکان کی باری ہو۔“

”مجھے اس کی فکر نہیں۔“ عمران لاپرواہی سے بولا اور انور چند سیکنڈ معنی خیز انداز میں اس طرف دیکھتے رہنے کے بعد جال منتخب کرنے لگا۔ عمران اُسے تشویش آمیز نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بھاری غلطی کر بیٹھنے کے بعد پچھتا رہا ہو۔ انور اس کی طرف پلٹا۔

”ڈاکٹر نصیر کی بہن سلیمہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”آپ کے سوالات بڑے عجیب ہوتے ہیں۔“ عمران کے لہجے میں تلخی تھی۔

”مطلب یہ ہے کہ وہ کافی خوبصورت ہے۔“

”ہاں ہے تو.....!“

”سنا ہے محمود اس میں کافی دلچسپی لیتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔“

”تم نے کوشش کی۔“ انور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”سمال کرتے ہیں آپ بھی۔ قبلہ مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا۔“

”کیوں؟ کیا تم اس سے ڈرتے ہو۔“

”آپ اس وقت دلچسپ باتیں کر رہے ہیں۔“ عمران طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”کیا آپ کسی پاگل سے دوستی کر سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں؟ کیا تم رشیدہ کو پاگل نہیں سمجھتے۔“

”خیر آپ اب مذاق پر اتر آئے۔ میں سمجھا تھا شاید آپ سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہیں۔“

”بہذا میں قطعی سنجیدہ ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”سلیمہ بہت آسانی سے۔“

”بس بس رہنے دیجئے۔“ عمران ہنس کر بولا۔ ”مجھے اپنی ناکارہ زندگی بہت عزیز ہے۔“

”کیوں؟ کیا وہ حملہ بھی کر بیٹھتی ہے۔“

”کیوں نہیں..... پچھلے ہی مہینے کی بات ہے کہ ایک صاحبزادے نے اسے چھیڑ دیا تھا۔ پھر اس نے اس کی ایسی مرمت کی کہ وہ ایک ہفتے تک پلنگ سے اٹھنے نہیں پائے۔ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔ اس نے کسی پاگل کتیا کی طرح ان کی بوئیاں نوچ کر رکھ دی تھیں۔ پھر اس دن سے کسی کی ہمت نہیں پڑی اور ویسے وہ کسی سے بولتی بھی نہیں۔“

”تو اس کا یہ مطلب کہ اُسے چھیڑنا خطرناک ہے۔“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”لیکن ایسی صورت میں بھی بعض بے جگہ ایسے ہوں گے جو اسے چھیڑنے سے باز نہ آتے ہوں گے۔“

”یہ محض آپ کا خیال ہے۔“ عمران سنجیدگی سے بولا۔ ”جس وقت وہ گھر سے باہر نکلتی ہے پورے گاؤں میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ دراصل وہ روایت ہے؟ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پرندے کا تعلق اسی کی ذات سے ہے۔“

انور کچھ سوچنے لگا۔ اس کے ذہن میں کئی سوال ابھر آئے تھے۔ محمود اس سے کیوں خائف نہیں ہے؟ اور وہ دونوں جمیل کے کنارے کیا کر رہے تھے۔ اگر محمود اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا تو اس نے اس کی بوئیاں بھی کیوں نہیں اڑا دیں۔ وہ سوچتا رہا اور عمران اٹھ کر چلا گیا۔ انور یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ عمران نے جس گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا اب اس کی جگہ ایک قسم کی اکتاہٹ نے لے لی ہے۔

کدھر ہوگا اس کا تصفیہ وہ نہ کر سکا۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ آج عمران کے گھر کی باری ہے لیکن مجرم اتنا احق نہیں ہو سکتا۔ وہ ابھی تک اس پرندے کو دوسروں کی گرفت سے محفوظ رکھنے کیلئے کافی احتیاط برت چکا تھا۔ انور کے خیال کے مطابق اس پر گولی پڑتے ہی جو دھماکہ ہوا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ پرندے کے چیتھوڑے اڑ جائیں اور وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ سکے۔

آہستہ آہستہ تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ آخر تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد اسے ایک موزوں درخت مل گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور درخت پر چڑھنے لگا۔ بمشکل ایک شاخ تک ہاتھ پہنچا تھا کہ کہیں قریب ہی سیڑیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ بلکہ بالکل ویسی ہی جیسی حویلی میں آتشزدگی کے موقع پر سنائی دی تھیں..... انور ہٹم گیا۔

وہ پھر نیچے اتر آیا اور اب وہ جھکا ہوا آہستہ آہستہ سیڑی کی آواز کی طرف ریک رہا۔ ”خیر..... خیر..... اچھا مجھے کام کرنے دو۔“ انور پھر بیٹھ کر جال کی مرمت کرنے لگا۔ آوازیں جھیل کی سمت سے آرہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سناٹا چھا گیا لیکن انور بدستور جھیل رشیدہ دوسری طرف چلی گئی۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ اکتا گئی تھی۔ اس کیس میں اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

ذرا برابر بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک نہ تو انور اور اچانک ایک زوردار گھونسلہ اس کی کپٹی پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ قبل اس کے خود کو کئی تھوڑی بنا سکی تھی۔ بس چند واقعات کی بناء پر اندھیرے میں تیر چلائے جا رہے تھے۔ کہ وہ سنبھلا اس کی گردن کسی کی آہنی گرفت میں تھی اور دو خونخوار آنکھیں جن سے درندگی ٹپک ان سب باتوں کے باوجود انور ہمت نہیں ہارا تھا۔ اس کا خیال کہ بعض اوقات بغیر کسی بھی اس کے چہرے پر جھگی ہوئی تھیں۔ انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی قوت مدافعت سمجھے افعال بھی مقصد تک پہنچا دیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ساز کے پردوں پر بلا مقصد اڑا رکھی جاتی جارہی ہے۔ خونخوار آنکھوں کے دائرے وسیع ہوتے جا رہے تھے۔ تاریک پس منظر ہوئی انگلیاں غیر شعوری طور پر وہی دھن پیدا کر لیتی ہیں جس کیلئے وہ عرصے سے بے تاب تھا۔ اس کے چہرے کے قریب دو انگلی ٹھیاں دبک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ انگلی ٹھیاں بھی سرد وہ چھیلوں کے جال کو ایک خاص ڈھنگ سے ترتیب دیتا رہا۔

اور پھر سورج غروب ہونے سے قبل ہی جال سمیت جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے گال پر کوئی چیز ریک رہی ہے جسے اس عجیب اتفاق تھا کہ رشیدہ کو اس دوران میں اچھا خاصا بخار ہو گیا اور اسے اتنی بھی سہ نہ رہا۔

وہ انور کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکتی اور عمران نے جانے کیوں انور سے رسائی نہ کی۔ چاروں طرف مدم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی بڑے صندوق میں بند ہے لیکن آہستہ آہستہ جب اس کی آنکھیں اس نئے ماحول کی عادی ہو گئیں تو پتہ چلا کہ وہ ایک خیمے کے نیچے بیٹھا ہے۔ داہنی طرف دروازے کے قریب دو موم بتیاں روشن تھیں۔ ایک طرف لکڑی کا ایک بے ہنگم ساخت تھا جس پر ایک عجیب الخلق آدی بیٹھا اسے گھور

خیالی نقشے کے احاطے میں ہو۔ اُسے یہ یقین تھا کہ وہ پرندہ آج بھی نمود

تھوڑی دیر بعد رشیدہ واپس آ گئی۔ انور اسے دیکھ کر مسکرایا اور جال چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تو کیا تم سچ سچ شتر مرغ کی بہن ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”فضول باتیں مت کرو..... میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ڈاکٹر کی بہن نے تمہاری بھی مرمت کر دی۔“

”مجھے اس سے ہمدردی ہے۔“

”اور اسی ہمدردی کی وجہ سے تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔“ انور منہ سکڑ کر بولا۔

”کوئی کام کی بات ہے؟“

”کچھ نہیں! یہ بھی میری ایک حماقت تھی۔ بھلا کسی محبوس الخواس سے کوئی کام کی بات میں آتشزدگی کے موقع پر سنائی دی تھیں..... انور ہٹم گیا۔“

”ہو سکتی ہے۔“

”خیر..... خیر..... اچھا مجھے کام کرنے دو۔“ انور پھر بیٹھ کر جال کی مرمت کرنے لگا۔ آوازیں جھیل کی سمت سے آرہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سناٹا چھا گیا لیکن انور بدستور جھیل رشیدہ دوسری طرف چلی گئی۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ اکتا گئی تھی۔ اس کیس میں اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

ذرا برابر بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک نہ تو انور اور اچانک ایک زوردار گھونسلہ اس کی کپٹی پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ قبل اس کے خود کو کئی تھوڑی بنا سکی تھی۔ بس چند واقعات کی بناء پر اندھیرے میں تیر چلائے جا رہے تھے۔ کہ وہ سنبھلا اس کی گردن کسی کی آہنی گرفت میں تھی اور دو خونخوار آنکھیں جن سے درندگی ٹپک ان سب باتوں کے باوجود انور ہمت نہیں ہارا تھا۔ اس کا خیال کہ بعض اوقات بغیر کسی بھی اس کے چہرے پر جھگی ہوئی تھیں۔ انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی قوت مدافعت سمجھے افعال بھی مقصد تک پہنچا دیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ساز کے پردوں پر بلا مقصد اڑا رکھی جاتی جارہی ہے۔ خونخوار آنکھوں کے دائرے وسیع ہوتے جا رہے تھے۔ تاریک پس منظر ہوئی انگلیاں غیر شعوری طور پر وہی دھن پیدا کر لیتی ہیں جس کیلئے وہ عرصے سے بے تاب تھا۔ اس کے چہرے کے قریب دو انگلی ٹھیاں دبک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ انگلی ٹھیاں بھی سرد وہ چھیلوں کے جال کو ایک خاص ڈھنگ سے ترتیب دیتا رہا۔

اور پھر سورج غروب ہونے سے قبل ہی جال سمیت جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے گال پر کوئی چیز ریک رہی ہے جسے اس عجیب اتفاق تھا کہ رشیدہ کو اس دوران میں اچھا خاصا بخار ہو گیا اور اسے اتنی بھی سہ نہ رہا۔

وہ انور کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکتی اور عمران نے جانے کیوں انور سے رسائی نہ کی۔ چاروں طرف مدم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی بڑے صندوق میں بند ہے لیکن آہستہ آہستہ جب اس کی آنکھیں اس نئے ماحول کی عادی ہو گئیں تو پتہ چلا کہ وہ ایک خیمے کے نیچے بیٹھا ہے۔ داہنی طرف دروازے کے قریب دو موم بتیاں روشن تھیں۔ ایک طرف لکڑی کا ایک بے ہنگم ساخت تھا جس پر ایک عجیب الخلق آدی بیٹھا اسے گھور

خیالی نقشے کے احاطے میں ہو۔ اُسے یہ یقین تھا کہ وہ پرندہ آج بھی نمود

تھوڑی دیر بعد رشیدہ واپس آ گئی۔ انور اسے دیکھ کر مسکرایا اور جال چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تو کیا تم سچ سچ شتر مرغ کی بہن ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”فضول باتیں مت کرو..... میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ڈاکٹر کی بہن نے تمہاری بھی مرمت کر دی۔“

”مجھے اس سے ہمدردی ہے۔“

”اور اسی ہمدردی کی وجہ سے تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔“ انور منہ سکڑ کر بولا۔

”کوئی کام کی بات ہے؟“

”کچھ نہیں! یہ بھی میری ایک حماقت تھی۔ بھلا کسی محبوس الخواس سے کوئی کام کی بات میں آتشزدگی کے موقع پر سنائی دی تھیں..... انور ہٹم گیا۔“

”ہو سکتی ہے۔“

”خیر..... خیر..... اچھا مجھے کام کرنے دو۔“ انور پھر بیٹھ کر جال کی مرمت کرنے لگا۔ آوازیں جھیل کی سمت سے آرہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سناٹا چھا گیا لیکن انور بدستور جھیل رشیدہ دوسری طرف چلی گئی۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ اکتا گئی تھی۔ اس کیس میں اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

ذرا برابر بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک نہ تو انور اور اچانک ایک زوردار گھونسلہ اس کی کپٹی پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ قبل اس کے خود کو کئی تھوڑی بنا سکی تھی۔ بس چند واقعات کی بناء پر اندھیرے میں تیر چلائے جا رہے تھے۔ کہ وہ سنبھلا اس کی گردن کسی کی آہنی گرفت میں تھی اور دو خونخوار آنکھیں جن سے درندگی ٹپک ان سب باتوں کے باوجود انور ہمت نہیں ہارا تھا۔ اس کا خیال کہ بعض اوقات بغیر کسی بھی اس کے چہرے پر جھگی ہوئی تھیں۔ انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی قوت مدافعت سمجھے افعال بھی مقصد تک پہنچا دیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ساز کے پردوں پر بلا مقصد اڑا رکھی جاتی جارہی ہے۔ خونخوار آنکھوں کے دائرے وسیع ہوتے جا رہے تھے۔ تاریک پس منظر ہوئی انگلیاں غیر شعوری طور پر وہی دھن پیدا کر لیتی ہیں جس کیلئے وہ عرصے سے بے تاب تھا۔ اس کے چہرے کے قریب دو انگلی ٹھیاں دبک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ انگلی ٹھیاں بھی سرد وہ چھیلوں کے جال کو ایک خاص ڈھنگ سے ترتیب دیتا رہا۔

رہا تھا۔ انور کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں بے شمار کیڑے ریگنکے لگے ہوں۔

انکشاف

یہ ایک قد آور اور بھاری بھر کم آدمی تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی اور مونچھیں کچھ اس بڑے آگے ہوئی تھیں کہ انور کو بے ساختہ کروندے کی جھاڑیاں یاد آ گئیں۔ اس کا چہرہ دھڑلہ تھا لیکن لباس مہذب دنیا کا تھا۔ شاید وہ انور کے استعجاب سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کی ہلکے دیکھ کر اسی کی گھنی مونچھوں میں جنبش ہوئی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ انور کا ہاتھ آہستہ آہستہ بڑے طرف بڑھ رہا تھا۔

”بیکار ہے بیٹے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہارا پستول تمہارے میں رہنے دیتا۔“

”میں سگریٹ کا پیکٹ نکالنے جا رہا تھا۔“ انور لاپرواہی سی بولا۔

”تمہاری دلیری کا میں معترف ہوں۔“ اس نے کہا اور انور کو عجیب نظروں سے دیکھ کر

انور نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ منتخب کر کے دیا سلائی ڈھونڈنا

”تمہاری دیا سلائی میرے پاس ہے۔ عجیب التعلقت آدمی نے دیا سلائی کی ڈھونڈنا

طرف پھینک دی۔“

انور سگریٹ سلگا کر کھڑا ہو گیا۔

”تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“ خوفناک چہرے والا بھی اٹھتا ہوا بولا۔

”میں اس ارادے سے نہیں اٹھا۔“ انور مسکرایا۔ ”وہ اتنے اطمینان کے ساتھ سگریٹ

تھا جیسے اپنے کمرے میں ہو۔ اس کے چہرے پر معصومیت پھیل گئی تھی اور وہ اتنا بولا

دینے لگا تھا جیسے دنیا کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف ہو۔“

”انور یہاں تمہاری کوئی مکاری نہیں چل سکے گی۔“

”مکاری.....!“ انور معصومانہ انداز میں بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ لیکن اتنا جانتا

ہوں کہ تم میرے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ میں مہماتبادلہ کا سچا پیرو ہوں۔“

”اگر واقعی میری موت آگئی ہے تو میں تمہاری بات پر ضرور یقین کر لوں گا۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”کل تمہیں نے مجھے جھیل کے کنارے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔“ انور نے اچانک پوچھا۔

”ہاں کیوں کیا مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے۔“ وہ تسخراً میز لہجے میں بولا۔

”نہیں مجھے خوشی ہوئی تھی۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم خواہ مخواہ اس معاملے میں آکودے۔“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں۔“

”میں بھی محض تمہارے عشق میں گرفتار ہو کر ان جنگلوں کی خاک چھان چھان کر پھانکتا پھر

رہا ہوں۔“ انور نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ بیساختہ ہنس پڑا۔

لیکن انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”کیا مطلب.....!“ وہ چونک کر بولا اور دفعتاً سنجیدہ ہو گیا۔

”یہی کہ تم سچ بچ اٹے نیک نہیں ہو جتنا کہ سمجھے جاتے ہو۔“

”یعنی.....!“

”یعنی یہ کہ آتش پرندے سے زیادہ میں اس پاگل لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔“

وہ انور کو گھورنے لگا غالباً وہ اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے جواب میں کیا

کہے۔ دفعتاً وہ گرج کر بولا۔ ”تم یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔“

”اگر میں تمہیں نہ پہچانتا تو.....!“ انور نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں چھوڑ دیتا..... کیونکہ کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔“

”اور ان لوگوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جن کے گھر تم نے پھونک دیئے۔“ انور نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔

”تمہیں اس سے کیا سروکار.....!“ وہ جھلا کر بولا۔

”سروکار نہ ہوتا تو میں یہ زحمت ہی کیوں مول لیتا۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

انور خاموش ہو گیا اور وہ خاموشی سے انور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی الجھن میں مبتلا ہو گیا ہو۔

”بہر حال تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ وہ تخت پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”اور میں تمہیں ابھی ختم کئے دیتا ہوں۔“

”ختم کرنے کے لئے کون سا طریقہ استعمال کرو گے۔“ انور اپنی چٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

”تم اینٹنگ بہت اچھی لیتے ہو۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم خنزیر ہو۔“

”ممکن ہے۔“ انور نے کہا اور اس طرح اپنی ٹائی کھول کر پھیکی جیسے اُسے گرمی لگ رہی ہو۔ قمیض کے بٹن بھی کھول دیئے۔

”تم میرے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر رہے ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ماروں گا۔“

انور کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئیں اور وہ بے بسی سے زمین پر بیٹھ گیا۔

”عمران میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے چپ چاپ چلا جاؤں گا۔“ انور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

عجیب الحلقہ آدی نے قہقہہ لگایا۔ ”تم مکار ہو۔ میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“

”تم جانتے ہو کہ محمود ہے میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔“

”ممکن ہے یہ بھی تمہاری مکاری ہو۔“

”تو پھر اب اس سے زیادہ اپنی صفائی میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔“ انور نے کہا اور سر جھکالیا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ لیکن اس کے دونوں ہاتھ بُری طرح مشغول تھے۔

وہ خوفناک آدی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر ہر قسم کے جذبات سے عاری نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اندھا، گونگا اور بہرہ ہو۔ اس کی

”مجھے فسوس ہے کہ تم جیسا ذہین آدمی میرے ہاتھوں مارا جا رہا ہے۔ کاش تم پہچانا نہ ہوتا۔ مگر کون جانے ممکن ہے یہ بھی تمہاری چال ہو۔“

انور اس طرح ہنس پڑا جیسے وہ اس سلسلے میں جھوٹ بولا ہو۔

”تم مجھ سے زیادہ چالاک معلوم ہوتے ہو۔“ انور بے اختیار بولا۔

”خیر..... خیر..... برخودار اب مجھے اور زیادہ گھسنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اس طرح اپنا

نہیں بچا سکتے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم مجھے پہچان گئے ہو۔“

”خیر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ انور لاپرواہی سے بولا۔ ”میں بے شک تمہیں پہچان

ہوں۔ میں نے کل ہی پہچان لیا تھا۔ دیکھو عمران تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“

عجیب الحلقہ آدی نے قہقہہ لگایا۔

”دیکھو انور تم درحقیقت اتنے چالاک نہیں جتنا خود کو سمجھتے ہو۔ اب تم عمران کا نام

اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ابھی ابھی تم نے ایک زبردست غلطی کی ہے جسے پتہ

رکھتے ہوئے میں تمہارے نعروں میں نہیں آ سکتا۔“

”کیسی غلطی.....؟“

”پانچل لڑکی کا تذکرہ۔ بھلا عمران کو اس کی ذات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

”تعلق میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ انور معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔

”یعنی.....؟“

”تمہیں محمود سے دشمنی ہے۔ محض اس لئے کہ تمہاری شادی شاہدہ سے نہ ہو سکی۔ تمہیں افادہ

سے علم ہو گیا کہ محمود ڈاکٹر کی بہن میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس پر تم نے شاہدہ کو محمود کے خلاف

اکسایا اور شاہدہ کا انتقامی جذبہ اس شدت سے ابھار دیا کہ وہ کل رات کو جھیل کے کنارے

دونوں پر گولی چلانے سے بھی باز نہ آئی۔ قصبے میں تم لوگوں کے گھر پھونک رہے ہو جن سے

دشمنی رکھتے ہو میں نہیں جانتا کہ تمہاری آئندہ سکیم کیا ہوگی۔ بہر حال یہ مسئلہ ہے کہ تم محمود

کو دینے کی فکر میں ہو۔ مگر اس طرح کہ اس کا الزام دوسروں کے سر جانے۔ ممکن ہے کہ تم

سلسلے میں ڈاکٹر نصیر اور محمود کو بھی الجھانے کی کوشش کرو۔“

”قلعی بے سود ہے.....“ انور جیب سے ریوالتور نکالتا ہوا بولا۔ ”تمہاری دوسری کوشش رہا تھا۔ انور گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس وقت سچ بچے اُسے اس کا چہرہ خوفناک معلوم ہونے لگا تھا۔ جس میں جہنم میں پہنچا دے گی۔“

انور پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹا اور اس کی ٹائی کوندے کی لپک کی طرح آگے بڑھ کر دھکیلی ہوئی وحشی کی کینٹی سے جا لگی۔ اس کے منہ سے ایک دہلی سی چیخ نکلی اور دوسرا قدم زمین پر پڑا۔ پہلے ہی وہ لہرا کر گر پڑا۔ انور کی ٹائی کے سرے پر پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جھول رہا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا خوفناک چہرے والا بیہوش ہو چکا تھا۔ انور نے اس کے دونوں ہاتھ ٹائی کے پچے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے جرائم کی عمر کتنی ہے اور اس حماقت کا کیا مقصد تھا۔“ اس کی پشت پر باندھ دیئے اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا جس سے اس کی ٹارچ اور پتھر برآمد ہوئے۔

اس کی تیز نظریں خیمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہاں کچھ زیادہ سامان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے جھوٹے سے صندوق نے انور کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی۔ صندوق تخت کی آڑ میں غائب ہو گیا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سب کچھ بھول گئی ہے لیکن مجھے وہ بات یاد ہے جس کی وہاں تک موم بتیوں کی روشنی اچھی طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود صندوق بنا ہوا اس کا داغ خراب ہو گیا تھا۔“

سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی ہو اور جب اس نے صندوق کھولا تو اس کے منہ سے حیرت آمیز آواز نکلی گئی۔ یہ روشنی ایک بوتل میں بھری ہوئی کسی سیال شے کی تھی۔ آگ کی طرح دکھتا ہوا عرق۔ انور نے موم بتیاں بجھا دیں اور اس عرق کی چمک پہلے سے زیادہ ہو گئی..... اس نے بوتل اٹھائی اور تمہاری بہن کی زندگی برباد کر دے۔“

جیب میں ڈال لی اور موم بتیاں پھر روشن کر دیں۔

پھر وہ خیمے سے باہر نکل آیا اور ٹارچ کی روشنی چاروں طرف ڈالنے لگا۔ کوندے کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔“

جھاڑیاں چاروں طرف سے خیمے پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ وہ ان میں چھپ کر رہ گیا۔ داہنے طرف لکڑی کا ایک کابک بنا ہوا تھا جس میں سے کبھی کبھی کسی کبوتر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انور نے کابک کھول کر ایک کبوتر نکالا اور بوتل سے عرق نکال کر اس پر ملنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے آتش پرندہ تیار ہو گیا۔ پھر انور نے اسے اڑا دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک چکر کاٹ کر پھر کابک آگرا۔ اس نے اسے بند کر دیا اور خیمے میں لوٹ آیا۔

وہ خوفناک آدی ہوش میں آ گیا تھا اور اب بیٹھا ہوا اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کھول ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم محمود کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آج سے تین سال قبل جب ہم شہر میں رہتے تھے“

”قلعی بے سود ہے.....“ انور جیب سے ریوالتور نکالتا ہوا بولا۔ ”تمہاری دوسری کوشش رہا تھا۔ انور گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس وقت سچ بچے اُسے اس کا چہرہ خوفناک معلوم ہونے لگا تھا۔ جس میں جہنم میں پہنچا دے گی۔“

انور پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹا اور اس کی ٹائی کوندے کی لپک کی طرح آگے بڑھ کر دھکیلی ہوئی وحشی کی کینٹی سے جا لگی۔ اس کے منہ سے ایک دہلی سی چیخ نکلی اور دوسرا قدم زمین پر پڑا۔ پہلے ہی وہ لہرا کر گر پڑا۔ انور کی ٹائی کے سرے پر پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جھول رہا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا خوفناک چہرے والا بیہوش ہو چکا تھا۔ انور نے اس کے دونوں ہاتھ ٹائی کے پچے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے جرائم کی عمر کتنی ہے اور اس حماقت کا کیا مقصد تھا۔“ اس کی پشت پر باندھ دیئے اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا جس سے اس کی ٹارچ اور پتھر برآمد ہوئے۔

اس کی تیز نظریں خیمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہاں کچھ زیادہ سامان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے جھوٹے سے صندوق نے انور کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی۔ صندوق تخت کی آڑ میں غائب ہو گیا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سب کچھ بھول گئی ہے لیکن مجھے وہ بات یاد ہے جس کی وہاں تک موم بتیوں کی روشنی اچھی طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے خود صندوق بنا ہوا اس کا داغ خراب ہو گیا تھا۔“

سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی ہو اور جب اس نے صندوق کھولا تو اس کے منہ سے حیرت آمیز آواز نکلی گئی۔ یہ روشنی ایک بوتل میں بھری ہوئی کسی سیال شے کی تھی۔ آگ کی طرح دکھتا ہوا عرق۔ انور نے موم بتیاں بجھا دیں اور اس عرق کی چمک پہلے سے زیادہ ہو گئی..... اس نے بوتل اٹھائی اور تمہاری بہن کی زندگی برباد کر دے۔“

جیب میں ڈال لی اور موم بتیاں پھر روشن کر دیں۔

پھر وہ خیمے سے باہر نکل آیا اور ٹارچ کی روشنی چاروں طرف ڈالنے لگا۔ کوندے کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔“

جھاڑیاں چاروں طرف سے خیمے پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ وہ ان میں چھپ کر رہ گیا۔ داہنے طرف لکڑی کا ایک کابک بنا ہوا تھا جس میں سے کبھی کبھی کسی کبوتر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انور نے کابک کھول کر ایک کبوتر نکالا اور بوتل سے عرق نکال کر اس پر ملنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے آتش پرندہ تیار ہو گیا۔ پھر انور نے اسے اڑا دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک چکر کاٹ کر پھر کابک آگرا۔ اس نے اسے بند کر دیا اور خیمے میں لوٹ آیا۔

وہ خوفناک آدی ہوش میں آ گیا تھا اور اب بیٹھا ہوا اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کھول ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم محمود کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آج سے تین سال قبل جب ہم شہر میں رہتے تھے“

تھے محمود نے سلیمہ کو محبت کا فریب دیا تھا۔ وہ اس سے کھیلتا رہا اور جب جی بھر گیا تو اسے بھر چلا گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ اس نے اپنے خاندان میں شادی کر لی ہے حالانکہ اس نے سلیمہ

شادی کا وعدہ کیا تھا۔ سلیمہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ میں نے اسے بے حد چاہتا ہوں۔ دنیا میں اس کے سوا میرا اور کوئی نہیں۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ بچہ ہو جائے لیکن میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر ایک سائیکو انالیسٹ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اُسے

ماحول انہیں حالات میں دوبارہ لے جانے کی کوشش کروں جن میں اس کا دماغ خراب ہو اور اس نے امید دلائی تھی کہ اس طرح اس کا ذہنی توازن ٹھیک ہو جائے گا پھر میں نے اسی مشورے کے تحت یہاں ہری پور میں سکونت اختیار کر لی۔ محمود اور میں ایک دوسرے کے لئے انجان رہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ بھی کر کے دیکھا لیکن کچھ نہ ہوا۔ سلیمہ بدستور پاگل رہی پھر میرا بازو

انتقام بھڑک اٹھا۔ قصبے میں میں بہت جلد مقبول ہو گیا تھا اور اب میری یہاں اتنی قدر و منزلت ہے کہ خود حویلی والوں کی بھی نہ ہوگی۔ بہر حال میں اپنے اس فعل پر قطعی تادم نہیں ہوں۔

عدالت میں چیخ چیخ کر اپنے جرموں کا اعتراف کروں گا اور اس کی قلعی کھولوں گا جسے ہری والے فرشتہ سمجھتے ہیں۔“

”نہیں اس کی نوبت نہیں آنے پائے گی۔“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”لیکن تم نے کئی گناہوں کے گھر بھی پھونکے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے۔ انتہائی جذبے نے مجھے سچ پاگل کر دیا تھا۔“
انور نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور ڈاکٹر حیرت آمیز نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔



”مجھے اس سے غرض نہیں۔“ انور لاپرواہی سے بولا۔ ”میں خود انتقام کا قائل ہوں اور اے

درست سمجھتا ہوں۔ میں تو اس پرندے کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا جو مجھے معلوم ہو گئی۔ لیکن ان

دھماکے کا کیا راز تھا۔“

”کیا تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ اس نے تمہیں بے عزت کیا تھا اپنے گھر سے نکال دیا؟“
 ”نہیں یہ بات نہیں۔ اسکی یہ حرکت ایسی نہیں تھی کہ میں اس کی جان کا گاہک بن جاؤں۔“
 ”اگر ڈاکٹر نے پھر وہی حرکتیں شروع کیں تو۔“

”نہیں اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔ البتہ محمود کے بارے میں اس نے صاف صاف کہا تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“
 ”مگر.....!“

”چپ رہو..... اب میں ہری پور کے متعلق ایک بات بھی نہیں سن سکتا۔ ختم کرو اس قصے کو۔“
 ”اچھا اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو.....!“ رشیدہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔“

”لیکن میں تم سے محبت کب کرتا ہوں۔ میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا۔“
 ”لیکن میں تو کرتی ہوں۔“ رشیدہ نے دانت پیس کر کہا اور اس کے دونوں کان پکڑا جھنجھوڑا لے۔

انور نے ایک چائنا رسید کر دیا۔ لیکن رشیدہ کا جوابی تھپڑ زور دار تھا۔ انور نے اس کے گھونگھریا لے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ رشیدہ چیختے لگی اور پھر انور کی تاک پر ایسا ہاتھ مارا کہ بلبلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔
 ”جنگلی!“ رشیدہ نے آہستہ سے کہا اور غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

ختم شد

(مکمل ناول)

خونی پتھر

جاسوسی دنیا نمبر 16

پیش لفظ

انور سیریز کا چوتھا ناول پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس سیریز کا چوتھا اور آخری معمولی شمارہ ہے۔ پانچواں ناول اس سیریز کا خاص نمبر ہوگا جس میں انور اور رشیدہ کے ساتھ انسپکٹر فریدی اور سر جنت حمید بھی ہوں گے۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ انور اور رشیدہ کے بارہ ناول پیش کروں گا لیکن اتفاق سے میرے پڑھنے والوں میں دو گروہ ہو گئے ایک کا مطالبہ ہے کہ ”فریدی اور حمید“ سیریز پھر سے شروع کیا جائے اور دوسرا انور سیریز کو بھی پسند کر رہا ہے۔ بہر حال تعداد انہی لوگوں کی زیادہ ہے جو ”جاسوسی دنیا“ میں صرف فریدی اور حمید کے کارنامے دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ شمارے (خاص نمبر) سے پھر فریدی اور حمید کے کارنامے شروع کر دوں۔

پیش نظر ناول ”خونی پتھر“ میں ایک حیرت انگیز داستان ہے جو ایک سیاہ رنگ کے بیش قیمت پتھر کی چوری سے شروع ہوتی ہے اور ایک بھیانک موڑ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ جواں سال

پرائیویٹ جاسوس انور اس ناول کے شروع میں ہی ایک بھیانک جال میں پھنس جاتا ہے۔ کیا وہ درحقیقت جال تھا؟ پروفیسر تیموری کو کس نے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک قتل اور کیا رابعہ قاتل تھی؟ پروفیسر تیموری کے سیکریٹری کو بھی آپ قاتل سمجھیں گے، گوریلا بھی آپ کو قاتل ہی معلوم ہوگی اور سر صغیر احمد تو سو فیصدی قاتل تھا۔ اس ناول کا ہر کردار آپ کو قاتل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً قاتل کون تھا؟ یہ معلوم کر کے آپ انگشت پیدناں رہ جائیں گے اور قتل کا مقصد؟ وہ بھی قاتل ہی کی طرح حیرت انگیز ثابت ہوگا، ”انور اور رشیدہ“ کی دلچسپ نوک جھونک۔ سرکاری جاسوس انسپکٹر آصف سے جھڑپیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہتری دلچسپیاں۔

ابن صغیر

”مسل خانہ اندر ہے۔“

”نَصْر مِّنَ اللَّهِ فَتَحَ قَرِيبَ“

”سورپے کے نوٹ کی ریز گاری نہیں ملے گی۔“

”طلب کی ہوئی اشیاء واپس نہیں لی جاتیں۔“

”اسلام زندہ باد۔“

”سیاسی گفتگو سے پرہیز کیجئے۔“

”قیامت ضرور آئے گی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“

”نیشنل سٹیونگ سرٹیفکیٹ خریدیے۔“

”پیٹ کے امراض کا واحد علاج چورن انار دانہ۔“

انور ان سب کو تیرہ چودہ بار دہرا چکا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ قبل وہ یہاں پہنچا تھا اور اب انتظار کی معینہ مدت میں صرف دس منٹ اور باقی رہ گئے تھے۔ وہ یہاں کچھ عجیب و غریب حالات کے تحت آیا تھا۔ آج آفس میں اُسے کسی گم نام عورت کا خط ملا تھا جس میں اس نے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ مذکورہ ہوٹل میں ایک بج کر پچیس منٹ تک اس کا انتظار کرے۔ اسے کسی بہت ہی اہم معاملے میں انور کی مدد درکار تھی۔ اس نے خط میں اس کیمن کا نمبر بھی لکھ دیا تھا جس میں ان دونوں کو ملنا تھا۔

انور کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُسے ایسے ہوٹل میں کسی نے مدعو کیا تھا۔ اُس سے عموماً وہی لوگ مدد لیا کرتے تھے جو کسی وجہ سے محکمہ پولیس سے رابطہ قائم کرنے میں ہچکچاتے تھے اور ایسے لوگ ابھی تک سو فیصدی دولت مند ہی ثابت ہوئے تھے ظاہر ہے کہ کسی پرائیویٹ جاسوس کے اخراجات کا بار عام آدمی نہیں اٹھا سکتا۔ لہذا انور کے لئے یہ چیز خاصی الجھن کا باعث بن گئی تھی کہ اگر وہ دولت مند ہے اور کسی اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے تو اُس نے ایسے ہوٹل کا انتخاب کیسے کیا۔

اس کی نظریں پھر دیوار سے لگے ہوئے کلاک کی طرف اٹھیں۔ پانچ منٹ اور باقی رہ گئے تھے۔ مین منٹ اُس نے کسی نہ کسی طرح گزار دیئے تھے۔ لیکن یہ پانچ منٹ اس کے خیال کے

پتھر کی واپسی

انور ایک گھنٹا سے ہوٹل میں بیٹھا سگریٹ کے پلکے پلکے کش لے رہا تھا۔ اسے یہ ہورہی تھی کہ آخر اُسے مدعو کرنے والی نے اس نامعقول ہوٹل کو کیوں منتخب کیا۔ اسے درجے کا ہوٹل بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے اس کے مالک نے کوشش تو یہی کی تھی کہ درمیانے یا اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں کی نقل بنادے اور شاید ایسا ہو بھی سکتا تھا مگر ملازمین یا منتظر پیدائشی لاپرواہی اور بدسلوکی نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہاں متعدد کیمن ضرور لیکن ان کے پردے یا تو بوسیدہ تھے یا گندے۔ تھری پلائی وڈ کے پارٹیشنوں پر جگہ جگہ ہند لکھ کر جوڑے گئے تھے کہیں کہیں پان کھانے والوں کی کتھے اور چونے بھری انگلیوں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر برسوں پرانی تصویریں تھیں۔ جن پر نہ جانے کب گرد کی تھیں جستی چلی آ رہی تھیں۔ ان تصویروں کے درمیان کچھ طفرے بھی تھے جہاں کتھ سے جگہ بچ گئی تھی وہاں گاہکوں کے لئے ضروری ہدایات لکھ کر چپکا دی گئی تھیں۔ کچھ تحریر یا غیر متعلق تھیں جنہیں انور بالترتیب پڑھ پڑھ کر الجھ رہا تھا۔

اُن کی ترتیب کچھ اس قسم کی تھی۔

”براہ مہربانی فرش پر مت تھوکنے۔“

”واپس ملی ہوئی رقوم کی اچھی طرح جانچ کر لیجئے۔“

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”ملازمین سے جھگڑا کرنے کے بجائے اپنی شکایات کا اظہار منبر سے کیجئے۔“

”شہنشاہ ایران زندہ باد۔“

مطابق وبال جان بننے والے تھے۔ اس دوران میں ہوٹل کے کئی گندے لڑکے اس کے آگے جلد نمبر 5 لئے کیمین کا چکر لگا چکے تھے حالانکہ انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ مگر شاید وہ سو گئی تھی۔ انور اندر لوٹ آیا۔ باہر والے کمرے میں اُس نے دوبارہ روشنی نہیں کی۔ بھی ان میں سے ایک نہ ایک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کیمین کے سامنے آکھڑا ہوا اور اندر کے کمرے میں جا کر اُس نے کپڑے پہنے اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا پھر باہر آ گیا۔

شاید اس رویے کی محرک معقول قسم کی ٹپ کی توقع تھی۔ آخر وہ پانچ منٹ بھی گزر گئے۔ انور کراٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت کیمین کے سامنے آ کر رکی۔ اس نے معمولی سی سفید ساڑی باندھ رکھی تھی۔ پیر میں سیاہ پیٹنٹ کے پرانے سینڈل تھے جن کا اس نے بھی تارک تھی۔ بادلوں کی وجہ سے ستاروں کی دھندلی روشنی بھی غائب ہو گئی تھی۔ سڑک کے کہنگی کی وجہ سے جگہ جگہ سے چٹخا ہوا تھا۔ عمر بمشکل انیس بیس کی رہی ہوگی۔ جسم صحت مند شخصیت جاذب توجہ تھی۔ حسین بھی تھی لیکن اتنی نہیں کہ اس پر شعر کہے جاسکیں۔ آنکھوں پر ہچکچاہٹ یا شرمیلے پن کے بجائے ایک عجیب قسم کی بے تعلقی تھی۔ وہ ایک لمحہ تک انور کو تیریدل چلنے لگا۔

تیسرے منزل کے تاریک آثار دور سے نظر آرہے تھے۔ نہ جانے کیوں انور کو ایسا محسوس نظر رہا تھا جیسے وہ ایک بہت ہی بڑے اسرار عمارت میں داخل ہوتا جا رہا ہے اور وہاں ضرور کوئی حادثہ

میں آئے گا۔ اُسے پروفیسر تیوری کا چہرہ یاد آ گیا۔ چھوٹی چھوٹی دھندلی آنکھیں جن کی منہ لہاٹ اپنے پس منظر میں کوئی پر اسرار چیز چھپائے ہوئے تھی۔ انور اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس نے تار جام میں سیاہ پتھر کا تذکرہ چیئر کر غلطی کی تھی۔ اگر واقعی یہ پتھر پروفیسر تیوری کے ہاں سے چھایا گیا تھا تو سیاہ پتھر کے تذکرے پر اس کا مشکوک ہو جانا قطعی قدرتی امر ہے۔ پھر ”مجھے افسوس ہے کیا آپ دوپہر کا کھانا کھا چکے ہیں۔ میں آپ کو یہ لکھتا بھول گئی تھی۔“ ہم کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے۔

”کیا آپ اس ہوٹل میں۔“ انور چونک کر بولا۔

”جی ہاں..... کیوں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ مجھے چھپکلیوں اور چوہوں کا قورمہ قطعی مرغوب نہیں۔“ وہ بے اطمینان لہجے میں اور ارضیات کے طلباء میں غیر معروف نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یونیورسٹی میں ارضیات کا علم بھی وہ چکا تھا۔ شہر میں اس کے دو تین بنگلے تھے لیکن سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے اور وہ

”بھی آپ ٹھہرے بڑے آدمی۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”ہم غریب لوگ تو یہی سب ایک غیر آباد مقام پر اقامت گزریں تھا۔“

کھانے کے عادی ہیں۔“

انور اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر پڑیں۔ اُس نے چھانک کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل روش تھی

جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ روشنی عمارت کے صدر دروازے کے سامنے ختم ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا۔ انور بھی زندگی کے آثار مفقود معلوم ہو رہے تھے کسی کھڑکی یا روشندان سے بھی روشنی دی۔ انور ایک لمحہ کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر جیب سے کنجیاں نکال کر انہیں آزمائے لگا۔

دروازہ کھل گیا..... اندر اندھیرا تھا..... انور نے برقی لیمپ نکالا اور اس کی روشنی سے ناقابل انتشار روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ ایک وسیع ہال سے گزر رہا تھا۔ آگے چل کر ہاتھ پر ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا انور نے دوسری کئی لگائی۔ دروازہ کھل گیا انور اندر توڑ ہی والا تھا کہ کہیں کھڑکڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دیوار سے چپک گیا اور پھر اچانک قوت شامہ نے ایک خاص قسم کی خوشبو کا تجربہ کیا اس نے نتھے سکڑ کر ایک گہرا سانس معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس خوشبو کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کے تاراج کی روشنی پڑی۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اسی طرف وہ شوکیں رکھا ہوا ملا جس میں وہ پتھر رکھتا تھا۔ میں کئی خانے تھے جن میں مختلف قسم کے پتھروں کے ننھے ننھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ خانے کے نیچے پتھروں کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خانہ خالی تھا جس کے پتھر "راج" تحریر تھا۔ انور نے شوکیں کھول کر پتھر اس میں رکھ دیا اور واپس ہونے کے لیے تاراج کی روشنی کمرے کے فرش پر پڑتے ہی ایک بیک اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ پروفیسر تیموری زمین پر چپ پڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوفناک حد تک کھلی تھیں۔ چہرے پر آخری وقت کی تشنجی کیفیت نہ مٹنے والے نشانات چھوڑ گئی تھی۔ سر کے مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔ انور نے تاراج بجا دی اور کچھ سننے لگا۔ دور کہیں موٹر کی آواز دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے شوکیں کے قریب آیا اور جیب سے رومال نکال کر آنکھیں دھو کر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد پھر اس نے چاروں طرف تاراج کی روشنی ڈالی۔ سامنے ایک آئینہ آٹا جس کے پٹ کھلی ہوئے تھے۔ یہ شاید پروفیسر کے سونے کا کمرہ تھا۔ پلنگ کے سرے بڑے سے فریم میں کسی عورت کا فوٹو لگا ہوا تھا۔ خدو خال کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت

سہمی جاسکتی تھی۔ رنگت چاہے جیسی رہی ہو۔ اس تصویر کے علاوہ یہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے آرائشی سمجھا جاسکتا۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ انور نے مستی خیز انداز میں سر ہلایا اور تاراج کی روشنی میں کھڑکی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس کے ہونٹ باپوسانہ انداز میں سکڑ گئے۔ لیکن یہاں وہ قاتل کا پتہ لگانے تو نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے سب کچھ اُسے پھنسانے کے لئے کیا گیا ہو۔ انور واپس جانے کا ارادہ کرتی رہا تھا کہ مکان کے کسی حصے میں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔

”یہ تو بالکل اندھیرا ہے۔“ ایک آواز سنائی دی اور انور چونک پڑا۔ یہ ننگے سراغ رسانی کے انپکڑ آصف کی آواز تھی۔ انور نے کھڑکی پر دونوں ہاتھ ٹیک کر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ چار دیواری پھلانگتے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ اب اپنی پوری قوت سے اس طرف دوڑ رہا تھا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپائی تھی۔

جاسوس کی دھمکی

انور تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ رشیدہ نے اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ چھنج گئے تھے۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے؟“

”انپکڑ آصف.....!“ رشیدہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ.....!“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور پھر لیٹ گیا۔ ”اُس سے کہہ دو کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔“

”مگر میرے ننھے گڈے تم نے وہ حرکت کی ہے کہ تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔“

”کیا.....؟“

”پروفیسر تیموری کو کسی نے قتل کر دیا۔“

”میرے لئے یہ خبر بہت پرانی ہو چکی ہے۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور نکلنے کے نیچے

سگریٹ لگانے لگا۔ پھر رشیدہ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”رشو چائے یہیں منگوا لو، شاید ابھی آصف صاحب نے بھی ناشتہ نہیں کیا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ آصف نے منہ بنا کر کہا۔ ”میری صرف اتنی خواہش ہے کہ تم اس وقت مجھ سے سنجیدگی سے گفتگو کرو۔“

”وہ تو ہوتی ہی رہے گی۔ رشو تم جاؤ۔“ انور نے کہا اور پیر پر پیر رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”تار جام میں تمہارا کیا کام تھا۔“

”تم کسی اخبار کے رپورٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتے۔“

”اس گفتگو کی حیثیت سرکاری نہیں بلکہ دوستانہ ہے۔“ آصف نے نرم لہجے میں کہا۔

”کچھ بھی ہو..... میں اپنے اصل پر سختی سے عمل کرتا ہوں۔“

”اور اگر میں بھی اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دوں تو۔“

”تب تم ایک اچھے لڑکے کہلاؤ گے۔“ انور نے کہا اور درویشانہ شان بے نیازی سے

آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

”انور میں سچ کہتا ہوں کہ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

انور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتار کر دل کا حال جاننے کے لئے کوشش کر رہا ہو۔

”پروفیسر کب اور کن حالات میں قتل ہوا۔ کیا اس کی لاش تار جام میں کہیں پائی گئی۔“ انور

نے پوچھا۔

”کیوں تم نے یہ کیوں پوچھا؟ بھلا پروفیسر تیوری کا تار جام سے کیا تعلق.....؟“ آصف

نے پوچھا۔

”وہ کل مجھے تار جام میں ملا تھا۔“ انور نے کہا۔

”کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے۔“

”نہیں کل ہی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کی تھی۔“

”اور اپنا نام غلط بتایا تھا۔“ آصف بے ساختہ بولا۔ لیکن اُس نے جس مقصد کے تحت ایسا

ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا۔

”لیکن کچھ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی خبر ہے۔“

”کیا.....؟“

”یہ اسی سے پوچھنا.....! اُس نے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں بتایا۔“

”ہوں.....!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”اُسے یہیں بلا لو۔“

رشیدہ چلی گئی اور انور نے سگریٹ سلگا کر سلپنگ گاؤن پہن لیا۔ انکسپٹر آصف کے روم

داخل ہوا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ انور نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کل شام کو تم کہاں تھے۔“ آصف نے پوچھا۔

”جنم میں.....!“ انور جھلا کر بولا۔ ”تم جب بھی ملتے ہو اسی قسم کے بے سرو پا سوالات

کرنے لگتے ہو۔“

”ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں بے سرو پا سوالات نہیں کر رہا ہوں۔“

”بک چلو.....!“ انور آہستہ آہستہ ناک سے سگریٹ کا دھواں نکالتا ہوا بولا۔

”مجھے اس وقت افسوس معلوم ہو رہا ہے کہ تم میرے گہرے دوست ہو۔“ آصف چہرے

مغموم بنا کر بولا۔

”بہتر یہی ہوگا کہ تم مرثیہ خوانی شروع کر دو اور میں ماتم کروں۔ لیکن ہاتھ میرے اور

تمہارا۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ آصف سنجیدگی سے بولا۔ ”پروفیسر تیوری قتل کر دیا گیا۔“

”بڑا افسوس ہوا۔ کیا تمہارا کوئی رشتے دار تھا۔“ انور نے معصومیت سے پوچھا۔

”کل شام کو تم کہاں تھے۔“ آصف نے پھر پوچھا۔

”تار جام میں۔“

آصف اچھل پڑا اور رشیدہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”کیا کرنے گئے تھے۔“

”اونٹ خریدنے.....!“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے

”دیکھو فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔“
 ”خیر اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو اسی وقت تار جام روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں راستے ہی میں

”پولس اینڈ کو“ کا سائن بورڈ نظر آ جائے گا۔“

”خیر ہوگا بھئی! مجھے اس سے کیا۔“ آصف اکتا کر بولا۔

”صرف اتنا بتا دوں کہ وہاں اس شوروم کا وجود حیرت انگیز ہے یا نہیں۔“

”اگر ہے تو یقیناً حیرت انگیز ہے۔۔۔۔۔!“

”تار جام سے واپسی پر میں وہاں گیا تھا۔ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔“

”یقیناً۔۔۔۔۔!“

”ٹھیک۔۔۔۔۔ تو جس وقت میں اندر پہنچا پروفیسر تیموری دوسرے کمرے میں کسی آدمی سے

مکڑا کر رہا تھا۔“

”دوسرا آدمی کون؟“

”میرا خیال ہے وہی عکس تھا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ آگے کہو۔“

”ظاہر ہے کہ وہاں پہنچنے پر مجھے بھی قیمتی پتھروں سے دلچسپی لینی پڑی اور اپنا نام بھی غلط

تانا بڑا۔ اس کی بعد پروفیسر تیموری نے اپنا نام بتایا اس سے قبل میں اسے اچھا خاصا ڈاکو اور خونی

بکھڑا تھا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”کیا وہ صورت سے خوفناک نہیں معلوم ہوتا۔۔۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔!“

”پھر یہ کہ میں وہاں سے واپس آ گیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ اس شوروم کو بے نقاب کئے

فیصلہ مانوں گا۔ وہاں یقیناً کوئی خوفناک حرکت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اور اس وقت تم پروفیسر تیموری

کے قتل کی خبر سنا رہے ہو۔ تو گویا میرا اندازہ قطعی درست نکلا۔“

آصف کی سوچ میں پڑ گیا۔

کیا تھا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ سمجھا تھا کہ انور اس کی معلومات پر اچھل پڑے گا۔ خیر
 آئے گا مگر ایسا نہ ہوا۔

انور ادھ کھلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اور کچھ۔۔۔۔۔!“ وہ مسکرا کر بولا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اسے غلط نام کیوں بتایا تھا۔“

”تمہارے اس سوال کا جواب بعد میں دو ٹوک پہلے تم یہ بتاؤ کہ اس کی لاش کہاں پائی گئی۔“

”اُس کے گھر میں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ انور کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ آصف جواب طلب

نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم تار جام سے یہاں کس وقت آئے تھے۔“

”سات بجے۔“

”اس کے بعد کیا کرتے رہے۔“

”رشیدہ سے لڑتا رہا۔۔۔۔۔ پھر تقریباً دس بجے سو گیا۔“

”اور اتنی دیر تک سوتے رہے۔“

”میں سات بجے سے پہلے کبھی بستر نہیں چھوڑتا۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس قسم

سوالات سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تم خود کب سے تار جام نہیں گئے۔“

”چھ ماہ قبل گیا تھا۔“

”وہاں تم نے شہر سے تین میل ادھر ہی کوئی شوروم دیکھا تھا۔۔۔۔۔؟“

”میں قطعی سنجیدہ ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”جواہرات اور دوسرے غیر معمولی پتھروں کا شوروم۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟ تم نے کہا تھا کہ تار جام سے تین میل ادھر ہی۔ گویا کہ ویرانے میں۔“

”جواہرات کا شوروم۔۔۔۔۔ ہونہ۔“

”کیوں؟ ویرانے میں تمہیں جواہرات کا شوروم مضحکہ خیز کیوں لگ رہا ہے۔“ انور

کہا۔

”ہاں یہ تو بتاؤ تمہیں اس کا علم کیسے ہوا کہ کل میں تار جام گیا تھا۔“

”مجھے پروفیسر تیموری نے تار جام سے فون کیا تھا کہ انور یہاں مجھ سے پراسرار ملا ہے۔ میں رات کو گھر نہیں واپس جاؤں گا لہذا تم میرے مکان کی حفاظت کا کوئی انتظام کرو۔“

”تو گویا آپ مجھے چور اور ڈاکو بھی سمجھنے لگے ہیں۔“ انور نے کہا۔

”شاید وہ تمہیں پہچانتا تھا..... اور تمہارے غلط نام بتانے پر مشکوک ہو گیا۔ اس نے بھی تو کافی جواہرات موجود ہیں۔“

”لیکن یہ بھی عجیب چیز ہے۔“ انور نے کہا۔ ”تار جام والا شوروم بھی دیرانہ اور پروفیسر تیموری بھی شاید دیرانے ہی میں رہتا ہے۔“

”میں کل شام ہی سے ایک ضروری کام میں مشغول تھا۔“ آصف اس کی بات کر کے بولا۔ ”اس لئے میں نے پروفیسر کی بات پر دھیان نہ دیا اور ویسے بھی مجھے یقین کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جس سے قانوناً گرفت میں آجانے کا امکان ہو۔ بہر حال رات گئے تک مشغول رہا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے سونا گھاٹ کا ایک چکر لگایا اگر پروفیسر واپس آ گیا ہو گا تو برامانے گا۔ میری اس کی خاصی دوستی تھی۔“ آصف خاموشی سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔ انور خاصی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں دو تین آدمی ساتھ لے کر سونا گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔“ آصف نے کہا۔ ”تیمور منزل کا چھانک کھلا ہوا تھا اور عمارت بالکل تاریک تھی۔ مجھے کچھ شبہ ہوا اور چلے گئے۔ صدر دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پھر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں پروفیسر کی ہوئی تھی۔ کسی نے پتھر توڑنے والے ہتھوڑے سے اس پر حملہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہتھوڑے کی متعدد ضربات سے واقع ہوئی۔ سر کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔“

”کیا وہ گھر میں تہا رہتا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں اس کے ساتھ اس کا سیکریٹری حامد بھی رہتا تھا۔ لیکن وہ کل رات کو گھر پر نہیں کیوں.....؟“

”اس کا بیان ہے کہ وہ پروفیسر سے چھٹی لے کر گیا تھا۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ پروفیسر خاصا اسحق تھا۔“ انور نے کہا۔ ”پہلے اس نے سیکریٹری کو چھٹی دی اور پھر خود مکان اکیلا چھوڑ کر تار جام چلا گیا۔ تاکہ معمولی سا چور خفیہ سی جدوجہد کے بعد اس کے سارے جواہرات مار لے جائے۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم سے فون پر بات کرنے والا پروفیسر تیموری تھا۔“

”میں جلدی میں تھا اس لئے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکا اور پھر اس وقت اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔“

”سیکریٹری واپس کب آیا.....؟“

”آج چار بجے صبح۔“

”تم نے اسے حراست میں نہیں لیا۔“

”میں اس پر غور کر رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔ ”لیکن تم مجھے خواہ مخواہ ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا کر پہلو بچانا چاہتے ہو۔“

”کیا مطلب.....!“ انور اسے گھور کر بولا۔

”تم اس حادثے کے متعلق کچھ جانتے ہو۔“

”جو کچھ جانتا تھا میں نے بتا دیا۔“

”تم آخر یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تم تار جام کیوں گئے تھے۔“

”میں.....!“ انور متحیر ہو کر بولا۔ ”شاید تم گھاس کھا گئے ہو۔ بھلا میں تار جام کیوں جانے لگا۔“

”ابھی خود تم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔“

”مجھے یاد نہیں۔“

”خیر! لیکن یہ مت بھولو کہ پروفیسر نے کل مجھے تار جام سے تمہارے متعلق فون کیا تھا۔ تم اسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”تم نے خواب دیکھا ہو گا۔ خیر عدالت تمہارے اس خواب کو دلچسپی سے سنے گی۔ فی الحال مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہارے جھکے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب اس بات کی شہادت دیں

گے کہ کل میں دو بجے سے دس بجے تک ان کے ساتھ رہا۔
”کیا مطلب.....!“ آصف چونک کر بولا۔

”مطلب یہ میری جان کہ وہ میری بیوی کا سالا ہے۔“ انور آنکھ مار کر کہنے لگا۔

”فی الحال تمہاری کوئی دھتھی رگ میرے ہاتھ میں نہیں ہے اسلئے اسے استعمال کروں گا۔“
”خیر اچھا ہوا کہ تم نے پہلے ہی بتا دیا..... اس کا بھی انتظام کر لیا جائے گا۔“ آصف انور

ہوا بولا۔

”اررر..... بیٹھو نا بھئی۔ رشیدہ چائے لارہی ہوگی۔“

”میں چائے نہیں پیوں گا۔“ آصف ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”تمہاری مرضی۔“ انور نے اپنے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

اتنے میں رشیدہ چائے لے کر آگئی۔

”آصف صاحب چائے نہیں پیئیں گے۔“ انور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کیوں.....؟“

”مجھ سے کہہ رہے تھے مرنے کی بولی بولو۔ میں نے معذوری ظاہر کی اس پر بگڑ گئے۔“

”دیکھو انور میں بتائے دیتا ہوں۔“ آصف غصے میں اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

”ابھی نہیں پھر کسی وقت بتا دینا۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف

چلا گیا۔

”یہ کسی دن بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“ آصف نے رشیدہ سے کہا۔

”میری بلا سے۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ ”مگر میں تو یہ دیکھتی آرہی ہوں کہ یہ ہمیشہ دوسروں

ہی کو مصیبت میں پھنسا دیتا ہے۔“

”کب تک..... خیر کی ماں کب تک بکرے کی..... کہنے کا مطلب یہ کہ بکرے کی ماں

کب تک خیر منائے گی۔“

”بہر حال میں آپ کے لئے بھی چائے لائی ہوں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔

”تم اسے سمجھاؤ۔“ آصف نے بیٹھتے ہوئے۔

”یہ میرے بس کا روگ نہیں..... لیکن معاملہ کیا ہے۔“

”وہ پروفیسر تیوری کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات جانتا ہے۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کب

اونٹ پٹانگ باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔“

اتنے میں انور بھی واپس آ گیا۔ اُس نے آصف کی گفتگو سن لی تھی لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

تینوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

”تھوڑے پر کسی قسم کے نشانات بھی ملے یا نہیں۔“

”نہیں.....!“

”ہاں میں نے رومال سے اس کا دستہ صاف کر دیا تھا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

آصف نے چڑھ کر اُسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور رشیدہ بھی اُسے گھورنے لگی۔

”دیکھو میاں آصف میں اپنا الو سیدھا کرنے کے بعد الٹا الو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

مجھے اپنا بہت سا قرض ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بینک بیلنس بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ وغیرہ

ذیرہ..... اگر تم میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنا کام دیکھو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

ایک مرد ایک عورت

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ میں تاش کے دو پتے ہیں۔ پہلا نکولس اور

دوسرا ایک میٹری۔ میری ساتھ مغز مارنے سے بہتر تو یہی ہے کہ تم انہیں کریدنے کی کوشش کرو۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ آصف ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”ایک چیز اور.....!“ انور نے آہستہ سے کہا۔ ”پروفیسر نے تم سے کہا تھا کہ وہ تار جام ہی

ملاقات گزارے گا..... پھر واپس کیوں آ گیا۔“

کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جسے وہ اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا سکے۔ ویسے وہ انور سے ڈرتا بہت تھا۔ اس خوف کی وجہ انور کی غیر معمولی ذہانت اور فطری بے مروتی تھی۔

رشیدہ کی واپسی پر وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور رشیدہ اس کیلئے چائے اٹھیلنے لگی۔

”کیوں قدیر.....؟ کوئی نئی چیز.....!“ انور نے اُس سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ انکسٹر صاحب تمہیں کوئی نئی خبر ہی سنانے آئے ہیں۔“ قدیر مسکرا کر بولا۔

”اچھا بھی اب میں چلوں۔“ آصف اٹھتا ہوا بولا۔ ”آج شاید دن بھر میں سونا گھاٹ پر

”میں جانتا ہوں کہ آصف تم سے مدد لینے آیا تھا۔“ قدیر بولا۔

”کوشش کروں گا۔“ انور نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ آصف تم سے مدد لینے آیا تھا۔“ قدیر بولا۔

”مجھے تمہارے اس جاننے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا اور خیالات

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پروفیسر تیوری کا سیکریٹری کل رات کو کہاں تھا۔“

”کہاں.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”ابھی یہ نہیں بتا سکتا اگر ان لوگوں سے سودا ملے نہ ہو تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

”کن لوگوں سے۔“

”ابھی کس طرح بتا سکتا ہوں۔“

”خیر ہوگا..... میں تمہاری تجارت میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں

”کوئی بات نہیں اتم جاسکتے ہو..... میں رشیدہ صاحبہ سے غپ لڑاؤں گا۔“ قدیر نے کہا۔

”میں معافی چاہتی ہوں..... مجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔“

”خیر خیر..... نہ جانے کیوں مجھے آپ لوگوں سے اتنی محبت ہو گئی ہے۔“

”شکریہ شکر یہ.....!“ انور منہ سکوڑ کر بولا۔

قدیر اٹھ کر چلا گیا۔

”ممکن ہے بعد کو اُسے خیال آیا ہو مگر سیکریٹری بھی موجود نہیں اس لئے مگر اکیلا نہ

چاہئے۔“ آصف نے کہا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اُس نے تار جام جانے سے پہلے ہی سیکریٹری کو چھٹی دے دی

”ممکن ہے۔“

”اس لئے مجھے پھر کہنا پڑے گا کہ پروفیسر یا تو فرشتہ تھا یا بہت بڑا احمق کیونکہ تیوری

محل وقوع ایسا ہے کہ وہاں دن دہاڑے چوری ہو سکتی ہے۔“

ابھی سلسلہ گفتگو یہیں تھا کہ ایک پستہ قدر مگر مضبوط جسم کا آدمی کمرے میں داخل ہوا

نے سفید سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیض کا سخت کالر دودھ کی طرح سفید اور بے داغ تھا۔

رنگ کی سپاٹ ٹائی سینے پر لہرا رہی تھی۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا سبک سا چشمہ تھا۔

”تو میں بالکل ٹھیک وقت پر آیا۔“ وہ مسکرا کر ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر

طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”عالباً چائے دانی خالی نہ ہوگی۔“

انسپد آصف نے اُسے گھور کر دیکھا۔ عالباً اُسے اس کی بے تکلفی ناگوار گزری تھی۔

”میں آپ لوگوں کی مشغولیت میں مغل تو نہیں ہوا۔“ وہ آصف اور انور کی طرف دیکھ کر

”قطع نہیں۔“ انور نے زہریلی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔ ”آپ سے کیا پردہ مغل

کے شاہی محلات میں خولجہ سراؤں کو پوری پوری آزادی تھی۔“

آنے والا رشیدہ کی طرف دیکھ کر بے ڈھنگے پن کے ساتھ ہنسنے لگا۔ رشیدہ اٹھ کر

کمرے میں چائے کی پیالی لینے چلی گئی۔ آصف ابھی تک اُسے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا

ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔ آصف اُس سے سچ مچ متغیر تھا اور اس کی

کے پیشے کی گندگی تھی۔ وہ روزنامہ ”پوسٹ مارٹم“ کا ایڈیٹر تھا۔ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ

میلنگ تھی وہ اپنے اخبار کے ذریعے اونچے طبقے کے لوگوں کے پرائیویٹ معاملات

سامنے لا کر یا لانے کی دھمکی دے کر خاصی رقمیں پیدا کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا طریقہ کار

تھا کہ وہ براہ راست قانون کی زد میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ

آدمی کے پیچھے پڑ جاتا اور انور سے بھی وہ اسی مقصد کے تحت ملتا رہتا تھا کہ شاید اُس

”تم سچ بول رہے ہو۔“

”کیوں.....!“ رشیدہ تنک کر بولی۔

”تمہیں اُسے روک کر اُس سے سب کچھ اگلا لینا چاہئے تھا۔“

”میں نہیں پڑتی اس چکر میں۔“

”خیر ہوگا.....!“ انور نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔

نمبر کی کارے مالک کا پتہ لگانا ہے۔“

”پھر تم نے وہی شروع کیا۔“

”جان من! انور بُری طرح پھنس گیا ہے۔ کل رات کو اگر مجھ سے ذرا سی بھی

ہو جاتی تو آصف مجھے لاش کے سر ہانے ہی پکڑ لیتا۔“ انور نے کہا اور پچھلی رات کی

دہراتا ہوا بولا۔ ”اب میرا بھی وہی خیال ہے جو تمہارا تھا کہ مجھے کوئی پھنسانا چاہتا ہے۔“

”ابھی کیا ہے۔“ رشیدہ بزرگانہ انداز میں بولی۔ ”ابھی اور دھکے کھاؤ گے خیر اب

کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ لاؤ کاغذ مجھے دو۔“

تھوڑی دیر کے بعد دونوں آفس چلے گئے۔ رشیدہ کو چھٹی دلا کر انور اپنے

کاموں میں مشغول ہو گیا۔ کلاک نے گیارہ بجائے اس نے کاغذات ایک طرف رکھ

کچھ سوچنے لگا۔ آج ایک بجے کے بعد اُسے کل والی پراسرار لڑکی سے ملنا تھا لیکن اسے

یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نظر نہ آئے گی۔ آخر وہ کون تھی؟ کیا اس پتھر ہی سے

موت کا تعلق تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ درمیان میں کیوں ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے

کے کسی پراسرار تعلق کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ لیکن یہ چیز بالکل ہی مہمل تھی۔

اُسے اس پتھر کا خیال آ گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا اور نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو..... اوہ معاف کیجئے گا۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ انور نے ریسیور رکھ دیا اور

ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسے پروفیسر تیموری کے فون نمبر کی

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو..... کیا آپ پروفیسر تیموری کے گھر سے بول رہے ہیں۔ اچھا اچھا۔“

آصف صاحب کو فون پر بلا دیجئے۔“ وہ خاموش ہو کر بانیں ہاتھ سے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو

اٹھنے پٹنے لگا۔ ”ہیلو آصف! میں بول رہا ہوں..... کوئی نئی بات.....؟ آخر اس قتل کا مقصد کیا

ہو سکتا ہے..... کوئی چیز غائب بھی نہیں ہوئی..... یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ جوہرات بھی بدستور ہیں؟

بیکریڑی سے تو پوچھو..... اچھا یہی اُسی کا بیان ہے..... خیر میں تم سے کسی وقت وہیں ملوں گا۔“

انور ریسیور رکھ کر پھر اپنے دفتری کاغذات میں ڈوب گیا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے رشیدہ

واپس آئی۔

”خبر.....؟“ انور اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولا۔

”خبر تو ہے مگر بتاؤں گی نہیں۔“ رشیدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”رشو.....!“ انور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”ہرگز نہیں..... ایک شرط ہے۔“

”کیا.....!“

”دونوں کان پکڑ کر مرغے کی بولی بولو۔“

”قریب آؤ..... زور سے نہیں بولوں گا.....“ انور نے رشیدہ کے کان مضبوطی سے پکڑ لئے

اور آہستہ سے بولا۔ ”ککڑوں کوں“ اور پھر جھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ رشیدہ کھڑی بسورتی

رہی اور وہ لکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اب اس سے کچھ نہ پوچھے گا..... لیکن جیسے ہی وہ

جانے کے لئے مڑی انور آہستہ سے بولا۔

”ادھر آؤ.....!“

رشیدہ پلٹ کر اُسے گھورنے لگی۔

”اچھا آؤ اب تم میرے کان پکڑ لو..... آ جاؤ..... شاباش۔“

”نہیں آؤں گی..... نہیں آؤں گی۔“ رشیدہ جھلا کر بولی۔

”تو مجھے ہی آنا پڑے گا۔“

انور اٹھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ رشیدہ تھوڑی دیر تک اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔

”میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”بولو بھی رشو.....!“ انور بچکانے انداز میں بولا۔ ”میں بالکل یہ نہیں سمجھا تھا کہ تم بچکانے سے میرے کان پکڑنا چاہتی ہو۔“

”یکومت.....!“

”اچھا لو چپ ہو گیا۔“

”وہ پروفیسر تیوری کی کار کا نمبر تھا۔“ رشیدہ نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ پروفیسر کے پاس دو کاریں تھیں ایک وہ خود اپنے استعمال

میں رکھتا تھا اور دوسری سیکرٹری کے پاس رہتی تھی۔ یہ سیکرٹری ہی والی کار کا نمبر ہے۔“

”میرے خدا.....!“ انور آہستہ سے بولا۔ ”تو کیا..... وہ پتھر سیکرٹری ہی نے چرایا تھا؟“

نہیں یہ ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے دوبارہ واپس کرنے کیلئے دوسرے سے مدد کیوں لیتا۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی۔ انور پھر بولا۔

”رشو اس لڑکی کا پتہ لگانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”ہوگا.....!“ رشیدہ بے تعلقی ظاہر کرتی ہوئی بولی۔

انور نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا۔

”رشو.....! تم پھر کسی وقت میرے کان پکڑ لینا۔ فی الحال میرے ساتھ چلو۔“ انور نے

دروازے کی طرف گھسٹتا ہوا بولا۔

”کہاں.....؟“

”جہاں میں چلوں۔“

اور پھر انور کی موٹر سائیکل سڑک پر فرارے بھرنے لگی۔ رشیدہ کیریر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم مدینہ ہوٹل کے سامنے ہی ٹھہری رہنا۔ غالباً میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔ تمہیں اس

کا تعاقب کر کے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے۔“

”ہوں..... اور اس کی اجرت.....!“

”اجرت.....!“ انور چونک کر بولا۔ ”ایک بہت ہی لذیذ قسم کا چائنا۔“

رشیدہ نے اس کی پیٹھ پر گھونسا جڑ دیا اور دو ایک راہ گیر انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

ہوٹل کے کچھ فاصلے پر انور نے موٹر سائیکل روک لی اور رشیدہ اتر کر دوسرے کنارے کے

ن پاتھ پر چلی گئی۔

انور ناک بھوں سکڑتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ معینہ کہین میں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا

تھا۔ انور دروازے پر ٹھٹک گیا۔

”کیا آپ مسٹر انور ہیں۔“ آدمی آہستہ سے بولا۔

انور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چلے آئیے.....!“ وہ بولا۔

یہ ایک دبلا پتلا اور دراز قد آدمی تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں۔

عیاری ٹپٹی تھی۔ چہرے کا پھیکا پھیکا تانے جیسا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ شراب پینے کا

عادی ہے۔ انور اس کے سامنے بیٹھ کر اسے گھورنے لگا۔

”وہ کتھیاں دے دیجئے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”کتھیاں.....!“ انور نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”کیسی کتھیاں..... میرا خیال ہے

رہیں اس سے قبل کبھی آپ سے نہیں ملا۔“

”وہی کتھیاں جو کل ایک لڑکی نے آپ کو دی تھیں۔“

”لڑکی..... آپ شاید نشے میں ہیں۔“

”میں قطعی ہوش میں ہوں اور کتھیاں واپس لے کر جاؤں گا۔“ اس نے انور کو گھورتے

وئے کہا۔ ”آپ اپنی اجرت بتائیے۔“

”کیسی اجرت..... دیکھئے جناب میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونے کا عادی نہیں۔“

”سیدھے ہو جاؤ میاں لڑکے سیدھے۔“ وہ تن کر بولا۔ ”میں بہت بُرا آدمی ہوں۔“

”وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہے۔“

”انور.....!“

”بڑے تیز.....!“ انور تیز لہجے میں بولا۔ ”انور صاحب کہو۔“

”اچھا انور صاحب کتھیاں واپس کر دیجئے۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔
 ”ناممکن! ہرگز نہیں۔“ انور اٹھ کر کیمین سے نکل آیا۔
 ”تھیں بچھتا پڑے گا۔“ وہ بولا۔

”اس پر پھر کبھی غور کروں گا۔“ انور نے کہا اور چل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب رستوران کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا اشارہ پا کر رشیدہ بھی اس کے پیچھے ہولی تھی۔ رستوران میں پہنچ کر وہ اس کی طرف مڑا۔

”رشو..... وہ نہیں آئی۔ اس کے بجائے ایک مرد آیا ہے۔ تم اس کا پیچھا کرو۔“ اسی ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ کیمین نمبر پانچ میں..... جاؤ جلدی کرو۔“
 ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ رشیدہ بولی۔
 ”جاؤ میں تمہاری طرف سے بھی کھالوں گا..... مطمئن رہو۔“

رشیدہ منہ بتاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ انور دروازے کے قریب ہی کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ کا آرڈر دے کر اس نے سگریٹ سلگایا اور سامنے رکھے ہوئے گلدان پر نظریں جمادیں۔ اس کی یہ محبت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بائیں گل قریب سے ایک پیلے رنگ کی لہر گزر گئی ہو اور ساتھ ایک خاص قسم کی خوشبو..... ایک عورت کی۔
 رنگ کی ساری میں ملبوس کاؤنٹر کی طرف جارہی تھی۔ لیکن وہ خوشبو! وہ خوشبو انور کا ذہن چھو اور جیسے ہی وہ عورت کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ ٹیک کر پیچھے کی طرف مڑی انور کے سامنے ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ گئیں۔ یہ تو وہی تھی بالکل وہی جس کی تصویر اس نے پچھلی رات پروفسر کی خواب گاہ میں دیکھی تھی اور وہ خوشبو۔ کیا اسی خوشبو نے پچھلی رات کو اس کا پراگندہ نہیں کر دیا تھا۔ پروفسر کے مکان کا سناٹا اور اندھیرا اُسکے ذہن میں آہستہ آہستہ رچ رہا تھا۔ وہ کچھ پریشانی سی نظر آ رہی تھی۔ بارمین نے اس کی طرف..... جھانکنا بڑھا دیا جس نے پیلے رنگ کی شراب کا ایک پگ اٹھایا تھا۔ عورت نے سوڈے کی بوتل گلاس میں خالی اور پھر اس بُری طرح گلاس پر نوٹ پڑی جیسے وہ بہت پیاسی ہو۔ گلاس ختم کرنے کے بعد خالی میز کی قریب بیٹھ گئی۔ بارنڈر دوسرا گلاس اور سوڈے کی بوتل اس کی میز پر رکھ کر

اب وہ شراب کو بے تحاشہ حلق میں اٹھیل لینے کی بجائے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور نیم وا آنکھوں سے گلاس کی طرف دیکھنے لگی۔
 اسے میں بیدار انور کی کافی لے کر آ گیا۔ انور نے عورت کی میز کی طرف اشارہ کیا۔ بیرے نے کافی کی ٹرے اس میز پر رکھ دی۔ عورت بیرے کو گھورنے لگی۔
 ”میں نے کافی تو نہیں منگوائی۔“ وہ حیرت سے بولی۔ قبل اس کے بیرا کچھ کہتا انور اس سے قریب پہنچ گیا۔

”میں اس وقت کافی ہی پیتا ہوں۔“ انور نے آہستہ سے کہا اور کرسی تھکیٹ کر بیٹھ گیا۔
 ”مگر آپ.....!“ عورت کے لہجے میں احتجاج تھا۔
 ”ہاں..... آں.....!“ انور نے بیرے کو جانے کا اشارہ کر کے کہا۔ ”میں آپ کے لئے ابھی ضرور ہوں مگر آپ میرے لئے نہیں۔“
 ”میں نہیں سمجھی۔“

”بات یہ ہے کہ پروفسر تیموری.....!“
 ”جی.....!“ شراب کے گلاس کو اس نے اتنی مضبوطی سے پکڑ لیا کہ اس کے ہاتھ کی رگیں ابھریں۔
 ”مطلب یہ کہ آپ پروفسر تیموری کی دوست تھیں۔“
 ”جی ہاں..... جی ہاں.....!“ وہ جلدی سے بولی۔
 ”اُسے کسی نے قتل کر دیا۔“
 ”اوہ..... جی ہاں..... میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔“
 ”اس سے آپ کب ملی تھیں۔“
 ”لیکن آپ کون ہیں؟“

”پروفسر تیموری کا ایک ہمدرد.....!“ انور نے کہا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ آخری بار اُس سے کب ملی تھیں۔“

”مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے دس روز قبل..... ہو سکتا ہے پندرہ روز قبل۔“

”اور کل رات کو.....!“

عورت دفعتاً چونک پڑی۔ وہ انور کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”بولے بولے.....!“ انور سر ہلا کر بولا۔ ”میرے پاس اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ آپ کل رات کو تیسرے منزل میں تھیں۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔“ وہ اس طرح بولی جیسے خواب میں بول رہی ہو۔

”یہ سو فیصدی سچ ہے۔“

عورت اُسے تھوڑی دیر تک خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً سنبھل کر بولی۔

”اگر آپ دوسری بار یہ جملہ دہرائیں گے تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔“

”ضرور کیجئے..... اس طرح پولیس کو آسانی ہو جائے گی کیونکہ وہ خود آپکی تلاش میں ہے۔“

سیکریٹری

عورت پھر خوفزدہ نظر آنے لگی۔

”لیکن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ“

کل رات کو تیسرے منزل میں تھیں یا نہیں۔“

”قطعاً نہیں..... ہرگز نہیں۔“

”خیر آپ کی مرضی.....!“ انور لاپرواہی سے بولا۔ ”لیکن اپنا نام بتانے میں تو آپ“

اعتراف نہ ہوگا۔“

”گلو یا تموتھی.....!“

انور نوٹ بک نکال کر لکھنے لگا۔

”کہاں رہتی ہیں۔“

”رحمن لاج..... تیسری منزل..... روم نمبر پانچ۔“

”شکریہ۔“ انور نوٹ بک جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

”لیکن..... لیکن؟“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیا.....!“

”کچھ نہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ انور لاپرواہی سے بولا اور کافی کی پیالی خالی کر کے کرسی کی پشت سے

ٹک گیا۔

وہ انور کو بغور دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

”میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میری ہی طرح پروفیسر کے درجنوں جان بچان

والے ہوں گے۔ پولیس ان سب کو تنگ کرے گی؟“

”جان بچان بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔“ انور نے کہا۔ ”ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگ

جان بچان والوں کی تصویریں اپنی خواب گاہوں میں لگاتے ہیں۔“

”جی.....!“ عورت چونک کر بولی۔

”جی ہاں.....!“ انور معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پولیس آپ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی

لے رہی ہے۔“

”لیکن آپ کون ہیں۔“

”کہہ تو دیا کہ پروفیسر کا ایک دوست..... میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں چاہتا ہوں

کہ آپ سب کچھ مجھے بتا دیں تاکہ میں آپ کو پولیس کی زیادتی سے بچا سکوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ عورت جلدی سے بولی۔ ”اور آپ مجھ پر سراسر اتہام لگا رہے ہیں

کہ میں کل رات کو پروفیسر تیموری کے مکان میں تھی۔“

”خیر..... خیر..... دیکھا جائے گا۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ

پولیس کو آپ تک نہ پہنچے دوں۔“

انور نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور ریستوران سے نکل گیا۔

رشتہ کا انتظار فضول تھا معلوم نہیں وہ کب تک واپس آئے۔ انور کچھ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی موٹر سائیکل سونا گھاٹ کی طرف جارہی تھی اور اس کا ذہن کئی گھنٹیاں

سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیور منزل میں پولیس ڈیرا ڈالے ہوئی تھی۔ انسپکٹر آصف بھی موجود تھا اور بہت زیادہ نظر آ رہا تھا۔ انور کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل گیا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”کوئی نئی بات۔“

”کچھ نہیں..... کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے نکولس کو حراست میں لے لیا ہے۔“

”کیوں؟“

”شبہ کی بناء پر..... واقعی اس کا شوروم انتہائی پر اسرار معلوم ہوتا ہے۔“

”لیکن صرف اسی کو حراست میں کیوں لیا ہے۔“

”میں تار جام گیا تھا۔“ آصف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”نکولس کی کل رات کی نقل وحرار

میں ڈالنے والی ہے۔“

”یعنی.....؟“

”وہاں سے پروفیسر تیموری کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ بھی چل پڑا۔“

”پھر.....؟“

”ظاہر ہے کہ اگر اُسے بھی شہر آنا تھا تو وہ پروفیسر تیموری ہی کے ساتھ کیوں نہ

تھوڑی دیر بعد چلنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ اُس نے عام راہ بجائے دشوار گزار راستے اختیار کئے جن کے ذریعہ وہ پروفیسر سے کچھ دیر قبل ہی شہر پہنچ گیا۔“

”لیکن تمہیں یہ اطلاعات ملیں کہاں سے۔“ انور نے کہا۔

”اس ٹیکسی ڈرائیور سے جو اُسے شہر لے گیا تھا۔“

”ہوں.....؟“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ اترا کہاں تھا۔“

”رحمن لاج کے قریب۔“

”رحمن لاج.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”ہاں..... لیکن تم چونکے کیوں؟“

”کچھ نہیں..... یونہی..... تو پھر نکولس نے کیا بتایا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ آسانی سے یہ نہیں بتائے گا کہ وہ تیموری کا قاتل ہے۔“

”بہن کمال کر دیا۔ محض اتنی سی بات پر تم نے اسے قاتل ہی تسلیم کر لیا۔“ انور ہنس کر بولا۔

”نہیں بس کی وجہ ایک اور بھی ہے جس تھوڑے سے پروفیسر قتل کیا گیا تھا وہ عام استعمال

کا تھوڑا نہیں۔ یا تو وہ پروفیسر ہی کا ہو سکتا ہے یا پھر اُسی کے کسی دوسرے ہم پیشہ کا۔“

”تمہاری مراد پتھر توڑنے والے تھوڑے سے ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”ہاں..... سیکریٹری نے بتایا کہ وہ پروفیسر کا نہیں تھا۔“

”تو کیا نکولس نے اُسے اپنا تھوڑا تسلیم کر لیا۔“

”بھلا وہ کیوں تسلیم کرنے لگا۔“

”تو اس سے تم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ نکولس ہی کا ہو سکتا ہے۔“ انور بولا۔

”یہ تو اب دیکھا جائے گا۔“

”پروفیسر کا قتل کہاں ہوا.....؟“ انور نے پوچھا۔

”پتھروں والے کمرے میں۔“ آصف نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دونوں اُس کمرے میں آئے جہاں پچھلی رات کو انور نے پروفیسر کی لاش دیکھی تھی۔

اس وقت اجالے میں چاروں طرف لگے ہوئے شیشے کے شوکیسوں میں طرح طرح کے خوش رنگ ہتھوڑے لگے ہوئے تھے۔ آصف انور کو وہ جگہ دکھانے لگا جہاں پروفیسر کی لاش ملی تھی۔

”تو تمہیں اچھی طرح اطمینان ہے کہ یہاں سے کوئی چیز جرائی نہیں گئی۔“ انور نے پوچھا۔

”میں یہاں کی چیزوں سے واقفیت تو رکھتا نہیں۔“ آصف مسکرا کر بولا۔ ”سیکریٹری کا

بیان یہی ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ فی الحال مجھے اسی کے بیان پر یقین کرنا پڑے گا۔“

”ہوں.....؟“ انور کچھ سوچ رہا تھا اور اس کی نظریں شوکیس پر جمی ہوئی تھیں جس میں اس

نے پچھلی رات کو سیاہ بکھراج رکھا تھا۔ لیکن اس وقت وہ غائب تھا۔ اسکی جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔

”سیاہ بکھراج.....؟“ انور نے شوکیس پر جھک کر بلند آواز میں کہا۔

”اول..... کیا مطلب.....؟“ آصف چونک کر بولا۔

”ہوں.....!“ انور نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ تھوڑی دیر تک وہ آصف کو بے خیالی میں گھورتا رہا پھر سیکریٹری کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انور نے دستک دی۔ جواب نہ ملا..... اس نے پھر دروازہ کھینچا۔ اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ دروازہ کھل گیا۔ انور کے سامنے ایک خوبصورت جوان کھڑا تھا۔ آنکھیں سرخ اور پلکیں سو جی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتا رہا ہو۔

”اندر چلے۔“ انور آہستہ سے بولا۔ سیکریٹری ایک طرف ہٹ گیا اور انور کمرے میں چلا گیا۔

”بیٹھ جائے۔“ انور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

سیکریٹری بیٹھ کر انور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”آپ کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ پروفیسر سے چھٹی لے کر گئے تھے۔“

”جی.....!“ سیکریٹری اُسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”جی ہاں۔“

”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”آپ یہاں سے کس وقت گئے تھے۔“

”دس بجے دن کو۔“

”کہاں گئے تھے؟“

”نشاط نگر اپنی خالہ کے یہاں۔“

”آپ کے استعمال میں وہی کار رہتی ہے جس کا نمبر ۲۳۷۱ ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ اسی کار پر گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”اور وہ کل سے اب تک آپ ہی کے پاس رہی۔“

”تمنا.....!“ وہ چونک کر بولا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”آپ میری بات کا جواب دیجئے۔“

”شاید یہاں بھی کوئی پتھر تھا جس کا نام لکھا ہوا ہے۔“ انور خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں تھا تو..... اب وہ تجوری میں رکھ دیا گیا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”پتہ نہیں..... سیکریٹری نے رکھ دیا ہے۔“

”تمہارے سامنے۔“

”ہاں بھی ہاں۔“

”تم اس کی قیمت سے واقف ہو۔“ انور نے پوچھا۔

”کیوں یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”اس لئے کہ سیاہ پکھراج آج تک میری نظر سے نہیں گزرا.....؟“

”ٹھیک ہے۔“ آصف بولا۔ ”آج سے پہلے میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”سیکریٹری کہاں ہے؟“

”اس کی حالت بہت ابتر ہے۔“

”وہ ہے کہاں.....؟“

”اپنے کمرے میں؟“ بھی نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آتا ہے۔“

”اور مجھے تم پر رحم آتا ہے۔“ انور ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں“

”وہ سامنے والے کمرے میں ہے تم جاؤ۔ میں مرحوم کے سامان کی فہرست مکمل کر رہا“

”مگر یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“ انور نے کہا۔

”یہ مت بھولو کہ پروفیسر میرا دوست بھی تھا۔“

”اس کا کوئی وارث بھی ہے یا نہیں۔“

”ہے تو..... لیکن اس کے متعلق پروفیسر کے قانونی مشیر مشر پی۔ اس زیادہ بہتر“

”گے۔“

”اور تم نے ابھی تک اس سے گفتگو نہیں کی۔“

”میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ آج کل شہر میں موجود نہیں ہے۔“

”نہیں کل یہ میری خالہ کے بھی استعمال میں رہی۔“

”آپ کی خالہ کی عمر کیا ہے؟“

”مسٹر.....!“ وہ تیز لہجے میں بولا اور پھر انور کو گھورنے لگا۔

”اس سوال کا جواب ضروری ہے؟“ انور نے سنجیدگی سے کہا۔

”پچاس یا پچپن سال.....!“

”ہوں.....!“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا آپ مکان کی کتنی اس لہجے میں رکھیں

جس میں کار کی کتنی رہتی ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”تو کل کنجیوں کا لہجہ بھی آپ کی خالہ کے پاس رہا ہوگا۔“

”جی ہاں..... مگر کیوں..... مگر کیوں؟“

”کچھ نہیں..... کوئی خاص بات نہیں۔“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ ”کیا میں وہ لہجہ

سکتا ہوں۔“

”جی ہاں..... ضرور ضرور۔“ سیکریٹری نے کہا اور اپنے کوٹ کی جھیلیں ٹٹولنے لگا۔

”یہ لیجئے۔“

”ان میں سے مکان کی کنجیاں کون کون سی ہیں۔“ انور نے پوچھا۔

سیکریٹری بتانے لگا۔

”اچھا یہ تو وہ کنجیاں ہیں جو آپ کے پاس رہتی تھیں۔ وہ کنجیاں کہاں ہیں جو پروفیسر رکھتا

”وہ ان کی جیب میں نہیں ملیں۔“ سیکریٹری بولا۔

”آپ نے تلاش کی تھیں۔“

”نہیں..... قاعدے کے مطابق انہیں ان کی جیب میں ہونا چاہئے تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کرنے والا اپنے ساتھ وہ کنجیاں بھی لے گیا۔“ انور بولا۔

”بھلا میں اس کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں۔“

”خیر چھوڑیے..... یہ بتائیے کہ آپ نے وہ سیاہ پکھراج تجوری میں کیوں رکھ دیا؟“

”وہ تجوری ہی میں رہتا تھا۔ پرسوں چند مہمانوں کو دکھانے کیلئے شوکیس میں لگایا گیا تھا۔“

”مہمانوں کو دکھانے کے لئے؟“

”جی ہاں۔“

”ان مہمانوں کے نام.....؟“

سیکریٹری نے نام بتانے شروع کئے اور انور اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔

”سر صغیر احمد.....!“ انور ایک نام پر بڑبڑایا۔ ”نیشنل بینک کا ڈائریکٹر نا.....!“

”جی ہاں وہی۔“

”شاید وہ بھی تو پتھروں کا شوقین ہے۔“

”جی ہاں۔“

”پروفیسر سے اس کے تعلقات کیسے تھے۔“

”ایچھے خاصے تھے۔“

”لیکن ہم پیشہ اور ہم شوق لوگ ایک دوسرے سے حسد بھی تو رکھتے ہیں۔“ انور بولا۔

”بھلا میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”تو وہ پکھراج پرسوں سے آج تک اسی شوکیس میں رہا۔“

”جی ہاں۔“

انور اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کمرے سے نکل آیا۔

کچھ نئی باتیں!

چار بجے شام کو انور تیمور منزل سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کیس میں اُسے سچ جج
رہنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا۔ سیکریٹری کا بیان الجھا ہوا تھا اور فی الحال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی
نی کہ اسے مجرم کیوں نہ سمجھا جائے۔ پھر چرایا گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے مطابق دعوت

والی رات سے اس وقت تک اسی شوکیس میں موجود رہا۔ پھر دوسری بات یہ کہ اگر وہ تجھ کو رکھا جاتا تھا تو پھر دعوت کے اختتام سے اب تک شوکیس ہی میں کیوں رکھا رہا۔ انور کو فہم ہو رہا تھا کہ اُس نے اس سے اور سوالات کیوں نہ کئے۔ پھر اس کا ذہن گھوریا کی طرف رخ ہو گیا۔ اُسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ پچھلی رات کو جائے واردات پر موجود تھی لیکن اس یقین بنیاد کی منطقی دلیل پر نہیں تھی جس خوشبو کا تجربہ اسے پچھلی رات کو ہوا تھا اس کا استعمال گھوریا علاوہ کوئی دوسرا بھی کر سکتا تھا۔ اس امکان کے باوجود بھی وہ نہ جانے کیوں گھوریا کو اس کیس متعلق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پکھراج اسی نے چرایا ہوا اور پھر کسی نے اُسے واپس کر دینے پر آمادہ ہو گئی ہو۔ اس کام کے لئے اس نے اس لڑکی کو منتخب کیا ہو؟ نہیں..... وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ بات تھی تو اس لڑکی کے پاس سیکریٹری کی کار کی موجودگی کیا رکھتی ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خود سیکریٹری بھی ملا ہوا تھا اور اگر یہ درست ہے تو پھر کی واپسی کے لئے اُسے ہموار کرنا بالکل ہی احتقانہ فعل تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام خود سیکریٹری انجام دے سکتا تھا۔ پھر اچانک اس کا ذہن ایک دوسرے ہی دھارے پر بہہ نکلا۔ آخر پردہ قتل کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ سب کچھ اُسے پھنسانے کے لئے کیا گیا تھا تو اس سازش کی پٹ کون ہو سکتا ہے اور پھر سوچتے سوچتے اسے الجھن ہونے لگی اور اس نے وقتی طور پر یہ خیال سے نکال پھینکا۔

رشیدہ گھر پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انور نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فلت بیٹا کر دور پھینک دی۔ نشانہ تو میری کا لیا تھا لیکن ہاتھ بہک جانے کی وجہ سے وہ جوتوں کی الما میں جا گری۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے وہ ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔

”کیوں؟ کیا کسی نے مرمت کر دی؟“ رشیدہ نے چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں میں کسی ایسے کی تلاش میں ہوں جس کی مرمت کی جاسکے۔“

”آئینہ لا دوں۔“ رشیدہ نے بھولے پن سے کہا اور انور اُسے گھورنے لگا۔

”رپورٹ.....!“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”بہت اچھا حضور..... سنئے..... وہ بے پول ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۶ میں رہتا ہے۔“

میں اس کا نام دے کر ہمارے ہوٹل میں لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اُس سے کچھ باتیں کرتا رہا لڑکی خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ ہوٹل سے چلی گئی اور میں واپس آ گئی۔“

”تم واپس آ گئیں۔“

”اور پھر کیا کرتی۔“

”اوہ..... تم اتنی الو کیوں ہو گئی ہو۔“

”نہیں تو کہاں۔“ رشیدہ حیرت سے اپنا پورا جسم ٹٹولتی ہوئی بولی۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”رشو.....!“

”فرمائیے مسٹر انور۔“

”مجھے غصہ آ جائے گا۔“

”بڑی بات ہے۔ بچوں کو غصے سے پرہیز کرنا چاہئے۔“ رشیدہ مربیانہ انداز میں بولی۔

”رشو.....!“ انور جھلا کر چیخا۔

”انور.....!“ رشیدہ بھی اسی انداز میں چیخی۔

انور دانت پیسنے لگا۔ رشیدہ اس کی نقل کر رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے تمہاری شامت آ گئی ہے۔“ انور نے کہا۔

”ہاں آئی تو تھی مگر تم سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر کر کے اپنا پیہ چھوڑ گئی۔“

”میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

”بسم اللہ..... مگر میز پر نہیں۔ کمزور لکڑی کی ہے۔ میرا خیال ہے دیوار..... خیر دیوار ہی سہی۔“

”بکواس بند کرو۔“ انور پھر چیخا۔

”بکواس بند کر دی۔“ رشیدہ بھی اُسی انداز میں چیخی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

انور نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور رشیدہ بلند آواز میں گانے لگی۔

”ماں مرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار.....!“

”کیوں؟ کیا بات ہے۔“ رشیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔
 ”بہت بڑی بات۔“ انور کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
 ”مگر ہیں خود بخود کھلتی جا رہی ہیں۔ خود بخود کھل رہی ہیں۔“
 ”تو ٹھیک سے بتاؤ نا۔“

دفعۃً انور نے چونک کر اپنی نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹالیں اور پھر اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔
 ”معاملہ بہت زیادہ الجھا ہوا ہے۔“ انور نے کہا اور رشیدہ کو اپنی اور سیکریٹری کی گفتگو کے متعلق بتانے لگا۔

”تب تو معاملہ صاف ہے۔“ رشیدہ بولی۔ ”سیکریٹری بھی ملا ہوا ہے لیکن پروفیسر کے قتل کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا اور اب تو یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ کسی نے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔“
 ”بھلا صغیر احمد یا اس کی لڑکی سے تمہارا کیا تعلق۔“
 ”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”ہاں ایک بات تو بھول ہی گئی۔ ایک عورت تلاش کرتی ہوئی آفس پہنچی تھی۔ اپنا نام گلوریا بتایا تھا۔ شاید وہ مناسب حق المحنت کے عوض تم سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔“
 ”گلوریا؟ کیوں کیا.....؟“ انور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا تم اُسے جانتے ہو.....؟“
 ”ہاں..... میری فہرست میں وہ بھی شامل ہے۔“
 ”بہر حال وہ اپنا پتہ دے گئی ہے۔“

”ہوں.....؟“ انور کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر دفعۃً چونک کر بولا۔ ”میں نے ابھی تک چائے نہیں پی۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ تمہارے استاد انسپٹر فریدی کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔“
 ”وہ عیش کی آخری منزل ہے..... میں ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکا۔“
 چائے پی چکنے کے بعد وہ رخصت بلڈنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گلوریا اُسے

”ارے بند کرو..... بند کرو..... یہ نفرت آمیز گانا۔“ انور زور سے چیخا۔
 ”کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار.....!“ رشیدہ نے پھر ہانک لگائی۔
 ”میں سچ کہتا ہوں۔“

”مان مرا احسان.....!“
 ”چپ رہو۔“

”ارے نادان کہ میں.....!“

”ارے چپ ارے چپ۔“ انور کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بولا۔ ”خدا عاتق کر اُسے جس نے یہ گیت لکھا تھا۔ جاہل تھا وہ بالکل اُلو کا پٹھا تھا۔“
 ”تجھ سے کیا ہے پیار.....!“

انور نے جھلا کر اپنی ٹائی کی گرہ تنگ کرنی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھونٹ کر مر جائے گا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ گیت حد درجہ نفرت آمیز معلوم ہوتا تھا۔
 ”چچ چچ..... ٹائی خوش رنگ بھی ہے۔“ رشیدہ اس کے ہاتھ پکڑتی ہوئی۔
 ”آخر تمہیں اس گیت سے اتنی جڑ کیوں ہے۔“

”دور ہٹو..... دور ہٹو.....!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

”اب مجھے ان کھڑکیوں میں سلاخیں لگوانی پڑیں گی۔“ رشیدہ فکر مند لہجے میں بولی۔
 ”سمنوم نہیں کب پڑوس کے ریڈیو سیٹ پر یہی گیت آنے لگے اور تم کھڑکی سے چھلانگ لگاؤ۔“
 ”تم خدا کے لئے یہاں سے چلی جاؤ۔“ انور عاجز آ کر بولا۔

”میں خود ہی جا رہی تھی۔“ رشیدہ دروازے کی طرف بڑھی اور تھوڑی دور جا کر پھر
 ”جانتے ہو وہ پراسرار لڑکی کون ہے؟“

”کیوں خواہ مخواہ مجھے تنگ کرتی ہو۔“ انور کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”اب آئے ہو سیدھی راہ پر..... خیر سنو..... اس کا نام رابعہ صغیر ہے اور وہ سر صغیر لڑکی ہے۔“

”کیا کہا.....؟“ انور اچھل کر بولا پھر اس کی نظریں رشیدہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

کچھ بتانا چاہتی ہے کوئی اہم بات۔

تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑی کے فلیٹ کی گھنٹی بج رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور گھوڑیاں چونک کر ہٹ گئی۔

”آپ..... آپ..... کیوں؟“

”کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”مگر اس وقت یہاں گھر میں مہمان.....!“

”آپ مطمئن رہئے..... آپ کا مہمان محفوظ رہے گا۔“

وہ دروازہ بند کر کے واپس لوٹ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص انتظام کر کے انور کو بلائے گی۔ انور نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا لیکن سائے پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ ایک معمر آدمی صوفے سے اٹھ رہا تھا۔ انور اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ سر صغیر احمد تھا۔

سر صغیر اپنے سر پر فلیٹ ہیٹ جھاتا اور کچھ بوڑھاتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔

گھوڑیاں انور کو بُری طرح گھور رہی تھیں۔

”میں اس بدتمیزی کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”اور مجھے آپ کا یہ جملہ بڑا عجیب لگ رہا ہے۔“

”تم آخر ہو کون.....؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں زبردستی یہاں گھس آیا ہوں۔“ انور نے

کہا اور اپنا ملاقاتی کارڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”انور سعید.....!“ وہ اچھل پڑی۔ ”مگر..... مگر.....!“

”میں آپ کی درخواست پر یہاں آیا ہوں۔“

”اوہ..... معاف کیجئے گا۔ آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا تھا۔“

”آپ نے پوچھا ہی کب تھا.....؟“

”اچھا تو بیٹھے۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتی ہوں۔“

بلد نمبر 5

”کوئی بات نہیں۔“ انور بیٹھتا ہوا بولا۔

”میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔“

”کس معاملے میں۔“

”پولیس نے نکولس کو پکڑ لیا ہے۔“

”نکولس..... کون نکولس.....!“

”پروفیسر تیموری کا دوست.....!“

”لیکن اس سے آپ کا کیا تعلق.....؟“

”میری اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔“

”اور وہ کل رات کو یہاں آیا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”تو وہ پروفیسر کے ساتھ ہی کیوں نہیں چلا آیا تھا۔“

”وہ نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر کو علم ہو۔“

”کیوں.....؟“

”اب میں کیا بتاؤں۔“ وہ بے بسی سے انور کو دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”آپ

نے میری تصویر پروفیسر کے کمرے میں دیکھی تھی۔“

”ہاں تو پھر.....!“

”یہ سب میں نے نکولس ہی کے لئے کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو نکولس کے کاروبار کے

لئے دوپہر کہاں سے فراہم ہوتا۔ اسے بھی پتھروں کا خبط ہے اور اس نے بھی اپنی زندگی پتھروں

لئے وقف کر دی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور جانتا ہی نہیں۔ میں نے پروفیسر تیموری سے

قرض دلوا لیا تھا اور اسی سے وہ کاروبار کر رہا تھا۔ پروفیسر اس کا گاہک بھی تھا۔“

”کیا پروفیسر کو تم دونوں کے تعلقات کا علم تھا۔“

”ہاں.....!“

”اور یہ سر صغیر احمد۔“

”یہ بھی نکولس کے گاہکوں میں سے ہے۔“

”لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق۔“

گلو ریا خاموش ہو گئی۔ انور اُسے گھور رہا تھا۔

”کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“

”اچھا سیاہ پکھراج کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔“

گلو ریا بے اختیار چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کی رنگت اڑنے لگی تھی لیکن اہ

ہی اپنی حالت پر قابو پایا۔

”سیاہ پکھراج..... کیسا سیاہ پکھراج..... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی

”پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔“

”مسٹر انور..... نکولس کو اس مصیبت سے نجات دلایئے۔ میں آپ سے التجا کرنا

”تو پھر میں جو کچھ پوچھتا ہوں تم بتاتی کیوں نہیں۔“

”جو کچھ میں جانتی تھی میں نے بتا دیا۔“

”تم نے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن تم ایک دن سب کچھ بتانے پر تیار ہو جاؤ گی۔“

گلو ریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”کیا تم پروفیسر والی دعوت میں شریک تھیں۔“

”نہیں..... لیکن نکولس وہاں موجود تھا۔“

”سرمغیر اور پروفیسر کے تعلقات کیسے تھے؟“

گلو ریا ایک بار پھر خاموش ہو گئی لیکن اُسے بولنا ہی پڑا اور وہ کافی دیر تک

رہی۔ لیکن انور کے لئے وہ سب بے سود تھیں۔ اس کی دانست میں وہ اس سے کچھ

کوشش کر رہی تھی۔

وہ لڑکی

سات بجتے بجتے انور پھر سونا گھاٹ پہنچ گیا۔ تیمور منزل میں ابھی دو پولیس کا کنیبل

تھے۔ آصف وغیرہ جا چکے تھے۔ کانٹنبل دوپہر کو انور اور آصف کو ایک ساتھ دیکھ چکے تھے اس لئے

انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انور سیدھا سیکریٹری کے کمرے میں چلا گیا جو اس وقت بھی بند

تھا۔ البتہ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جن سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

انور نے دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ سیکریٹری اُسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے

نفرت جھانک رہی تھی۔

”میں تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے فرصت نہیں۔“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری خالہ.....!“

”آپ جا سکتے ہیں۔“ وہ بگڑ کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا تعلق پولیس سے

نہیں ہے۔“

انور ہنسنے لگا..... اور سیکریٹری نے دروازہ بند کر دیا۔ انور تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا

پھر کھڑکی کے قریب جا کر بولا۔ ”سیکریٹری صاحب آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے..... مجھے رابعہ

مغیر نے بھیجا ہے۔“

دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور سیکریٹری باہر نکل آیا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”تمہاری خالہ رابعہ مغیر نے۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

سیکریٹری دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ بغیر سہارے کے نہیں کھڑا ہو سکتا۔

”اندر چلو.....!“ انور اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔

”سیکریٹری بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔“

”پولیس کو ابھی اس کی اطلاع نہیں کہ تم نے پروفیسر کی اجازت کے بغیر کل رات کو گھر

بھڑا تھا۔“

”تو کیا.....!“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”رابعہ نے سب کچھ بتا دیا۔“

”تم نے پولیس سے یہ بات کیوں چھپائی تھی کہ دعوت والی رات کو سیاہ پکھراج گم ہو گیا

سیکرٹری نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی اور انور سوچنے لگا کہ اسے اداکاری سمجھے یا نکتہ۔ کیا وہ سچ سچ راست بازی سے کام لے رہا تھا یا راجہ کو پھنسا کر خود الگ ہو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم نے آخر پتھر کی چوری اور بازیافت کے متعلق پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔“

”مسٹر انور وہ پروفیسر کی زندگی ہی میں جرایا گیا تھا؟ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنا بے قیمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بتائیے کہ خود پروفیسر ہی نے اس کی اطلاع پولیس کو کیوں نہیں دی۔“

انور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ظاہر ہے کہ وہ اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دینا چاہتے تھے۔“ سیکرٹری پھر بولا۔

”لیکن وہ پتھر اسے ملا کہاں سے تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”مجھے اس کی اطلاع نہیں اور نہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ وہ ان کے پاس کب سے تھا۔“

”دعوت میں راجہ بھی شریک تھی۔“

”ہاں..... وہ بھی تھی۔“ سیکرٹری نے مضطرب آواز میں کہا۔

”اور دوسری صبح کو کھراج شوکیس میں نہیں تھا۔“ انور نے کہا۔

”ہاں.....!“

”اُسے رات ہی کو تجوری میں کیوں نہیں رکھ دیا گیا تھا؟“

”اب اس کے متعلق میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے پروفیسر سے کہا بھی تھا لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں اُسے شوکیس ہی میں رہنے دیا جائے۔“

”راجہ کس وقت تک تمہارے ساتھ نشاطا نگر میں رہی۔“

”تین بجے تک..... بلکہ وہ وہیں رہ گئی اور میں واپس چلا آیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں پروفیسر صبح ہی صبح واپس نہ آ جائے۔“

”تم اسے بہت چاہتے ہو۔“

”سیکرٹری خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

تھا اور پروفیسر کی موت کے بعد پھر مل گیا۔“

”اگر راجہ نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو اب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”راجہ نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا لیکن اب تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔“

سیکرٹری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”لیکن اتنا یاد رکھو کہ تم جھوٹ بول کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ انور پھر بولا۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ سیکرٹری گلوگیر آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

رہے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ پروفیسر کو کس نے قتل کیا لیکن یہ جانتا ہوں کہ پتھر کس نے ہمارے

تم کسی طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرو کہ پروفیسر کا قاتل میں ہی ہوں۔ پتھر کی

اندھیرے ہی میں رہنے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ راجہ کا نام منظر عام پر آئے۔ اس سے بڑا

لئے بھانسی ہوگی۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں پہلے ہی سے یہ ساری اسکیم معلوم تھی۔“

”نہیں..... بلکہ میں بعد میں ان نتائج پر پہنچا ہوں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں واپس آنے کے بعد تمہیں اس بات کا احساس

تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔“

”نہیں..... نہیں..... میں اس کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔“

اس کا اعتراف ہے کہ میں نے پروفیسر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ راجہ

واپس نہیں آ سکتے۔“

”تو نشاطا نگر جانے سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع نہیں تھی کہ تم نشاطا نگر جاؤ گے۔“

”مسٹر انور آپ یہ سب مت پوچھئے۔ کسی طرح یہ ثابت کر کے مجھے بھانسی کے تختے

پہنچا دیجئے کہ میں ہی پروفیسر کا قاتل ہوں۔“

”کیوں؟ تم زندگی سے بیزار کیوں ہو گئے ہو؟“

”میں یہ سوچنے سے پہلے مر جانا چاہتا ہوں کہ جس پر مجھے اعتماد تھا اس نے مجھے فریب

”تمہارا اشارہ راجہ کی طرف ہے۔“

اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا اور میرا خون ناحق آپ کی

دن پر ہوگا۔“

”واہ! رے میرے شیر.....!“ انور ہنس کر بولا۔ ”تم نے تو فرہاد کی بھی قبر پر لات مار دی۔“

”اب صدی میں نے ایسا عشق نہیں سنا۔“

”مسٹر انور آپ جاسکتے ہیں۔“ سیکریٹری اسے گھورتا ہوا بولا۔

”ظاہر ہے کہ میں یہاں رات نہیں بسر کروں گا۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”مجھے آپ سے ہمدردی کا توقع ہے۔“

”ہمدردی کا توقع اسی وقت رکھ سکتے ہو جب سب کچھ صحیح صحیح بتا دو۔“

”اور کیا میں ابھی تک جھک مار رہا تھا۔“ سیکریٹری نے بگڑ کر کہا۔

”میں تو یہی سمجھتا ہوں۔“

”مسٹر انور.....!“

”گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”بعض اوقات میں لوگوں کو مصلحتی غصہ

بتا ہوں۔“

سونا گھاٹ سے واپسی پر انور کے ذہن میں عجیب قسم کا انتشار برپا تھا اور اس انتشار میں

تصویریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ رابعہ، گلوریا، نکولس، سیکریٹری سر صغیر احمد۔ وہ الجھتا

اور ہر شے پہنچ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل سر صغیر احمد کی کونٹھی کی طرف موڑ دی۔ کونٹھی کے قریب

سر صغیر دکھائی دیا جو اپنی کار پر کہیں جا رہا تھا۔ انور نے موٹر سائیکل کی رفتار دہسی کر دی اور

اسے یقین ہو گیا کہ صغیر کی کار کافی دور نکل گئی ہوگی تو اس نے اپنی موٹر سائیکل کونٹھی کے

لپ پر کھڑی کر دی اور خود اندر چلا گیا۔

”کس سے ملتا ہے آپ کو.....!“ ایک نوکر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”صاحب ابھی ابھی باہر

ہیں۔“

”مسٹر رابعہ.....!“ انور نے اپنا ملاقاتی کارڈ نوکر کو دیتے ہوئے کہا۔

نوکر چلا گیا اور انور برآمدے میں انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نوکر واپس آیا۔

”نشاط نگر میں تم کہاں رہے۔“ انور نے پوچھا۔

”درحقیقت میری ایک خالہ نشاط نگر میں رہتی ہے لیکن میں نے وہاں رات نہیں گزاری تھی۔“

”پھر.....!“

”رابعہ کے گھر پر.....!“

”کیا نشاط نگر میں اس کا کوئی گھر ہے۔“

”جی ہاں..... اکثر وہ لوگ تبدیل آب و ہوا کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ ویسے وہ

خالی ہی رہتا ہے۔“

”کیا اس سے پہلے بھی تم لوگ اس قسم کی راتیں گزار چکے ہو۔“ انور نے پوچھا۔

”کبھی نہیں اور مجھے اس پر حیرت ہے کہ رابعہ جیسی ڈرپوک لڑکی اس پر کیسے تیار ہو گئی تھی

”تو کیا خود تم ہی نے اس سے اس کے لئے کہا تھا۔“

”قطعاً نہیں..... یہ تجویز اسی نے پیش کی تھی کہ ہم نشاط نگر میں رات گذاریں۔ حالانکہ

سے قبل وہ کبھی میرے ساتھ سینما تک نہیں گئی تھی۔ ایسی باتوں پر عموماً خوف ظاہر کیا کرتی تھی۔“

”لیکن نشاط نگر کیوں اتنی آزادی سے چلی گئی۔“

”اس نے کہا تھا کہ سر صغیر رات کو گھر پر نہیں رہیں گے۔“

”اوہ.....!“ انور اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ

پروفیسر دونوں بیک وقت رات کو گھر سے باہر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”تو کیا..... تو کیا.....!“

”نہیں.....!“ انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کسی قسم کا خیال ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ سر صغیر نے تمہارے ذریعہ پروفیسر کو قتل کرادیا۔ ہو سکتا ہے کہ جنہیں وہ

اس کا علم نہ ہو۔ میں سر صغیر کی طرف سے بہت زیادہ مشکوک ہوں اور پولیس کو بھی اسی رائے

لگانے کی کوشش کروں گا۔“

”نہیں مسٹر انور..... نہیں خدا کے لئے..... اس طرح رابعہ کی بھی بدنامی ہوگی اور

اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پولیس کے سامنے اعتراف جرم کئے لیتا ہوں اگر آپ

”مس صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ان سے کہہ دو بہت ضروری کام ہے۔“ انور نے کہا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”مسٹر انور.....!“ دروازے سے آواز آئی۔ ”اندر آ جائیے۔“

رابعہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

انور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ”کنجیاں واپس کر دیجئے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیسی کنجیاں؟“

”میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔“ وہ رونی آواز میں بولی۔ ”آپ جتنا روپیہ طلب گے میں آپ کو دے سکتی ہوں۔“

”بھلا ایک ایسے آدمی کو روپوں پیسوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو چھانسی پر پڑنے چار“ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”پولیس کو دہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب پروفیسر الزام بھی میرے ہی سر تھوپ دیا جائے گا۔“

”اوہ..... میرے خدا میں کیا کروں۔“ رابعہ سر پکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں..... میری چھانسی کی خبر اخبارات میں پڑھ لیجئے گا۔“

”نہیں..... نہیں۔“ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے۔

”تو پھر یہ بتائیے کہ پروفیسر کا قاتل کون ہے۔“

”میں..... میں کیا جانوں..... میں۔“

”کیا سر صغیر کو آپ کے اور پروفیسر کے سیکریٹری کی دوستی کے متعلق معلوم ہے۔“

”جی.....!“ وہ اچھل کر بولی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا انہیں یہ معلوم تھا کہ آپ سیکریٹری کے ساتھ نٹانگ ٹرا

بسر کریں گی۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں سیکریٹری کو نہیں جانتی۔“

”تو پھر آپ نے اس کی کار چرائی ہوگی کیونکہ آپ اُسی کی کار پر مجھ سے ملے گئی تھیں۔“

”جی.....!“ رابعہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

”جی ہاں..... میرے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے اور کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وجہ

کار کو آپ کب سے جانتی ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ بے اختیار رو پڑی۔ ”خدا کے لئے کنجیاں واپس کر دیجئے اور اپنا

ٹی لکھ بتائیے۔“

”کیا اب میں حق لکھت اپنی قبر میں لے جاؤں گا۔“

”پھر میں کیا کروں۔“

”سب کچھ کچ بچا دیجئے۔“

”میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گی۔“

”کیا قاتل کا.....؟“

”نہیں نہیں..... اس کا جس نے مجھے پکھراج واپس کرنے کے لئے دیا تھا۔ لیکن وہ قاتل

نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔“

”اچھا تو پھر میں ہی قاتل ہوں..... خُذھ جاؤں گا چھانسی پر۔“

”نہیں..... نہیں۔“ وہ بے تابانہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ کی یہ پریشانی مجھے چھانسی سے نہیں بچا سکتی۔“

”میں کیا کروں.....!“ وہ پھر بیٹھ گئی۔

”سیکریٹری کچ بچا اس سازش میں شریک تھا یا آپ نے اُسے دھوکا دیا تھا۔“

”نہیں..... نہیں میں کچھ نہیں جانتی۔“

”آپ بہت کچھ جانتی ہیں۔“

وہ پھر رو پڑی۔

”دیکھئے یہ سب بیکار ہے۔ آپ کے آنسو بھی مجھے چھانسی سے نہیں بچا سکتے۔“

”مسٹر انور..... خدا کے لئے۔“

”میں مجبور ہوں۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ کا بال بھی بیک نہیں ہو سکتا۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“

”آپ بتائیے کہ میں آپ کو کتنا روپیہ دوں؟“

”روپیہ میں آپ سے نہیں لوں گا۔“

”پھر.....!“

”میں نہیں بتا سکتا۔ لیجئے یہ کتنیاں سنبھالے۔“ انور کتنیاں اس کی گود میں پھینک کر کہہ

ہو گیا اور پھر جانے کے لئے مڑا۔

”مسٹر انور.....!“

”فرمائیے۔“

”خدا کے لئے..... سنئے تو..... ایک منٹ ٹھہر جائیے..... صرف ایک منٹ سنئے تو۔“

وہ پکارتی ہی رہ گئی۔ انور کے قدموں کی آہٹیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”جئے پول ہوٹل میں ایک مسافر وجے کمار۔“ آصف نے کہا۔ انور نے بہت ضبط سے

ام لیا تھا۔ اگر وہ اس وقت بہت زیادہ محتاط نہ ہوتا تو یقیناً اچھل پڑتا۔

”اچھا.....!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ مدراس کا ایک مشہور بد معاش تھا اور کئی بار کاسٹریا فٹ بھی۔“

”مدراس کا.....!“ انور نے کہا۔ ”وہی تو نہیں جو کسی جوہری کے یہاں ڈاکہ ڈالنے کے

لئے میں ماخوذ ہوا تھا۔“

”وہی..... وہی..... لیکن میں تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں۔“

”تو وہ کن حالات میں قتل ہوا.....؟“

”ہوٹل والوں کا بیان ہے کہ شام کو جب وہ نشے میں مری طرح دھت تھا ایک آدمی اسے

بل تک پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ پھر ویٹروں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ تقریباً

ٹھہرے ایک ویٹر اس کا کھانا لے کر اس کے کمرے میں گیا اور وہاں سے اٹے پیر واپس آیا۔

انے وہاں اس کی لاش دیکھی تھی ایک خنجر اس کے سینے میں بیوست تھا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ

نشتے ہی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔“

”اس آدمی کا پتہ لگا جو اسے ہوٹل تک پہنچانے آیا تھا.....؟“ انور نے پوچھا۔

”پتہ نہ لگتا تو اچھا تھا.....!“ آصف بولا۔

”کیوں.....؟“

اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا.....!“

”یعنی.....!“

”سر صغیر احمد نے اسے ہوٹل پہنچایا تھا۔“

”اوہ..... تو کیا وہ سر صغیر کا دوست تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ اسے ایک جگہ نشے میں پڑا ہوا ملا تھا۔“

”لیکن سر صغیر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مے پول ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”انہوں نے اس سے پہلے بھی اسے ہوٹل میں دیکھا تھا اس لئے وہ اسے ہوٹل لے آئے

کہ شاید اسے کوئی پہچانتا ہو۔ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ وہ وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔

”اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔“

”کیوں یقین کیوں نہ کرتا۔“ آصف بھٹا کر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ انور نے کہا اور موٹر سائیکل اشارت کر دی۔

گھر پہنچ کر اسے رشیدہ کو سارے واقعات کی مکمل رپورٹ دینی پڑی۔

”اب آ رہے ہیں دانتوں پسینے۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”پہلے ہی منع کیا تھا۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں ہمت ہار گیا۔“

”نہیں تم ٹھہرے تیس اور تیس ساٹھ ماراں۔“

”ہشت..... فضول کیواس نہیں۔ سنوکل تمہیں قدیر کے دفتر میں جا کر پوسٹ مارٹم

پچھلے دو تین سال کے شمارے دیکھتے ہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ کبھی وہ پروفیسر تیموری اور

احمد کے پیچھے پڑ گیا تھا ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔“

”فضول اور بے کار۔“ رشیدہ اکتا کر بولی۔ ”تم ہمیشہ نکلی باتیں سوچتے ہو۔ خواہ تو

سری مول لینے سے کیا فائدہ۔“

”بہتر ہے میں یہ کام خود ہی انجام دے لوں گا۔“ انور بگڑ کر بولا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ تمہارا

بغیر میں اپنا ج ہو جاؤں گا۔“

”اچھا بابا اچھا۔ بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ضرور جھک ماروں گی۔“

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ انور نے ریسور اٹھالیا۔

”اوہ انور.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں ہوں قدیر۔ میں نے فیصلہ کیا

کہ میں سب کچھ بتا دوں۔ یہ معاملہ سنگین ہے ممکن ہے کسی قانونی شکنجے میں پھنس جاؤں۔“

”تم مجھے کیا بتاؤ گے۔“ انور نے پوچھا۔

”بھئی کہ پروفیسر کاسیکر ٹیری کل رات کو کہاں اور کس کے ساتھ تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ انور مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکلنے لگا۔

”تم کچھ نہیں جانتے۔“ دوسری طرف سے قہقہے کی آواز آئی۔

”میں پوچھتا ہوں کہ تم کس طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔“

دوسری طرف سے پھر قہقہہ سنائی دیا۔ ”دیکھو انور تم میرے احسان سے کسی طرح نہیں بچ

سکتے۔ اس قسم کی گفتگو کرنے کے بعد اور مجھ سے معلومات حاصل کر کے تم کو دے گا کہ مجھے اس کا

پلے سے علم تھا۔“

”یہ بات نہیں پیارے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میں رابعہ اور سیکر ٹیری کے عشق کے متعلق

بکثرت لکھ رہا ہوں اور اس کے جملہ حقوق تمہارے نام محفوظ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”اوہ تو تمہیں بچ بچ معلوم ہے۔“ قدیر جھپٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ان کا تعاقب کیوں کیا تھا۔“

”اب اسے پوچھ کر کیا کرو گے؟ اسی کی روٹیاں کھاتا ہوں۔ اگر پروفیسر کا قتل نہ ہو جاتا تو

بنا ایک مقتول رقم ہاتھ آنے کی امید تھی۔ سر صغیر کبھی یہ نہ چاہتا کہ اس کی لڑکی بدنام ہو جائے۔“

”سر صغیر.....“ انور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ وقت اس کے لئے

اُن کا پھندا تیار کر رہا ہے۔“

”کیوں..... کیا..... وہ یعنی وہ.....!“

”ہاں مجھے اس پر شبہ ہے اور بہت جلد پولیس بھی میرے ہی راستے پر آ جائے گی۔“

”نہیں بھئی..... تم آخر اس پر کیوں شبہ کر رہے ہو۔ اگر نکولس ہی ہوا تو؟“

”لیکن اسے اپنے ہی تک محدود رکھنا کہ میں اس پر شبہ کر رہا ہوں۔“

”ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ممکن ہے کل میں رشیدہ کو کسی کام سے تمہارے پاس بھیجوں۔“

”ضرور..... ضرور..... بڑی خوشی ہے۔“

”اچھا شب بخیر.....!“ انور نے ریسور رکھ دیا اور رشیدہ کی طرف مڑ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”دسجے کمار وہی تھا۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کون.....!“

”جس نے مدراسی جوہری کے یہاں ڈاکہ ڈالا تھا اور انتہائی کوششوں کے باوجود پکھراج اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا تھا۔“

”سیاہ پکھراج.....!“ رشیدہ متحیر ہو کر بولی۔ ”آخر تمہارے سر پر سیاہ پکھراج کیوں ہوا۔“

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کوٹ اتارنے ہی جا رہا تھا کہ رشیدہ پھر بولی۔

”کیا کھانا کھانے کا ارادہ نہیں۔“

”نہیں.....!“ انور نے کہا اور کپڑے اتارنے لگا۔ ”میں نے تم سے سو بار کہہ

کھانے کے لئے میرا انتظار نہ کیا کرو۔“

”بہتر ہے۔“ رشیدہ جھلا کر بولی اور کمرے سے چلی گئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پھر انکسپلر آصف سے ٹڈبھیڑ ہو گئی۔ انور کا ارادہ تھا کہ دوسرے

پہلے اپنے اخبار کیلئے جاسوسی ناول کی قسط لکھے گا پھر کسی دوسرے کام میں ہاتھ لگے گا۔ لیکن

اٹھنے کے بعد اسے آصف کا منہ دیکھنا پڑا۔ جو خلاف معمول بہت زیادہ بارونق معلوم ہو رہا تھا

”دیکھ اتم نے.....؟“ وہ چپک کر بولا۔ ”اس بار تم پھسڈی ہو گئے۔“

”کیوں.....؟“

”قاتل پکڑ لیا گیا۔“

”یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جھگڑا قتل ہی پر ختم ہوتا۔“ انور نے کہا اور آصف ہنسنے لگا۔

”خیر..... کیا یہ ثبوت بھی نا کافی ہے کہ وہ ہتھوڑا جس سے پروفیسر قتل کیا گیا نکولس ہی کا تھا۔“

”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”نکولس کے ایک دوست ریٹائرڈ حوالدار میجر شمشیر سنگھ نے اسے شناخت کیا ہے۔“

”اوہ..... وہ پگلا حوالدار میجر.....!“ انور قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یقیناً اپنی عقل کے بجائے تم

خود کہیں چرنے گئے تھے۔“

”کیوں.....؟“

”بھلا اس پاگل کی شہادت کس عدالت میں پیش کرو گے۔“

آصف نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور انور اسے گھورنے لگا۔

”خیر..... خیر..... تم بہت زیادہ عقل مند نہیں ہو۔ خود نکولس نے اس بات کا اعتراف کیا

ہے کہ وہ ہتھوڑا اسی کا ہے۔“ آصف مسکرا کر بولا۔

”نکولس نے.....!“

”ہاں ہاں نکولس نے اور اس سے یہ بھی اگلا لیا جائے گا کہ وہ پروفیسر کا قاتل ہے۔“

”اچھا تو کیا اسے اس سے انکار ہے۔“

”ہاں..... وہ اس کا اعتراف تو کرتا ہے کہ ہتھوڑا اسی کا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ

پروفیسر کے گھر میں پہنچا کیسے۔“

اس بار انور نے ایک چھت شکاف قہقہہ لگایا اور آصف کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”آصف میاں تم ابھی بوڑھے ہو۔ اگر وہ سچ سچ پروفیسر کا قاتل ہوتا تو کبھی اس بات کا

اعتراف نہ کرتا کہ وہ اسی کا ہتھوڑا ہے۔“

”مگر حوالدار میجر.....!“

”وہ مخبوط الحواس ہے۔ اس لئے اس کی شہادت قانون کی نگاہ میں بے مصرف ہے۔“

”خیر میں تمہیں دکھا دوں گا۔“ آصف جھلا کر بولا۔

”مگر مفت دکھانا کیونکہ میں تمہارا بہت پرانا دوست ہوں۔“

آصف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور انور کو گھورے جا رہا تھا۔

”خیر ہٹاؤ.....!“ انور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”پروفیسر کے کسی وارث کا پتہ چلا۔“

”ہاں اس کا ایک بھائی سرحدی علاقے میں سمور کی تجارت کرتا ہے۔ پروفیسر کے بھائی

مشر نے اسے اطلاع دی تھی۔ اس پر اس نے اسے بذریعہ تار ہدایت کی کہ پروفیسر کا سارا اثاثہ

بچ ڈالا جائے اور دوسری دلچسپ بات یہ کہ ایک آدمی پروفیسر کی خواب گاہ کا سارا سامان خرید

پر مجبور ہو گیا ہے۔“

”صرف خواب گاہ کا سامان۔“ انور چونک کر بولا۔ ”وہ آدمی کون ہے؟“

”اس نے مسٹر اس سے فون پر بات چیت کی تھی۔ غالباً وہ کسی بینک کے ذریعہ یہ سارا

کرے گا۔“

”اس نے اپنا نام بتایا ہی ہوگا۔“ انور نے کہا۔

”ہاں..... جے پی سنگھ.....!“

”لیکن کس بینک کے ذریعہ۔“

”ابھی یہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

انور نے نوٹ بک اٹھا کر اس میں آصف کا بتایا ہوا نام لکھ لیا۔ اسکے ذہن میں تجوری

رہی تھی جس میں سیاہ پتھر اراج رکھا جاتا تھا اور وہ تجوری پروفیسر کی خواب گاہ میں رکھی ہوئی تھی

”یہ بتاؤ کہ وہ صرف خواب گاہ ہی کا سامان کیوں خریدنا چاہتا ہے۔“ انور نے پوچھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ آصف نے کہا۔

”کیا وہ تجوری خواب گاہ ہی میں نہیں ہے جس میں وہ سیاہ پتھر اراج رکھا ہوا ہے۔“

”اگر یہی بات ہے تو اس احمق خریدار کو بعد میں بڑی مایوسی ہوگی۔“ آصف ہنس کر

”کیوں.....؟“

”سیرکٹری نے اس پتھر کو بینک میں رکھوا دیا ہے۔“

”اچھا! کس بینک میں؟“

”نیشنل بینک.....!“

بلد نمبر 5 ”اوہ.....“ انور اچھل کر بولا۔ ”اور سر صغیر اس بینک کا ڈائریکٹر ہے۔“

”میں جہاں مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سر صغیر ہی پروفیسر کا قاتل ہے۔“

”یقیناً جہاں ادماغ خراب ہو گیا ہے۔“ آصف منہ بنا کر بولا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“

”آختم سر صغیر کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“ آصف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اور میں

بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم کسی سیاہ پتھر کا تذکرہ بار بار کرتے رہے ہو۔“

”صرف یہی نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وجہ کار کا

نہی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“

”شباباش.....“ آصف نے قہقہہ لگایا۔ ”بس بس اب صرف انیوں کی ایک گولی اور پاؤ

روہ کی اور ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد تم اپنے استاد کے بھی کان کاٹ لو گے۔“

انور نے کوئی جواب دینے کے بجائے تولیہ کاندھے پر ڈالا اور غسل خانے کی طرف چلا

ایلا آصف تھوڑی دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر چلا گیا۔

ناشنہ کرتے وقت انور رشیدہ سے کہہ رہا تھا۔

”آج تم آفس نہیں جاؤ گی تمہیں روزنامہ ”پوسٹ مارٹم“ کے پرانے فائل الٹنے ہیں اور

ایک اور نئی دریافت..... تم یہاں کے سارے بینکوں میں گھوم پھر کر یہ پتہ لگاؤ کہ کسی نے

جے پی سنگھ کے نام سے اس دوران میں کوئی رقم تو نہیں جمع کرائی اور جمع کروائی ہے تو کس

فائل تو میں دیکھ لوں گی مگر یہ دوسرا کام میرے بس کا نہیں۔ کہاں کہاں کی خاک چھانٹی

اڑوں گی۔“

”تقدیر کو ساتھ لے لیتا۔ میں اس سے فون پر کہہ دوں گا۔“

”جی..... یہ تقدیر.....!“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ ”بہت بور ہے..... خواہ مخواہ بھیجا چاٹ

والا ہے۔“

”بہر حال آج تو تمہیں اُسے برداشت کرنا ہی پڑے گا۔“

”لیکن یہ جے بی سکھ کون ہے اور کہاں سے ٹپک پڑا“ رشیدہ نے پوچھا اور انور نے واقعہ دہرایا۔

”جب نکلاس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہتھوڑا اسی کا ہے تو پھر اب خواہ مخواہ بھاگ دوڑ کی ضرورت ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”ایک اچھا خاصا معمہ ہے۔“ انور سگریٹ سلکاتا ہوا بولا۔ ”اور اب گھوریا کو بلاؤ پڑے گا۔ وہ کوئی اہم بات جانتی ہے جسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر کا قاتل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی اسے اپنا ہتھوڑا نہ تسلیم کرتا۔“

جنگ اور خاتمہ

دوسری صبح انور کو حد درجہ خوش گوار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی بچھلی تازگی دوبارہ لوٹ آئی اور اس کے چہرے پر فکر کے بادل نہیں تھے۔ بچھلی رات کو رشیدہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھی اور وہ تقریباً دو بجے رات کو چوروں کی طرح اپنے کمرے میں داخل ہو کر چپ چاپ سو گیا۔ صبح چھ بجے آنکھ کھل جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک بستر میں پڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ذہن اور جسم دونوں تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ صبح اس کے لئے حد خوشگوار تھی۔

”بیٹے آصف.....!“ وہ خود بخود بڑبڑایا۔ ”اس بار تمہیں مرغا بتا کر چھوڑ دوں گا۔“ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انور نے بُرا سامنہ بنایا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رشیدہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چوہک کر انور کی دیکھنے لگی۔ پھر کچھ اور قریب آ کر اس طرح نتھنے سکوڑے جیسے کچھ رنگنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اوہ.....!“ انور بھی اسی انداز میں بولا۔

”تم تو کبھی کوئی خوشبو نہیں استعمال کرتے تھے۔“ رشیدہ منہ سکوڑ کر بولی۔

”میں اب بھی کوئی خوشبو نہیں استعمال کرتا۔“

”پھر یہ تمہارے پاس سے ایوننگ ان پیرس کی بھینٹی بھینٹی خوشبو کیسے آرہی ہے۔“ انور نے اب غور کیا کہ وہ بچھلی رات کی پتلون اور قمیض ہی پہنے ہوئے سو گیا تھا۔ ”اور یہ تمہارے کاندھے پر سرخ دھبہ کیسا.....!“ رشیدہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتی بولی۔ ”اوہ..... اوہ..... یہ تو..... لپ اسٹک کا دھبہ ہے۔“

”ارے..... یہ..... ہاں ہے تو۔ لیکن یہ لپ اسٹک کے دھبے کا میرے پاس کیا کام۔“

”اب مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔“

”بھلا میں تمہیں بیوقوف کیوں بنانے لگا۔“

”کل رات کو تم کہاں تھے۔“ رشیدہ گرج کر بولی۔

”افاہ..... اب تم نے بھی انسپکٹر آصف کی طرح اس قسم کے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔“

”میں پوچھتی ہوں تم کہاں تھے؟“

”میں بتاتا ہوں کہ نہیں بتاؤں گا۔“ انور جھلا کر بولا۔ ”میں نے تم سے کبھی اس قسم کے سوالات نہیں کئے۔“

”میں تمہاری طرح آوارہ تو نہیں کہ تمہیں اس کا موقع ملتا۔“

”اچھا بس بس.....!“ انور بگڑ کر بولا۔ ”تم ہمیشہ یہ بھول جاتی ہو کہ ہم دونوں صرف بے وقوف ہیں۔“

”میں ہمیشہ یاد رکھتی ہوں..... لیکن تم آوارگی نہیں کر سکتے۔“

”آوارگی..... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔“

”تو کیا پھر یہ لپ اسٹک کا دھبہ آسمان سے اتر آیا ہے۔“

”چلو چلو..... اپنا کام کرو۔“

”تمہیں بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟“ رشیدہ جھنجھلا کر بولی۔

”کون.....؟“

”میں کہتی ہوں کہ تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔“

”مجھے اس سے انکار کب ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”نہ جانے کیوں وہ اس وقت لڑ رہا تھا۔“

”دیکھو تمہیں بتانا پڑے گا۔“

”اچھا تو سنو! کل رات میں گھوریا سے ملا تھا اور اسے سیدھی راہ پر لانے کے لئے اسے شراب بھی پلائی پڑی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد نشے میں مجھ پر آکر رشیدہ کچھ سوچنے لگی لیکن انور پھر بولا۔

”اب تمہارا دماغ صاف ہوا یا نہیں۔“

”گھوریا سے تمہیں کیا معلوم ہوا۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”میں نے اُسے راز رکھنے کی قسم کھالی ہے اس لئے مجبور نہ کرو لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ یہ دونوں قتل اس پتھر کے سلسلے میں نہیں ہوئے۔“

”پھر.....!“

”پہلے تم مجھے اچھل کے کاموں کی رپورٹ دو.....!“

”وہ جے کار کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ مگر ۱۹۵۰ کے فائل میں مجھے ایک دلچسپ

نظر آئی تھی۔“

”وہ کیا.....!“

”قدر اس زمانے میں پروفیسر تیموری کے خلاف لکھ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ بیس شمار اس نے اس کے خلاف لکھا ہے اور پھر اچانک لکھنا بند کر دیا اور پھر ایسی صورت میں جبکہ ایک قبل اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ دوسرے شمارے میں کچھ اور دلچسپ باتیں لکھنے کی کوشش کر لیکن اس نے دوسرے شمارے میں پروفیسر کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ بلکہ تب سے اب تک نام تک نہیں لیا اور اسی آخری شمارے میں ایک خبر بھی دیکھی جس میں یہ تھا کہ سونا گھا تیموری منزل کے قریب کسی نامعلوم آدمی کی موٹر کے نیچے ایک بڑھیا دب کر مر گئی۔ مجرم کی جاری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”بہت اچھے.....!“ انور چیخ کر بولا۔ ”بھلا وہ کس تاریخ کا شمارہ تھا۔“

”۱۳ جون ۵۰ء کا۔“

”پھر بہت اچھے..... رشوتم نے کمال کر دیا۔“ انور نے اسے جھنجھوڑ کر کہا اور رشیدہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی، وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”اچھا بیک کا کیا رہا۔“

”سارے بیک دیکھ ڈالے لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔“ رشیدہ نے کہا۔ ”قدر دن بھر میرے ساتھ مارا مارا پھرا اور اچانک اس کے پیٹ میں بڑا شدید درد اٹھا جس کی بناء پر میں نے اسے واپس کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی تلاشی بے سود ہے۔“

”کوئی بیک چھوٹا تو نہیں۔“

”چائنا بیک..... میرا خیال ہے کہ وہی باقی بچا تھا۔ قدر نے کہا کہ وہاں جانا فضول ہے کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ رہتا ہے لیکن میں اسے واپس کرنے کے بعد وہاں بھی گئی تھی اور اب تم اچھل پڑو کیونکہ وہاں جے بی سنگھ کے نام پانچ ہزار روپے منتقل کئے گئے ہیں۔“

”کس نے منتقل کیا ہے۔“ انور نے بے تابی سے پوچھا۔

”مسٹر قدر احمد ایڈیٹر روزنامہ پوسٹ مارٹم.....!“

”وہ مارا.....!“ انور اچھل کر بولا۔ ”بنایا آصف کو مرغا۔“

”لیکن یہ معاملہ کیا ہے۔“

”بہت بڑا معاملہ رشو۔ یہ تو ایک دلچسپ اتفاق ہے۔ ورنہ میں بدھو بن گیا تھا۔“ انور نے کہا اور فون کی طرف لپکا۔

”ہیلو.....!“ وہ ریسپور کان کے قریب لے جا کر رشیدہ کو آنکھ مار کر بولا۔ ”ہیلو..... کیا تم میرا صاحب ہیں..... اوہ..... اچھا۔“ وہ ریسپور رکھ کر رشیدہ کی طرف مڑا۔

”میں نے قدر کے آفس میں فون کیا تھا۔ وہ گھر پر موجود ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ وہیں چائے پیئیں گے۔“

”آخر بات کیا ہے؟“

”جاؤ جلدی جاؤ۔“ وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔ ”بات پھر بتاؤں گا۔“

رشیدہ چلی گئی اور انور دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ تھوڑی
اس نے میز کی دراز سے ایک پتول نکالا اور اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد پھر دراز
کر دیا اور اب ایک چمکدار چاقو اس کی منھی میں دبا ہوا تھا۔
رشیدہ کپڑے تبدیل کر کے آگئی تھی۔ انور نے قد آدم آئینے پر الوداعی نظر ڈالا
کے لئے تیار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں موٹر سائیکل پر قدیر کے بنگلے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے
ٹیلی فون پوسٹ کے قریب انور نے موٹر سائیکل روک دی۔
”کیوں کیا بات ہے۔“ رشیدہ نے پوچھا۔
”آصف کو فون کروں گا۔“
”گھر ہی سے کر لیا ہوتا۔“
”خیال نہیں آیا تھا..... یہ ضروری ہے۔“

فون کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑے اور بقیہ راستہ جلد ہی طے ہو گیا۔ وہ پورے
تھے کہ قدیر باہر نکلا۔ شاید وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک
کیس لٹکا رکھا تھا۔
”ہیلو..... انور..... رشیدہ۔“ وہ انہیں دیکھ کر چکا۔ ”ادھر کیسے بھول پڑے۔ آؤ
میں نے اپنا جانا ملتوی کر دیا۔“
”کہیں باہر جا رہے تھے۔“ انور سوٹ کیس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اس میں کچھ
ہیں۔ آؤ آؤ..... چلو اندر چلو۔“

”ہم لوگوں نے ابھی چائے نہیں پی۔ میں دراصل تمہاری خیریت پوچھنے کے لئے
رشیدہ سے معلوم ہوا کہ کل تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ بھی کل کی تکلیف کا بہت بہت
”دوستوں کے لئے میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں
مسکرا کر بولا۔ ”میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں۔ نہ جانے کب سے تم سے کہہ رہا ہوں
جاسوسی ناول میرے اخبار کے لئے بھی لکھ دو گھر تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”مجھے شرمندگی ہے۔“ انور افسوس ظاہر کرتا ہوا بولا۔ ”میں ضرور لکھوں گا۔“
”ڈرا بینک روم میں آ کر بیٹھ گئے۔“

”اچھا یعنی تم لوگوں کے لئے چائے بناؤں۔“ قدیر اٹھتا ہوا بولا۔
”کیوں تم کیوں بناؤ گے۔“ انور نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ میں اتوار کو سب نوکروں کو چھٹی دیتا ہوں اور اس دن اپنا سارا کام خود ہی
لے رہا ہوں۔“

”بہت اچھا اصول ہے۔“ انور نے کہا۔

”تو رہنے دیجئے۔“ رشیدہ بولی۔ ”خواہ خواہ تکلیف کرنے سے کیا فائدہ۔“
”واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ صرف پانچ منٹ لگیں گے۔ میں ابھی آیا۔“ قدیر نے کہا اور
کمرے سے چلا گیا۔

”تو میں بھی چلتی ہوں آپ کی بددکرا لوں گا۔“

”نہیں نہیں آپ بیٹھے۔“ انور آہستہ سے بولا۔

درمیانی وقفے میں بالکل خاموشی رہی۔ رشیدہ کسی الجھن میں مبتلا تھی۔ وہ کبھی کبھی انور کی
لف سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد قدیر ٹرے میں چائے کا سامان لے کر آ گیا۔

”چائے تو لذیذ ہے۔“ رشیدہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔ ”انور نہایت بے دردی سے
ڈکڑیوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔“

”بہت لذیذ.....!“ وہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”اس وقت مجھے ۱۳ جون ۵۰ء کی حسین شام یاد
آ رہی ہے۔“

قدیر نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ انور کی طرف
دیکھنے لگا۔

”ابھی اور بھی بہت کچھ یاد آئے گا۔“

”بڑے سیکل تذکرہ.....!“ انور نے کہا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم نے اس رات کو رابعہ اور

جہیں سمجھتا ہوں کہ پرچہ میرے حوالے کر دو اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اسے کہاں رکھا ہے میں خود تلاش کر لوں گا۔ ورنہ دوسری صورت میں تم جانتے ہی ہو کہ ایک قتل کو چھپانے کے لئے اکثر کئی قتل کرنے پڑتے ہیں۔ وجہ کمار کا قتل شاید تمہیں یاد ہو۔

”مجھے سب کچھ یاد ہے۔“ انور بیزاری سے بولا۔ ”لیکن یہ پرچہ درج کیا ہے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”بیٹے انور تم مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ کل رات کو جب تم پروفیسر کی خواب گاہ کی تلاشی لے رہے تھے میں بھی اس کے مکان میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے بعد کو تمہارا تعاقب کیا تھا وہ میں ہی تھا۔ تم شاید مجھے پولیس کا سپاہی سمجھتے تھے اور اس کے علاوہ سمجھتے بھی تو کیا۔ میں باقاعدہ پولیس کی وردی میں تھا۔ شابش بتا دو جلدی سے کہ وہ پرچہ کہاں ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

انور تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

”اس پرچے کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔“

”تھمیر تھمیر بلائی نہیں ہوتی فرزند۔“ قدیر مسکرا کر بولا۔ ”تم مجھ سے دس پیسے بھی وصول نہیں کر سکتے۔ اگر تمہیں زندگی عزیز ہوگی تو آپ بتاؤ گے۔“

”لیکن شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میں انسپکٹر آصف کوفون کر کے یہاں آیا ہوں۔“ انور بولا۔

”اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے بچوں کی طرح بہلا سکتا ہوں۔“ قدیر نے کہا۔

”فی الحال میں جا رہا ہوں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لو اور تم رشیدہ اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ مفت میں اپنی اور تمہاری جان گنوائے گا۔“

قدیر چلا گیا۔

”آخر یہ سب کیا ہے۔“ رشیدہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

”یہ ایک وقتی تفریح ہے۔“ انور ہنس کر بولا۔ ”مجھے قتل کرنے کے لئے قیامت کے قریب ڈھال کا ٹکڑا ہوگا۔ اس سے پہلے تو مرتا نہیں۔“

سکیرٹری کا تعاقب کیوں کیا تھا۔“

”تا کہ تم جیسے حرام خوروں کا پیٹ بھرا جاسکے۔“ قدیر گرج کر بولا۔ اچانک اس کا زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ انور کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی رگوں کا خون ٹنڈ ہو گیا، میں عجیب قسم کی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا لیکن توازن ہزار سا۔ قدیر کے قہقہے کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا بھی صوفے پر ایک طرف لڑھک گئی تھی۔

اسے اس کا اندازہ نہیں ہوسکا کہ اسے کب ہوش آیا لیکن اس کا سویا سویا سا ذہن کمر ہا تھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہے اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف تھمتے ہوئے ہیں۔ میں تیز قسم کی چھین محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی آنکھیں اندر سے کی ہو گئیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک کٹھڑی میں کھڑا ہے اور اس کے دھڑلے لوہے کی دو موٹی سلاخوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر رشیدہ اس میں کھڑی تھی لیکن ابھی اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ ان سلاخوں کے درمیان جھول تھی۔ انور نے سلاخوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً دو فٹ رہا ہوگا اور اونچائی اتنی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ تھمتے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے رشیدہ کی جیغ سنی وہ ہوش میں آگئی تھی اور انور کو گھور رہی تھی۔ دفعتاً کٹھڑی کے باہر قدموں کی آہٹ سنی۔ قدیر ان کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں بیٹے انور صاحب بڑے عقلمند بنتے تھے۔“ قدیر گرج کر بولا۔ ”وہ پرچہ کہاں؟“

”کون سا پرچہ.....؟“ انور غصے کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ”میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتا۔“

”اچھا..... اب مجھے سبق پڑھانے چلے ہو۔ میں تم دونوں کی قبر کھود کر یہیں دفن کر دوں گا۔“

اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔“

”معلوم نہیں تم کیا بک رہے ہو۔“ انور گرج کر بولا۔

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم نے ابھی اُسے پولیس کے حوالے نہ کیا ہوگا۔“ قدیر اس کی سنی ان سنی کر کے بولا۔ ”کیونکہ تم پولیس کو اچانک متحیر کر دینے کے عادی ہو گئے ہو۔“

کی سگھ بھی سن لی تھی کہ وہ رات وہیں گزاریں گے۔ اس نے سوچا کہ پروفیسر اس وقت تنہا ہی ہوگا۔ اس لئے وہ خلاف توقع رات ہی کو تار جام سے واپس آ گیا تھا۔
”لیکن آخر اس نے پروفیسر کو قتل کیوں کیا۔“ رشیدہ بولی۔

”وہی بلیک میٹنگ کا چکر تھا۔ تم نے اس اخبار کے فائل تو دیکھے ہی ہیں تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ پروفیسر کے خلاف لکھ لکھ کر اس سے روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن شاید پروفیسر نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ تیرہ جون ۵۰ء کے شمارے میں قدیر نے اسے اس کا کوئی راز انشاء کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس پر پروفیسر نے اسے معاملات طے کرنے کے لئے سونا گھاٹ بلایا تھا۔ وہاں اتفاق سے ایک بڑھیا اس کی کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئی۔ پروفیسر نے دیکھ لیا اور اسے دھمکی دی کہ وہ پولیس کو اس کی اطلاع دے دے گا۔ قدیر گیا تھا اس سے روپیہ اینٹھنے اور خود مصیبت میں پھنس گیا؟ آخر کار ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ پروفیسر نے اس سے بڑھیا کو کار کے نیچے پھل دینے کا اقرار نامہ لکھوایا اور اسے دھمکی دی کہ اگر وہ کبھی اسے یا اس کے کسی دوست کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس اقرار نامے کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس نے اقرار نامہ نہایت احتیاط سے اپنی خواب گاہ کی ایک کرسی کے گدے میں سی رکھا تھا۔ قدیر نے اسی اقرار نامے کے لئے اسے قتل کیا تھا۔ ہو سکتا ہے بعد کو پروفیسر نے بھی اس سے روپیہ اینٹھنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال وہ قتل کی رات کو اقرار نامہ نہ پاسا لیکن شاید یہ جانتا تھا کہ وہ خواب گاہ نما میں کہیں محفوظ ہے۔ لہذا اس نے جی بی سنگھ کے فرضی نام سے خواب گاہ کا سامان خریدنے کی پیشکش کی اور پھر جب تم اس کے پاس اس لئے پہنچیں کہ وہ تمہیں جے بی سنگھ کا پتہ لگانے میں مدد دے تو وہ بھڑک گیا اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ تم اس کے اخبار کے فائل خواہ خواہ نہیں الٹ پلٹ رہی ہو۔ ہاں تو میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ رات کو پروفیسر کی خواب گاہ کی تلاشی ضرور لوں گا اور قدیر بھی اسی تاک میں تھا۔ وہ ایک پولیس مین کی وردی پہنے ہوئے تھا جب میں وہ اقرار نامہ نکال کر وہاں سے نکلا تو اس نے میرا تعاقب کیا مگر میں اسے پہچان نہیں پایا تھا ورنہ اس وقت مجھ سے یہ حماقت نہ ہوتی۔“

”اور وہ پتھر والا معاملہ.....!“

”لیکن وہ پرچہ کیسا ہے جس کا تذکرہ تم نے مجھ سے بھی نہیں کیا۔“
”قدیر نے اسی پرچے کے لئے پروفیسر کو قتل کیا تھا۔“
”اور وہ سیاہ پتھر.....!“

”وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کا تعلق پروفیسر کے قتل سے نہیں۔ میں ابھی تک کسی جاسوسی ناول کا خوبی ہیرا سمجھتا رہا تھا لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔“

”لیکن اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا ہوگا۔“ رشیدہ کراہ کر بولی۔

”چھٹکارا.....!“ انور نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ فی الحال خود اسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ چھٹکارے کی کیا صورت ہوگی۔

”تم نے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔ اگر تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو میں تمہیں یہاں طرح ہرگز نہ آنے دیتی۔“

”اور اگر آدم شجر ممنوعہ کے قریب نہ جاتے تو اس خرابے میں کیوں پھنستے۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتا تم ہمیشہ عورت ہی رہو گی۔“ انور منہ بنا کر بولا۔ ”بس غلطی ہوگی! مجھے کیا معلوم

کل اسی نے میرا تعاقب کیا تھا۔“

”لیکن یہ سب ہے کیا۔“

”بہت بڑا واقعہ..... انتہائی پیچیدہ۔ اگر قدیر سے جے بی سنگھ والی حماقت نہ ہو جاتی کا کوئی سراغ رساں مجرم کا پتہ نہ لگا سکتا۔“

”تو کیا اس نے یہ سب تمہیں پھنسانے کے لئے کیا تھا۔“

”نہیں قطعی نہیں! کہہ دیا کہ پتھر والا واقعہ اس قتل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جنہیں یاد ہے قدیر اس دن صبح غیر متوقع طور پر ہمارے یہاں پہنچا تھا اسے کسی طرح علم ہو گیا ہوگا کہ اس

میں آصف کو مجھ پر بھی شبہ ہے اسی لئے وہ سیکریٹری اور رابعہ کی کہانی لے کر پہنچا تھا۔ لیکن صاف صاف نہیں بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہ ضرور معلوم کر لوں گا کہ سیکریٹری

رات کو کہاں اور کس کے ساتھ تھا لہذا اس نے پھر مجھے یہ کہہ کر مطلع کر دیا کہ وہ اس میں پیسے نہیں بنانا چاہتا۔ وہ ان دونوں کو نشاط مگر جاتے دیکھ کر ان کے پیچھے لگ گیا تھا اور

یعنی تھا کہ وہ رسی کاٹنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ پھر سیدھا ہو گیا۔
سارے جسم سے پیپے کی دھاریں پھوٹ پڑی تھیں اور وہ مری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے مسکرا
کر رشیدہ کی طرف دیکھا اور رشیدہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ انور کی کلائی پر بہتے ہوئے خون کو دیکھ
رہی تھی۔ شاید چاقو لگ گیا۔

”رشو ڈارنگ روتے نہیں۔“ انور نے کہا اور پھر چاقو کو انگلیوں میں دبا کر الٹ گیا۔ اس
کی چمٹی ہوئی سانوں کے ساتھ رشیدہ کی سسکیاں بھی کوٹھری میں گونج رہی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا اور رشیدہ روتے روتے بے اختیار ہنس پڑی۔
انور نے دوسرا ہاتھ بھی کھول ڈالا اور پھر رشیدہ بھی آزاد ہو گئی۔ وہ اس کے بازوؤں میں پڑی سسکیاں
لے رہی تھی۔

”رشو ڈارنگ، چپ رہو۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔

”میرا بندر..... میرا بندر.....!“ اس نے دبی دبی سسکیوں کے درمیان کہا۔

”آؤ اب نکل چلیں..... مجھ میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں۔ یہ دیکھو۔“ اس نے اپنا
ہاتھ اس کے سامنے کر دیا جس سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ وہ دونوں
دروازے کی طرف بڑھ لیکن وہ باہر سے بند تھا۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ رشیدہ بولی۔

”فکرمات کرو..... کبھی تو کھلے گا۔“ انور نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر دروازے کے
نہایت ہی بیٹھ گیا۔ رشیدہ اپنی ساری چھاڑ کر اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی باندھنے لگی۔

انور بڑی فقاہت محسوس کر رہا تھا ایک تو ابھی تک اس نشہ آور چائے کا اثر باقی تھا دوسرے
اتھ سے کافی خون نکل گیا تھا اور پھر اس جتنا تک کی محکم..... دونوں گھٹنوں اسی طرح بیٹھے رہے۔
تقریباً تین بجے کوٹھری کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ انور نے رشیدہ کو دروازے
کے دوسرے طرف کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

کٹائی اتارنے کی آواز آئی۔ دونوں پٹ کھل گئے۔ انور اور رشیدہ پٹوں کی آڑ میں تھے
جیسے ہی تو در اندر داخل ہوا انور اس پر ٹوٹ پڑا۔ رشیدہ الگ کھڑی تھی۔ انور نے اسے پہلے ہی

”مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے متعلق تمہیں کچھ نہ بتا سکیں گا۔ میں نے گھوڑیاں
کر لیا ہے۔“
”گھوڑیاں؟“

”ہاں..... اسے بھول جاؤ۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ بچ جائیں گے۔“

”کیوں نہیں..... جب تک کہ میری شہ رگ نہ کٹ جائے میں یہی سوچتا رہوں گا
مر نہیں سکتا۔ میں نے آصف کو فون کر دیا تھا کہ میں قدیر کے یہاں جا رہا ہوں۔ قاتل وہ
اسے ثابت کر دوں گا۔“

”ممکن ہے وہ آکر لوٹ بھی گیا ہو۔ قدیر نے اسے پٹی پڑھا دی ہو خود اس کے
اس کا کوئی ثبوت ہے نہیں۔ تمہارے بیان کے مطابق اقرار نامہ تمہارے ہی پاس ہے۔“
”پھر بھی میں ہمت نہیں ہار سکتا“ انور نے کہا اور اپنے جوتے اتارنے لگا پھر اس
بیر کا موزہ دوسرے بیر سے دبا کر اتار دیا۔ بائیں بیر سے دائیں بیر کی موری اوپر ہوا
موزے میں اڑا ہوا ایک بڑا سا چمکدار چاقو نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ رشیدہ اسے حیرت
رہی تھی۔ انور نے داہنے بیر کا موزہ بھی اتار دیا۔

”لیکن اسے استعمال کس طرح کرو گے..... دونوں ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔
پر امید لہجے میں بولی۔

”ڈارون کی تصوری کے مطابق آدی پہلے بندر تھا۔“ انور نے مسکرا کر کہا۔ ”اور تم
ہو۔ بندر بیروں سے بھی ہاتھوں کا کام لے سکتے ہیں۔ دنیا کے سب بندر آدی ہو گئے مگر
تک بندر ہوں اور اس وقت تمہیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ میں کسی حال میں بھی
نہیں رہ سکتا۔ کئی سرکس والے اب تک یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے سرکس میں نوکری کر لوں
انور نے چاقو کا دستہ داہنے بیر کے انگوٹھے اور انگلیوں سے دبایا اور لوہے کی چم
مضبوطی سے پکڑ کر بندروں کی طرح الٹ گیا۔ وہ داہنے ہاتھ کی رسی کاٹنے کی کوشش کر
کلائی پر رسی کا تناؤ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہ رہ سکا۔

”یہاں سیاہ پکھراج سے تعلق رکھتا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ سر صغیر نے آہستہ سے کہا۔ پھر دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ گرج کر بولا۔ ”تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

”بڑے کی ضرورت نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔ ”آپ جانتے تھے کہ وہ سیاہ پکھراج چوری کا ہے لیکن پھر بھی آپ نے اسے وجہ کار سے خرید لیا تھا۔“

”جی..... جی.....“ سر صغیر ہلکایا۔

”جی ہاں..... اور یہی نہیں..... آپ نے اسی خوف سے اُسے ایک ایسی عورت کو دے دیا ناجس سے آپ کے ناجائز تعلقات ہیں۔“

”تم فضول بکواس کر رہے ہو۔“ سر صغیر پھر گرجا۔

”میرا اشارہ گھوریا توتھی کی طرف ہے۔“ انور نے مسکرا کر کہا ”لیکن آپ نے وہ پتھر اس کے پاس اختیار کھوایا تھا۔“

سر صغیر کچھ نہ بولا۔ وہ خاموشی سے تھوک نکل رہا تھا۔

”کہئے تو یہ بھی بتا دوں کہ وہ پروفیسر تیموری کے پاس کیسے پہنچ گیا تھا۔“

انور نے کہا اور سر صغیر کی طرف شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”تم نہ جانے کیا بک رہے ہو۔“

”گھبرائیے نہیں..... میں جو کچھ بھی بک رہا ہوں وہ میرے اخبار میں نہ چھپے گا۔ اُس پکھراج کی اصلیت سے صرف میں واقف ہوں۔ میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ ہاں تو اسی دوران میں پروفیسر تیموری نے نکولس کو قرض ادا کر دینے کا نوٹس دے دیا اور شاید آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ نوٹس بعد کو واپس بھی لے لیا گیا تھا؟ ہوا یہ کہ گھوریانے آپ کا سیاہ پتھر نکولس کو دے دیا کہ وہ اسے بطور ضمانت پروفیسر تیموری کے پاس رکھوا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پروفیسر نے نوٹس لے لیا۔ لیکن چونکہ ایک بہت ہی نایاب پتھر پروفیسر کے ہاتھ لگا تھا اس لئے اس نے ضروری سمجھا کہ وہ اس کی نمائش کر کے اپنے ہم پیشہ اور ہم شوق لوگوں پر رعب ڈالے۔ اس سلسلے

حملے میں گرا لیا تھا۔ مگر قدیر بھی کمزور نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری طاقت صرف کر رہا تھا۔ دفعتاً ہوئے زمین پر لوٹ رہے تھے۔ رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دفعتاً انور کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ رشیدہ گھبرا گئی۔ دفعتاً اسے وہ چاقو یاد آ کر انور وہیں کٹی ہوئی رسیوں میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ چاقو اٹھا کر دیوار نہ وار قدیر پر لوٹ پڑی۔ انور نہیں تھا پھر بھی قدیر اچھل کر پیچھے کی طرف آگرا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا انور اس پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد انور اور رشیدہ اسے رسیوں میں جکڑ رہے تھے۔

دوسری صبح کے اخبارات اس حیرت انگیز گرفتاری پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر گئے۔ لیکن صحیح واقعہ صرف انور کے اخبار نے چھاپا تھا اور اس کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ پھرنے لگی تھیں۔

وہ دن انسپکٹر آصف کے لئے یقیناً بڑا منحوس تھا۔ انور نے جی کھول کر اس کا معطل کیا۔ لیکن وہ سب کچھ خاموشی سے سہتا رہا۔ اور کرتا بھی کیا۔ بُری طرح شکست کھا گیا تھا۔

رشیدہ نے انور کو کئی بار مجبور کیا کہ وہ اسے سیاہ پکھراج کا راز بتا دے مگر ناکام رہی۔ اسی شام کو انور سر صغیر کی کوشی کے پائیں باغ میں بیٹھا سر صغیر کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنا کارڈ اندر بھجوا کر وہ لان پر بیٹھ گیا تھا۔ نوکر نے آ کر اس سے اندر چلنے کو کہا۔

”میں یہیں کھلے میں بیٹھنا پسند کروں گا۔“ انور نے کہا اور لان چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ نوکر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد سر صغیر پورٹیکو میں دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ لان کی آ رہا تھا۔ چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ انور کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سہنر انور میں اپنے دوست کے قاتل کی گرفتاری پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔“

نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”شکریہ.....!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”ذرا اس پر دستخط کر دیجئے۔“

اس نے اپنی جیب سے ایک چمک بک نکال کر سر صغیر کی طرف بڑھادی۔

”پانچ ہزار روپے۔“ سر صغیر اسے گھور کر بولا۔ ”کیوں اس کا کیا مطلب.....!“

جلد بہرے۔
جے کمار پہنچ گیا اور پھر شاید اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے وہ بھی اُس کے
تھ سے مارا گیا اور ہاں اس رات کو بھی آپ ہی نے وجے کمار کو وہاں بھیجا تھا کہ وہ اس پتھر کو
بارہ چالائے۔ ہاں تو جناب جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر کی لاش سے مڈ بھیڑ ہو گئی آپ خود
بچنے کہ وہ چند کتنی خطرناک تھی اور پھر جبکہ پروفیسر تار جام ہی سے انکپٹر آصف کو فون کر چکا تھا
اس کے مکان کی حفاظت کی جائے۔ اگر میں ذرا سا بھی چوک جاتا تو وہاں پکڑا گیا تھا۔“
رناؤش ہو گیا۔

”میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ ان معلومات کو اپنے ہی تک محدود رکھئے گا۔“ سر صغیر
کہا۔ ”رابعہ نے مجھے پہلے ہی اس کے متعلق بتا دیا تھا اور میں بہت پریشان تھا۔“
سر صغیر نے چیک پر دستخط کر دیئے۔

”شکریہ۔“ انور نے چیک بک تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”مطمئن رہئے میں
بک نہیں ہوں..... اچھا..... آداب عرض.....!“

چانک سے نکل کر وہ موٹر سائیکل کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ رابعہ نے اس کا راستہ روک لیا۔
”تو تم نے سب کچھ بتا دیا۔“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔
”مقتاتم نے بتایا تھا اس سے آگے نہیں بڑھا۔“
”یعنی کہ.....!“

”ہاں ہاں۔ میں نے ان سے یہ نہیں بتایا کہ تم نے وہ رات نشاط نگر میں سیکرٹری کے ساتھ بسر
کی۔“

”شکریہ..... بہت بہت شکریہ۔“

”نا.....!“ انور نے ہاتھ ہلایا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

ختم شد

میں اس نے چند لوگوں کو دعوت دی اس میں آپ اور آپ کی صاحبزادی بھی تھیں۔ کھانے
بعد اس نے پتھروں کی نمائش کی سیاہ پکھراج اس کے پاس دیکھ کر آپ کو بہت تاؤ آیا۔ رابعہ
آپ نے گھوریا سے باز پرس کی۔ بہر حال آپ اسے دوبارہ واپس لینا چاہتے تھے اس لئے
نے پھر وجے کمار کی خدمات حاصل کیں اور وہ اسے پروفیسر کے یہاں سے چالایا۔ دوسرے
دن صبح وہ پھر سب کے پاس سے غائب ہو گیا۔ اس بار اسے آپ کی صاحبزادی نے اڑایا
لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دراصل آپ ہی کی ملکیت تھا۔ وہ اسے پروفیسر کے یہاں دیکھو
تھی۔ اس لئے سمجھیں کہ شاید آپ اُسے چالائے ہیں۔ لہذا انہوں نے اسے آپ سے
کرواپس کرنے کی ٹھان لی اور اس سلسلے میں انہوں نے خاکسار کی خدمات حاصل کیں۔
نے جن حالات میں وہ پتھر اس کی جگہ پر پہنچایا وہ بہت ہی خطرناک تھے۔“
”میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں۔“ سر صغیر بے صبری سے بولا۔

”اور میں مبلغ پانچ ہزار روپے بطور حق لکھت طلب کر رہا ہوں اور ہاں شاید آپ یہ
پسند کریں گے کہ پروفیسر کولس کے ہتھوڑے سے کس طرح قتل ہوا.....؟ خیر سنئے..... آپ
تھے کہ شاید پروفیسر ہی نے اُسے دوبارہ آپ کے پاس سے غائب کر دیا۔ لہذا آپ پھر گھر
پاس پہنچے اور اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ اسی رات کو گھوڑا نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اس
پروفیسر کے یہاں سے چرا کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو واپس کر دے۔ وہ جانتی تھی کہ
اسے تجوری میں رکھتا تھا۔ لہذا وہ کولس کا ہتھوڑا لے کر وہاں پہنچی۔ اُسے یہ بھی علم ہو گیا
پروفیسر رات کو باہر ہی رہے گا۔ اس نے پروفیسر کی خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر
ہو گئی۔ لیکن وہ اچھی طرح سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اسے مکان کے اندر قدموں کی آہٹ
اور وہ گھبراہٹ میں ہتھوڑا وہیں چھوڑ کر کھڑکی سے کود گئی۔ آنے والا پروفیسر کا قاتل غا
وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پروفیسر گھر پر موجود نہیں ہے اس لئے اس نے نہایت
سے اپنی کنجیوں کا لچھا استعمال کیا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا اس
نے اقرار نامے کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اس کے کامیاب ہونے سے پہلے ہی پروفی
اور قاتل نے اُسی ہتھوڑے سے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ختم کرنے کے بعد بھاگ ہی

جاسوسی دنیا نمبر 17

بوڑھا تیغ زن

بھیانک جزیرہ

رات بھر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت سے پہلے ہی شہر کی دیہی اونچی عمارتیں ریت میں تبدیل ہو کر سمندر کے سینے میں سما جائیں گی۔

کوچہ و بازار ویران پڑے تھے۔ ہوا کے تیز جھونکے کھڑکیوں اور چابیوں میں شور مچاتے رہتے تھے۔ بادلوں کی گرج سے عمارتوں کی بنیادیں تک لرز رہی تھیں۔

رات بھر طوفان خوف و ہراس کے جھنڈے گاڑتا رہا۔

اور صبح شہر کی سب سے بارونق سڑک پر ایک لاش پڑی ہوئی دکھائی دی۔ لاش جس پر ایک تاریکی نہیں تھا بالکل ننگی لاش۔ جس کے چہرے کا سارا گوشت کاٹ لیا گیا تھا پیشانی پر بکھرے اے بالوں کے نیچے آنکھوں کی جگہ دو بڑے غار نظر آ رہے تھے۔ ناک کی ابھری ہوئی ہڈی کے نیچے ڈاڑھوں تک پھیلے ہوئے دانت جسم کی تانبے جیسی رنگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ کوئی بزرگ ہے۔

وہ راکبیر جنہوں نے اسے دیکھا تھا سوچ رہے تھے کہ اس دل ہلا دینے والے منظر کو وہ زندگی بھر نہ بھلا سکیں گے۔ لاش وہاں سے اٹھوا دی گئی اور پولیس والے قرب و جوار کی عمارتوں میں پھیل گئے۔ لیکن کسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا ہو سکتا ہے کہ مقتول نے ٹھیک اسی جگہ چھپ چھپ کر دم توڑا ہو۔ لیکن طوفان کی ہنگامہ خیزیوں میں کسے خبر ہوتی۔

عازش مئے پول ہوٹل کے سامنے ہوا تھا۔ انسپکٹر جگدیش نے ہوٹل کا رجسٹر چیک کیا قیام کرنے والے مسافروں میں چھان بین کی لیکن مقتول ان میں سے نہ تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ اور

(مکمل ناول)

سی آئی ڈی انسپکٹر آصف ڈائینگ ہال میں آ بیٹھے۔

”میں تو تنگ آ گیا ہوں اس شہر سے۔“ انپکٹر جگدیش اپنی پیشانی کا پیرہ بولا۔ ”روز ایک قتل دہرا ہے۔“

”یہ ایشیا کوئی غیر ملکی ہی تھا۔“ آصف نے کہا۔ ”اس رنگ کے لوگ اپنی طرف نہیں دیتے۔“

”غیر ملکی..... لیکن آخر کہاں کا۔“

”یہ بتانا دشوار ہے۔“ آصف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”قاتل نے صورت ہی بگاڑا،
غیر ملکی سفارتخانوں میں تفتیش کر لی جاتی۔“

”ایسے ہی موقعوں پر بے اختیار فریدی صاحب یاد آ جاتے ہیں۔“

”وہی کیا کر لیتا۔“ آصف منہ چڑھا کر بولا۔

”یہ مت کہو..... انہوں نے ایسے ایسے بے سروپا جرائم سے پردہ اٹھایا ہے جن فرشتوں کو بھی خبر نہ رہی ہوگی۔“

”ذہن پر ذرا سا زور دینے پر سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔“ آصف لا پرواہی سے بولا۔

”تبھی تو وہ لوٹا انور تمہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔“ جگدیش نے مسکرا کر کہا۔

”تم غلط سمجھے..... نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آ جاتا ہے۔“

”اس پر یا اس لڑکی پر.....!“ جگدیش اسے آنکھ مار کر مسکرایا۔

”کیا بات کر رہے ہو تم بھی..... وہ میری لڑکی کے برابر ہے۔“

”لیکن وہ ہے کون!“ جگدیش نے کہا۔ ”جب سے اس نے داراب کو قتل کر کے“
 سے دس ہزار روپے وصول کئے ہیں مجھے الجھن سی ہو گئی۔ آخر وہ ہے کون۔ کس خاندان۔
 رکھتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ شاید انور بھی اس سے واقف نہیں ہے۔“

”اور وہ دونوں ساتھ رہتے ہیں۔“

“ہاں”

انور مسکرا کر بولا۔

”مگر ریڈاٹین یہاں کہاں۔“ آصف نے کہا۔ ”امریکہ کی حکومت انہیں امریکہ جانے دیتی ہے۔“

”لیکن وہ لوگ جو میکسیکو میں آباد ہیں ان پر اس قسم کی پابندیاں نہیں۔ اس مہذب ہیں۔ خصوصاً اسپینی نسلوں کے لوگ عموماً بیرونی ممالک سے براہ راست تجارت رکھتے ہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں امریکی سفارت خانے میں تفتیش کرنی چاہیے۔“ نے کہا۔

”اب یہ تم جانو..... میں تو آج نیشنل رائفل کلب میں میکسیکو کے ایک باشندہ ونسٹ کی تیغ رانی کے کمالات دیکھوں گا۔ مطلب یہ کہ ڈان ونسٹ ایک مشہور تیغ رانی کلب کے شیرزمنوں سے آج اس کا مقابلہ ہوگا۔ اس نے اپنے شہر کے سارے چیلنج کیا ہے۔“

”اوہ.....!“ آصف اسے گھورنے لگا۔

”وہ بھی سرخ رنگ کا ہے۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا مسکراتا رہا پھر باہر دیکھا تم نے.....!“ آصف نے جگدیش کو مخاطب کیا۔

”میں کیا دیکھوں تم دیکھو..... اب بھی فریدی صاحب کے اعجاز کے قائل ہوں۔ سب انہیں کی صحبت کا نتیجہ ہے۔“

”فریدی.....!“ آصف منہ بگاڑ کر بولا۔ ”میرے سامنے کا لڑکا ہے۔ یہ بھی اب ہے کہ اسے اتنی شہرت نصیب ہوگئی ہے ورنہ وہ دراصل اس کا اہل نہیں۔ سراغ رسانی اصولوں سے تو واقف نہیں ہے۔“

”بس بنیادی لکیریں تو تم ہی بیٹا کرو۔ انہوں نے نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔“

”لیکن ان کا فن سے تو کوئی تعلق نہیں۔“ آصف نے کہا۔

”خیر اب تمہارا فن بھی دیکھ لیا جائے گا۔“ جگدیش سر ہلا کر بولا۔ ”مجھے اچھی

کہ تم انور کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔“
”پہرہ سرجھوٹ ہے۔“

”خیر ہوگا.....!“ جگدیش اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں نے اپنا کام مکمل کر ہی لیا ہے۔ دو تین دن مراہر ہاتھ مارنے کے بعد کیس تمہارے محکمے کے سپرد کر دیا جائے گا۔“
”تو پھر نیشنل کلب کی کیا رہی۔“ آصف بولا۔

”اگر انور سچ کہتا ہے تو ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔“

”لیکن ہم نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ مقابلہ کس وقت ہوگا۔“ آصف نے کہا۔
”میں جھوٹ نہیں کہتا۔“ جگدیش مسکرا کر بولا۔ ”سچ سچ تم اس لوٹے کی انگلی پکڑ کر چلتے۔ نیشنل کلب دور ہی کتنا ہے۔ ابھی چل کر معلوم کئے لیتے ہیں۔“

آصف جھینپ گیا۔

نیشنل رائفل کلب پہنچ کر وہ دونوں سیدھے سیکریٹری کے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ بند تھا اور کئی آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جگدیش نے آہستہ آہستہ دستک لی۔

”ظہور.....!“ اندر سے ایک آواز آئی اور جگدیش کی بھونکیں سکڑ گئیں۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا اور دونوں پٹ کھل گئے۔

کمرے میں تین آدمی تھے۔ ایک تو کلب کا سیکریٹری اور دو کوئی غیر ملکی جن کی رنگت تانبے کی طرح سرخ تھی۔ آصف کی آنکھیں چمکنے لگی۔

”اوہ آپ لوگ!“ سیکریٹری اٹھتا ہوا تھیرا آمیز لہجے میں بولا ”معاف کیجئے گا۔ میں کچھ اور کچھ..... تشریف رکھئے۔“

”میں نے سنا ہے کہ آج آپ کے یہاں کوئی مقابلہ ہونی والا ہے۔“ جگدیش نے پوچھا۔
”جی ہاں..... تیغ زنی کا مقابلہ.....!“ فیجر ان غیر ملکیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”سی نور ڈان ونسٹ..... میکسیکو کے باشندے ہیں۔ آج شام کو کلب میں اپنا تیغ زنی کے کمالات دکھائیں گے۔“

سکرٹری نے ان سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ دوسرے کا نام ڈان الفریڈ تھا۔
اکھڑی اکھڑی انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔
جلد لیش اصل موضوع پر آ گیا۔

”مسٹر ونسٹ میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف دوں گا۔“ جلد لیش نے انگریزی میں کہا۔
”کہئے.....!“ ونسٹ مسکرا کر بولا۔ ”یہ ایک قوی الجشہ اور طویل القامت آدمی، چوڑا
کشادہ اور سر کے بال سیاہی مائل سرخ تھے۔ آنکھیں ملی کی آنکھوں کی طرح، کبھی جلی اور کبھی
گہری سبز معلوم ہوتی تھیں۔ ناک سے ہونٹوں کے فاصلے کی زیادتی نے چہرے کو غیر متناسب
دیا تھا۔ ہونٹ پتلے تھے اور خاموشی کی حالت میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہونٹ بڑھانے
ہوئے ہے۔

”آپ یہاں کب آئے ہیں۔“

”پرسوں..... کیوں؟“

”آپ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”چار.....!“

”آپ میکسیکو سے سیدھے یہاں آئے ہیں۔“

”نہیں ہم انگلینڈ میں تھے۔ دراصل ہم دنیا کی سیاحت کیلئے نکلے ہیں اور تیج ذی۔“

منظاہرے کر کے اپنا سفر خرچ نکالتے ہیں۔ آپ کا ملک بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔“

”آپ کے تین ساتھی کہاں ہیں۔“

”دل کشا ہوٹل میں، ہم لوگ وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے تینوں ساتھی اس وقت بھی دل کشا میں موجود ہیں۔“

”کیوں.....؟“ اس کے لہجے میں تحیر تھا۔ ”ہم انہیں اس وقت وہیں چھوڑ کر آئے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ ہمیں ایک لاش ملی ہے ننگی لاش..... اس کا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے۔ رنگ

کے اعتبار سے مقتول آپ ہی کی طرف کا معلوم ہوتا ہے۔“

”اوہ.....!“ ڈان ونسٹ کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ ”لاش آپ کو کون

دیکھ لی۔“

”مجھ بچے۔“

”اب تو کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میرے چاروں ساتھی آٹھ بجے

ہی زندہ تھے لیکن میں اس لاش کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے وہ میرا ہم وطن نہ ہو۔“

تھوڑی دیر بعد جلد لیش انہیں ساتھ لے کر کو توالی پہنچ گیا۔ انہیں لاش دکھائی گئی۔

ڈان ونسٹ لاش کو دیکھ کر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

”بے شک یہ میرا ہی ہم وطن معلوم ہوتا ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“

”اس سے پہلے آپ کے ملک کا کوئی باشندہ یہاں دکھائی نہ دیا۔“ آصف نے کہا۔

”ہم لوگ امریکن سفارت خانے کی وساطت سے غیر ممالک کا سفر کرتے ہیں میرے

بال سے آپ اس کا پتہ وہیں سے لگا سکتے ہیں۔“

”وہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔“ آصف بولا۔

”اچھا تو اب میں جاؤں۔“ وہ ان سے ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ آج شام کو

پلوگ رائفل کلب کا پروگرام ضرور دیکھیں گے۔“

”ضرور..... ضرور.....!“ جلد لیش نے اسے یقین دلایا۔

اس کے چلے جانے کے بعد جلد لیش اور آصف ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں

دیکھنے لگے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی۔ امریکن سفارت خانے میں دریافت کرنے پر معلوم

لاگ ان پانچ آدمیوں کے علاوہ میکسیکو کا کوئی اور باشندہ شہر میں نہیں داخل ہوا۔

”یار آصف میری تفتی نہیں ہوئی۔“ جلد لیش نے کہا۔

”بھرم.....!“

”ہمیں آگے چلنا چاہئے۔“

”تو تم ان لوگوں کے پیچھے پڑ گئے۔“ آصف مسکرا کر بولا۔

”ہاں میں ان کے تین ساتھیوں کو بھی ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ دونوں بھی غیر ملکی ہی معلوم ہوتے ہیں۔“ جگدیش نے کہا۔
”مگر تمہارے سر پر غیر ملکی کیوں سوار ہو گئے ہیں۔“ آصف ہنس کر بولا۔

”جگدیش پھر کھانے میں مشغول ہو گیا۔“ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔

”اس قسم کی لاش سے پہلی بار میرا سابقہ پڑا ہے۔ کم بخت قاتل نے اس کے جسم پر کپڑے

پی رہے دیئے ہوتے۔“

”ظالم نے جوتے بھی تو نہ چھوڑے۔“ آصف کو انور کی آواز سنائی دی۔ جگدیش اسے

گھورنے لگا۔ لیکن انور اس کی پرواہ کئے بغیر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”اس وقت ہم لوگ کوئی حیرت انگیز خبر سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔“ آصف ہونٹ سکڑ

کر بولا۔

”مطمئن رہو۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں بھی اس کیس میں اپنی ناکامی کا صدقہ دل

سے اعتراف کرتا ہوں۔“

”میں پہلی بار تمہارے منہ سے ایسا جملہ سن رہا ہوں۔“ آصف کی آواز میں تحیر تھا۔

”جگدیش صاحب..... جس چیز کا تذکرہ کر رہے تھے وہ تفتیش کے سلسلہ میں آخری کڑی تھی۔

اس کے بغیر کوئی اقدام سہی لاحاصل ہوگا۔ کپڑوں پر کم از کم لائٹری کے نشانات ضرور مل جاتے۔“

”قطعاً.....!“ جگدیش کی آواز میں دبا سا جوش تھا۔

”اور یہ پانچویں ہی ہیں۔“ انور میکسیکو کے باشندوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”ظاہر ہے کہ مقتول ان میں سے نہیں ہو سکتا۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ یہ پانچویں ہی آدمی

امریکی سفارت خانے کی وساطت سے یہاں آئے ہیں۔“ وہ خاموش ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔

جگدیش کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے کلرک نے ایک لفافہ لا کر اس کی طرف بڑھا دیا

جس پر ایک کپڑا جگدیش تحریر تھا۔

”کس نے دیا ہے۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ کلرک شپٹا کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“ جگدیش اسے گھورنے لگا۔

”چلو بھئی! حالانکہ ابھی میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی میں دلچسپی لے

لئے مجبور ہوں۔“

”کیوں.....؟“ جگدیش نے پوچھا۔

”میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ صرف فریدی پر ہی دنیا نہیں ختم ہو گئی۔“

”اوہ.....!“ جگدیش ہنس کر بولا۔ ”ضرور ضرور..... اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو“

”شاید تم مذاق سمجھ رہے ہو۔“

”نہیں بھئی مذاق کیوں سمجھوں گا۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ فریدی صاحب

سے واپسی پر کوئی اور دھندا دیکھیں۔“

آرکچر پیچ کر انہوں نے سب سے پہلے ہوٹل میں قیام کرنے والوں کا رجسٹر دیکھا۔ پانچ

کے نام درج تھے۔ ایک وائر سے انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پانچوں اس وقت ڈائننگ ہال

موجود ہیں۔ دونوں نے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔

پانچوں ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ آصف اور جگدیش کنارے کی

پرچلے گئے۔ آصف نے لُچ کا آرڈر دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی کھانے میں مشغول ہو گئے۔

”ہیں تو پانچ ہی.....!“ جگدیش بولا۔

”بھئی میرا خیال ہے کہ ان کے پیچھے پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ آصف نے

”ہاں..... آں.....!“ جگدیش کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظریں دروازے کی

اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر توجہ کے آثار دیکھ کر آصف بھی مڑا۔

دروازے کے قریب انہیں دو آدمی دکھائی دیے ان میں ایک بوڑھا تھا اور دوسرا

بوڑھے کے چہرے پر بھورے رنگ کی فرنج کٹ ڈاڑھی تھی اور ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا

پر اطالوی طرز کی نیلی فلت ہیٹ تھی۔ اس نے اپنی بلیکس اس طرح سکڑ رکھیں تھیں جیسے آ

میں دھواں لگ رہا ہو۔ اس کا جوان ساتھی اس کی طرح سٹھیلے جسم کا نہیں تھا۔ اس کی ڈاڑھی با

اور آنکھوں سے مکاری جھلکتی تھی۔ بوڑھا اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا اور وہ اپنے

بھیج کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

انور نے کہا۔

”ٹیک ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملے بغیر میں ایسا اقدام نہیں کر سکتا۔“ جگدیش کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”آخر یہ مشورہ دینے والا کون؟“ آصف نے کہا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جگدیش کی نظریں پھر ان دونوں کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ زیبی کی میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ بوڑھے کا جوان ساتھی ہال میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو گھور رہا تھا۔

”میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار نہ کرتا۔“ انور نے جگدیش کو کہا۔

”آپ ہوتے ہی کیوں میری جگہ۔“ جگدیش منہ بنا کر بولا۔

”بہر حال یہ لکھ لیجئے کہ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

قل اس کے کہ جگدیش کچھ کہتا وہ چاچا تھا۔ جگدیش اور آصف بڑی دیر تک اس پر اسرار اڑھنگو کرتے رہے لیکن کسی خاص نتیجے پر پہنچنا امر محال تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر کلرک پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن نتیجہ وہی صفر۔

ہوٹل سے نکلے تو رائفل کلب کی ایک موٹر دکھائی دی جس پر سے شام کے مقابلے کے لئے ان ہو رہا تھا۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعے تجویز کیا گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ خاصی بھیڑ ہو جائے گی۔“ آصف بولا۔

”ہیڈ دلپس ہوگی۔“ جگدیش نے کہا۔ ”میرے خیال سے نشستیں مخصوص کر لی جائیں گی۔“

”میں اس کا انتظار کر لوں گا۔“

آصف چلا گیا۔ جگدیش کا ارادہ تھا کہ وہ بھی واپس جائے لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔ وہ ہال میں لوگوں کا چمچا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ ان لڑکیوں کی نظر رکھے گا۔ وہ پھر آکر لکچو میں واپس آ گیا۔ پانچوں غیر ملکی ڈائینگ ہال سے اٹھ گئے جگدیش نے پھر ہوٹل کا رجسٹر لے کر ان کے کمروں کے نمبر دیکھے اور اوپری منزل کی طرف

”میں لکھنے میں مشغول تھا۔“ کلرک نے کہا۔ ”کوئی اس طرح میری میز پر رکھ گیا کہ غلے خبر تک نہ ہوئی۔“

”اچھا.....!“ جگدیش نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور لفافہ کھولنے لگا۔ کانغہ پر کچھ ترانہ جسے پڑھ کر جگدیش کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں اس نے اسے میز پر رکھ دیا اور چاروں طرف تجسس آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

آصف کانغہ اٹھا کر پڑھ رہا تھا۔

”جگدیش، آصف اور انور صاحبان! مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ حضرات نے شاید ابھی تک طریقہ قتل پر غور نہیں کیا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس کے چہرے کا گوشت اس کے خم ہو جانے کے بعد کاٹا گیا ہے اس سے اس کی موت کا کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے بقیہ جسم پر کوئی اور دوسرا زخم بھی نہیں ہے۔ ذرا ذہن پر زور دیجئے مقتول کی بائیں پنڈلی پر آپ نے ایک بڑے رنگ کی دھاری دیکھی ہوگی وہ دھاری ہی دراصل اس کی موت کا باعث بنی تھی۔ آپ یقین کیجئے کہ پوسٹ مارٹم کے وقت اس دھاری سے ایک باریک سی سوئی برآمد ہوگی۔ زہر میں بجائی ہوئی سوئی۔ جان لینے کا یہ طریقہ میکینیکو کے قدیم باشندوں کی ایجاد ہے۔ اپنی جزل کرنے کے سینکڑوں سپاہی انہیں زہریلی سوئیوں کے شکار ہوئے تھے ان کے استعمال کا طریقہ بڑا دلچسپ ہے یہ پتلی پتلی نلیوں میں رکھی جاتی ہیں استعمال کے وقت انہیں ہونٹوں میں دبا کے پھونکے ہیں۔ اس عمل سے سوئیاں برق رفتاری سے اچھل کر شکار کے جا چبھتی ہیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ جاتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کو فوراً مطلع کیجئے کہ وہ اس دھاری کا خاص طور سے خیال رکھے اور پھر اگر آپ وہ سوئی برآمد ہو جانے کے بعد بھی قاتل یا قاتلوں کو نہ پکڑ سکیں تو میں آپ حضرات کو خودکشی کا مشورہ دوں گا۔“

”یہ کون ہو سکتا ہے۔“ جگدیش آہستہ سے بولا۔

”کوئی بھی ہو۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن ہمیں اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔“

”مطلب.....!“ آصف متفکرانہ انداز میں بولا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان سوئیوں اور نلیوں کے لئے ان کی تلاشی لینی چاہئے۔“

روانہ ہو گیا۔

کر دیا تھا۔ وہ دوسرے کو نے تک جا کر پھر واپس لوٹا۔ اس بار انور کی شرارت آمیز مسکراہٹ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”بڑے بدتمیز ہوتے ہیں یہ پرنگالی۔“

”لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“ جگدیش اُسے گھور کر بولا۔

”کیوں کیا یہاں ٹھلنا منع ہے۔“

”میں تمہیں منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔“ جگدیش نے خشک لہجے میں کہا۔

”لیکن میں تو آپ کو انسپکٹر پولیس سمجھتا ہوں۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”بہر حال یہ خبر

برے اخبار کے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوگی کہ پرنگال کے باشندے یہاں کے پولیس والوں

کو کام سمجھتے ہیں۔“

انور جانے کے لئے مڑا۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔!“ جگدیش آگے بڑھ کر بولا۔

انور پلٹ کر مسکرایا۔

”میں فریدی صاحب کی وجہ سے تمہارا خیال کرتا ہوں۔“ جگدیش نے کہا۔

”اور اسی وجہ سے میں بھی تم سے آج تک نہیں الجھا کہ فریدی صاحب تم پر مہربان ہیں۔“

جگدیش اُسے گھورتا رہا۔

”یہ خبر اخبار میں نہیں چھپے گی۔“ جگدیش سخت لہجے میں بولا۔

”اچھا دیکھا جائے گا۔“ انور نے کہا اور دم سروں میں سیٹی بجاتا ہوا نیچے چلا گیا۔

جگدیش کی بیزاری اور بڑھ گئی۔ اب وہ یہاں کسی قیمت پر بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں

تھوڑی دیر بعد وہ بھی منہ لٹکائے ہوئے نیچے اتر رہا تھا۔

جگدیش شام تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن ہزار تقاضوں کے باوجود

میں نہ مل سکی۔ اس دوران میں آصف نے اسے اطلاع دی کہ تیغ زنی کے مقابلے کے ٹکٹ مل

گئے ہیں اور میٹیں بھی مل گئی ہیں۔ جگدیش کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی قسم کی تفریح میں حصہ

سلسلہ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ انور کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا اور ہاں جانے پر اس سے

وہ ایک طویل راہداری سے گزر رہا تھا۔ جس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ یہ بھی

عجیب اتفاق تھا کہ ان پانچوں کو سلسلے وار خالی کمرے مل گئے تھے۔ جگدیش ان نمبروں پر اپنی

نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے مخاطب کیا

جگدیش مڑا جس بوڑھے کو اس نے ڈائینگ ہال میں دیکھا تھا اس کا جوان ساتھی اسے اشارہ

سے بلا رہا تھا۔ اس کے بلانے کا طریقہ اتنا بھدا تھا کہ جگدیش اپنی توہین محسوس کئے بغیر

رکا۔ بہر حال طوعاً و کرہاً پلٹا۔

”تم حجام ہو۔“ اس نے جھٹکے دار بھدے لہجے میں پوچھا۔ یہ سوال اس نے غلام

انگریزی میں کیا تھا۔

”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“ جگدیش گڑبڑ کر بولا۔

اس پر اس نے جگدیش کو الٹی سیدھی گالیاں سنا کر رکھ دیں قریب کے کمروں سے

بھی نکل آیا۔ اس نے اپنے جوان ساتھی کو کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا اور خود جگدیش سے معافی

کے بعد اپنے ساتھی کو ایک ایسی زبان میں ڈانٹنے لگا جو جگدیش کے لئے ناقابل فہم تھی۔

”آفسر مجھے افسوس ہے کہ اس نے آپ کو حجام کہہ کر مخاطب کیا۔“ اس نے جگدیش

انگریزی میں کہا۔ ”بات یہ ہے کہ یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ ہمارے ملک میں صرف حجام

قسم کا یونیفارم پہنتے ہیں۔“

”آپ کہاں سے آئے ہیں۔“ جگدیش نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ابھی

ناخوشگوار تھی۔

”ہم پرنگال کے باشندے ہیں۔“ بوڑھا خوش اخلاقی سے جھک کر بولا۔ پھر اپنے

مخاطب کیا۔ ”آفسر سے معافی مانگو۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ اس نے لٹھ مار دیا۔ ”اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا

اب بھی جگدیش کو حجام ہی سمجھتے پر مصر ہے۔“

جگدیش گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس بے موقع اور بے نیلے واقعے نے اس کا مزاج

بھیانک جزیرہ

ملاقات یقینی تھی۔ تقریباً چھ بجے آصف پہنچ گیا اور جگدیش کو شدید انکار کے باوجود اس کے ^{بلد نمبر ۵} درجہ لٹن کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ یہ وہی بوڑھا پریمکال تھا جس کے جوان ساتھی نے اُسے جانا پڑا۔

نیشل رائفل کلب کا وسیع میدان قاتلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اندر مختلف قسم کی کرسٹل درجوں کی تشکیل کی گئی تھی۔ نشستوں کا انتظام دائرے کی شکل میں کیا گیا تھا۔ وسط میں ایک گیارہ سو چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔

ٹھیک سات بجے ڈان ونسٹ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوارتھی۔
اناؤنسر نے مجمع سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے کلب کے چننا ہوٹل
”میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پریمکالی بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔“
”کھازا ناں؟“ ڈان ونسٹ کے لہجے میں تسخر تھا۔

زن ڈان دست سے مقابلہ کریں گے۔“ اس کے بعد اس نے کلب کے ایک ممبر کے ”نہیں..... اس کا اظہار میری تلوار کرے گی۔“ اعلان کیا۔ ایک نوجوان شمشیر زن شمشیر توڑا ہوا اسٹیج پر آیا اور تلواروں کے جھکڑے نظام ”مجھے منظور ہے۔“ ڈان دست مسکرا کر بولا۔ پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”آپ کو ہو گئی۔“

چند ہی لمحوں کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مقابلہ کرنے والے کی تلوار زمین پر ٹپکی اور ”نقطی نہیں..... قطعی نہیں!“ بے شمار آوازیں آئیں۔
 ونسٹ کی تلوار اس کے سینے پر۔

”بہت پھریتا ہے۔“ جلدیش نے آصف سے کہا۔
”مجھے تو امید نہیں کہ کوئی اسکے مقابلے میں کامیاب ہو سکے۔“ آصف آہستہ سے بڑبڑایا۔
آصف کا خیال صحیح تھا۔ اس نے صرف آدھے گھنٹے میں سارے مقابلہ کرنے والوں کو ہار دیا۔ وہ کسی تدبیر سے ان کے ہاتھ سے تلوار نکال دیتا تھا۔

”خواتین و حضرات۔“ ڈان و منٹ نے مجمع کو اپنی طرف مخاطب کیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں سے کوئی بھی مجھے زیر نہ کر سکا۔ میں نے آپ کے ملک کے تاج زنان کی بڑی تعریف تھی۔ لیکن میں آپ کو الزام نہ دوں گا۔ یہ فن آہستہ آہستہ ساری دنیا سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں کے لوگوں نے آتش گیر اسلحوں کی موجودگی میں بھی اس قدر حفاظت کی ہے۔ اور مجھے فخر کے ساتھ اس بات کا اعلان کرنے دیجئے کہ وہ حصہ میرا وطن ہے۔“

”یہ قطعی جھوٹ ہے۔“ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ لوگوں کی نظریں اس طرف اٹھیں۔
 ”خاتون و حضرات۔“ اناؤنسر کی آواز پھر سنائی دی۔ ”یہ مقابلہ آدھے گھنٹے تک ہوگا۔“

”مجمع نے اس اعلان پر پر جوش تالیاں بجائیں۔“

دوسرے لمحے میں دونوں کمواریں سموت رہے تھے۔ اچانک ڈان ونسٹ بوڑھے جھپٹا۔ البرونو نے اس کی کموار اپنی کموار پر روکی اور دونوں میں زور ہونے لگا۔ مجمع اس بڑے طاقت پر عیش عیش کر رہا تھا۔ دفعتاً البرونو حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹا اور ڈان ونسٹ زور میں کموار سمیت زمین پر آ رہا۔ مجمع نے تالیاں بجائیں ڈان ونسٹ جلدی سے اٹھا لیکن اس کے ہاتھ میں آدھی کموار تھی۔ اس نے جھلا کر ٹوٹی ہوئی کموار زمین پر پٹخ دی اور کموار کے لئے چیخا۔ بوڑھا اس انداز میں کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ دوسری کموار ڈان ونسٹ نے اسے للکارا لیکن اُس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ یہ حملہ خطرناک تھا۔ اگر البرونو ذرا سا بھی چوکتا تو کموار اس کے سینے سے پار ہو جاتی۔ اندازاً دونوں چیخنے لگے۔ تفریحی مقابلہ خون کی پیاس میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ریفری ان کے آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دونوں وحشیانہ انداز میں کمواریں چلا رہے تھے۔ خصوصاً ڈان ونسٹ جاے سے باہر ہو رہا تھا۔ دفعتاً پھر ایک زوردار جھنکار سنائی دی اور ڈان ونسٹ کی کموار بڑ گئی تھی۔ اب کی اس نے ٹوٹی ہوئی کموار بوڑھے البرونو پر پھینک ماری لیکن البرونو نے کموار پر روک کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار کی بجائے مسکراہٹ تھی۔

مجمع نے چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

ڈان ونسٹ گھونٹہ تان کر البرونو پر جھپٹا۔ بوڑھے نے اپنی کموار ایک طرف ڈال لی اس اثناء میں ڈان ونسٹ کا گھونٹہ اس کے جڑے پر پڑ چکا تھا۔ البرونو لڑکھڑاکر چار قدم ہٹ گیا لیکن اس کا جوابی حملہ اتنا سخت تھا کہ ڈان ونسٹ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ وہ اٹھ بیچے لڑھک کر بیہوش ہو گیا۔

البرونو کو بیشار آدمیوں نے گھیر لیا تھا اور اس کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ کچھ بوکھلایا بوکھلایا سا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ ”وہ پھر آ رہا ہے۔“ دفعتاً البرونو چیخا۔ لوگ دوسری طرف مڑے اور وہ نہایت متان

ان کے زغے سے نکل گیا لیکن انپکٹر جگدیش کی نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک طرف کی قات چاقو سے پھاڑ کر باہر نکل گیا۔ جگدیش اس کی طرف لپکا۔ وہ بھی اس راے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ جگدیش جھلا کر پلٹا لیکن اتنے بڑے مجمع میں کسے ٹوک سکتا تھا اور پھر ایسی صورت میں جبکہ اس نے کسی کو صریحی طور پر دیکھا نہیں تھا۔

بہر حال اس پر اس کا بہت برا اثر عمل ہوا۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کوئی اسے پکڑ کر نہیں رہا ہے اس بوکھلاہٹ میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ کچھ دیر قبل البرونو سے دو دہانے کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

جگدیش نے دیکھا کہ انور کچھ دور کھڑا مسکرا رہا ہے۔ جگدیش بوکھلا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”اور اس وقت اس کم بخت نے تمہاری ٹانگ پکڑ لی۔“ انور ہنس کر بولا۔

”کون تھا.....؟“ جگدیش نے بے اختیار پوچھا۔

”وہی جس نے دوپہر کو تمہیں حجام کہا تھا۔“

”اوہ..... اور تم کھڑے دیکھتے رہے۔“

”نہیں..... میں نے اسے پکڑنا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔“

”وہ گیا کدھر.....!“

”اگر یہی معلوم ہوتا تو پکڑ ہی نہ لیتا۔“ انور برا سامنے بنا کر بولا۔

جگدیش خاموش ہو گیا۔

”ڈان ونسٹ زندہ ہے یا مر گیا۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”مرا تو نہیں لیکن مردے سے بدتر ہے۔“ انور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”میں نے اتنی خوفناک تیغ زنی آج تک نہیں دیکھی۔“

”اس بوڑھے کے جسم میں آدمی کی روح نہیں معلوم ہوتی۔“

”مجھے یقین ہے کہ اگر ڈان ونسٹ قاعدے سے مقابلہ کرتا تو بوڑھا اپنے وعدے

مطابق آدھے گھنٹے میں ایک درجن کمواریں ضرور توڑ دیتا۔“ جگدیش نے کہا۔

”جلد بس نہ جانے کیوں تم سے ناراض ہے۔“
 ”تجربہ ہے۔“ انور حیرت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ”میں نے آج تک اس سے کوئی تعلق
 میں رکھا لیکن وہ پھر بھی ناراض ہے۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“
 ”خیر چھو! البرونو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“
 ”وہی جو کچھ تم نے میرے اخبار میں پڑھا ہے۔“
 ”اس سے تو کوئی خاص خیال واضح نہیں ہوتا۔“
 ”تو پھر بس یہ سمجھ لو کہ میرا کوئی خاص خیال نہیں۔“
 ”لیکن وہ پھر دونوں غائب کیوں ہو گئے۔“

”کون.....!“

”البرونو اور اس کا ساتھی۔“

”کہاں غائب ہو گئے۔“ انور دلچسپی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

انہوں نے کل رات ہی کو آکر لکچر ہوٹل چھوڑ دیا۔

”اور تم لوگ ان کی تلاش میں ہو۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”ہاں.....!“

”کیوں.....؟“

”ڈان ونسٹ کی حالت بہت اتر ہے۔“

”اچھا اس لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا کیا ہوا۔“

”انتہائی حیرت انگیز۔“ آصف دیدے پھرا کر بولا۔ ”اس پر اسرار خط کے مطابق سچ سچ
 اس کی پرنڈلی سے ایک زہریلی سوئی برآمد ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ موت کا باعث اس
 سوئی کا زہریلی ہوا ہے۔“

”اور پھر تم نے ڈان ونسٹ کے ساتھیوں کی تلاشی نہیں لی۔“

”اس وقت تو یہی کر کے آ رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔ ”آخر تم اتنے بد اخلاق کیوں
 ہو گئے ہو۔ اتنی دیر سے تم نے ایک بھی سگریٹ نہیں پیش کیا۔“

”مجھے تو اسے بوڑھا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ انور نے کہا۔ ”مجھے شرم ہے کہ میں
 نہیں ہے۔“

”کیا مطالبہ.....؟“

”اگر تم اپنے چہرے پر مصنوعی سفید ڈاڑھی لگا لو تو کیا سچ بوڑھے ہو جاؤ گے۔“

”مگر اس کی ڈاڑھی مصنوعی نہیں معلوم ہوتی۔“ جلد لیش نے کہا۔

”معلوم نہ ہونا اور بات ہے۔ تم نے کھینچ کر تو دیکھی نہیں۔“ انور کچھ سوچتا ہوا بولا۔

دوسرا اجنبی

دوسرے دن کے اخبارات تیغ زنی کے حیرت انگیز مقابلے کی نئی کہانیاں شہر
 تھے۔ پراسرار البرونو کی شخصیت پر نئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان
 اخبار اس معاملے میں سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک پولیس انسپکٹر کی ٹانگ کے
 جانے والا واقعہ بھی پیش کیا تھا۔ لیکن پولیس انسپکٹر کا نام نہیں ظاہر کیا تھا۔

تقریباً گیارہ بجے انسپکٹر آصف انور کے دفتر میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی انور
 پہنچا آصف اس پر جھپٹ پڑا۔

”یہ کس انسپکٹر کی داستان تھی۔“

”تم سے مطلب.....؟“ انور نے بے رخی سے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”تمہاری شامت تمہارے گرد منڈلا رہی ہے۔“ آصف بھنا کر بولا۔

”اپنا کام دیکھو..... میں ہرگز یہ نہ بتاؤں گا کہ وہ کون تھا۔“

”پولیس تم پر تو بین کا مقدمہ چلا دے گی۔“

”خیر اس صورت میں اس انسپکٹر کا گریبان پکڑ کر عدالت میں کھینچ لے جاؤں گا۔“

آصف بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک انور کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

انور نے سگریٹ کا ڈبہ دراز سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ہاں تو پھر کیا ہوا.....؟“

”کچھ نہیں..... ان کے پاس سے کوئی بھی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔“ انور نے سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

”ہوں.....!“ انور کی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”تو تم نے ان کا چھوڑ دیا۔“

”نہیں ایسا تو نہیں۔ ہماری نظریں اب بھی ان پر ہیں۔ لیکن اب ہم سارا زور البرونو کا لگانے میں صرف کر رہے ہیں۔“

”آخر کیوں؟“ انور اسے گھور کر بولا۔ ”کیا ڈان ونسٹ نے اس کے خلاف کوئی بیان دیا ہے؟“

”ہاں.....!“

”کیا.....؟“

”یہی کہ لندن میں اس کا جھگڑا چند پرتگالیوں سے ہو گیا تھا اور وہ ان کے جان کے آگے ہو گئے تھے۔ ڈان ونسٹ کا خیال ہے کہ البرونو انہیں میں سے ہے اور اس کے ساتھیوں کو بچانا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل والی لاش کا تعلق البرونو ہی ہے۔“

”وہ کیسے.....!“

”ڈان ونسٹ کہتا ہے کہ شاید اس نے میرے ساتھی کے دھوکے میں کسی اور آدمی کو ڈالا ہے۔“

”بات تو کچھ قاعدے کی معلوم ہوتی ہے۔“ انور نے کہا۔

”اور ان دونوں کا اس طرح غائب ہو جانا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ مجرم ہیں۔“ انور نے کہا۔

دوسرا سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

”کیوں.....؟“

”ان کا طریقہ کار کچھ عجیب سا ہے۔ اگر وہ واقعی مجرم ہیں تو ایسے مجرم آج تک

رہے نہیں گزرے۔“

”کیا تم داراب نے کو بھول گئے۔“ آصف نے کہا۔

”نہیں ہے لیکن داراب نے بھی کبھی بھرے مجھے میں کسی پولیس انسپکٹر کی ٹانگ کھینچنے کی نہیں کی۔“

”وہ تو کیا یہ حرکت البرونو نے کی تھی۔“

”نہیں اس کے ساتھی نے۔“

”کس کی ٹانگ پکڑی تھی۔“

”بہت اچھے۔“ انور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

”آخر بتا دینے میں کیا حرج ہے؟“

”میں غیر ضروری باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔“ انور نے قلم اٹھا کر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔

”مثلاً تم اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہو۔“

”قلمی نہیں۔“

آصف تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی بے تکلی ہانکنے کے بعد چلا گیا۔

انور رشیدہ کا انتظار کرنے لگا۔ وہ صبح سے غائب تھی اور ابھی تک آفس بھی نہیں آئی تھی۔ بلا اتفاق تھا کہ وہ انور کو بتائے بغیر اتنی دیر کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ دونوں تقریباً دو ڈھائی

ماہ ایک ساتھ رہتے آئے تھے اور ایک دوسرے کے عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن رشیدہ کا آج کا رویہ انور کو الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ پچھلی رات سے ہی کچھ بے

مناظر آ رہی تھی۔ انور اسے راتقل کلب والے مقابلے میں لے گیا تھا اور رات ہی سے اس کی بے چینی محسوس کر لی تھی۔ لیکن رشیدہ نے کافی استفسار کے باوجود بھی اس کی وجہ نہیں

کہی تھی۔ انور نے بارہ بجائے اور انور سارا کام چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ رشیدہ ابھی تک

مناظر آ رہی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اٹھائی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

رشیدہ کے فلیٹ کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ انور نے اطمینان کا سانس لیا۔

داراب کے کارناموں کیلئے جاسوسی دنیا کا چودھواں ناول ”تجربہ کار گیت“ جلد نمبر 4 ملاحظہ فرمائیے۔

رشیدہ اسے بدستور گھورتی رہی۔

”تم رات سے پریشان نظر آ رہی ہو۔“ انور پھر بولا۔ ”آخر کیوں؟“

”میری طبیعت رات سے ٹھیک نہیں ہے۔“

”خیر اب تم مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”چلو یہی سمجھ لو۔۔۔۔۔“ رشیدہ نے بے دلی سے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

انور تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

رشیدہ کا یہ عجیب غریب رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ انور خیالات میں ڈوبا ہوا ٹیلی فون

کا ڈائل گھمانے لگا۔ پھر ماؤ تھوٹے بیس میں آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے کے بعد بولا۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔ میں

انور بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ ذرا جلد لیش صاحب کو فون پر بلا دیجئے۔ اس نے ریسور میز پر رکھ کر ایک

سرکٹ سلگایا اور دھوکے کا گنجان بادل چھوڑتا ہوا پھر ریسور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔

جلد لیش صاحب۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں نے آپ کا نام تو نہیں دیا۔ آپ کے

علاوہ ہاں اور بھی کئی پولیس انسپکٹر موجود تھے۔۔۔۔۔ اور پھر اس طرح میں نے وہ کام کیا ہے کہ آپ

کو اس کا فائدہ بھی معلوم ہوگا۔۔۔۔۔ نہیں سمجھے۔۔۔۔۔ اچھا تو سمجھئے۔۔۔۔۔ میں نے یہ نہیں لکھا کہ ٹانگ

کھینچے والا البرونو کا ساتھی تھا۔۔۔۔۔ اس سے وہ دونوں اس بات پر مطمئن ہو جائیں گے کہ پولیس ان

کی طرف زیادہ دھیان نہ دے گی اور آپ اپنا کام کر گزریں گے۔ ہاں ہاں۔۔۔۔۔ لیکن اگر میری

نیت میں فور ہوتا تو میں حجام والے واقعے کو سب سے پہلے لکھتا لیکن میں نے اس کا ذکر تک نہیں

کیا۔۔۔۔۔ خیر ہاں تو البرونو اور اس کے ساتھی کا کیا رہا۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ ابھی تک لاپتہ ہیں۔۔۔۔۔ خیر اچھا

شکریہ۔“

انور نے ریسور رکھ دیا۔

سارا دن اسی الجھن میں گزر گیا کہ رشیدہ کی حالت میں غیر متوقع تبدیلی کا کیا باعث ہے

”اپنے کمرے ہی میں رہی۔ انور نے کئی بار اس سے ملنا چاہا لیکن دروازہ نہ کھلا۔ رات کو تقریباً

اٹھ بجے وہ باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفری بیگ تھا اس نے انور کے دروازے پر

دک دلی۔

دوسرے لمحے میں وہ دروازے پر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھڑک
سامنے کھڑی تھی لیکن خلاف توقع اس نے انور کا استقبال مسکراہٹ سے نہیں کیا۔ اس کے
پر زردی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تو پھر
ساری رات جاگتی رہی ہو۔

”رشو۔۔۔۔۔!“ انور تجیر آمیز انداز میں بولا۔

رشیدہ خاموش رہی۔

”تم کہاں تھی؟“

رشیدہ تھوڑی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”ابھی نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں؟ کیا کوئی خاص بات۔۔۔۔۔؟“

رشیدہ نے سر ہلا دیا۔

”آخر کیا۔۔۔۔۔؟“

”کہہ تو دیا کہ ابھی نہیں بتا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اندیشے محض وہم ہوں۔“

”پھر تم نے پہیلی بھجوا دی۔“

”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی مگر ابھی نہیں۔“

”اور اس وقت الجھن میرا خاتمہ کر دے گی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ رشیدہ کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”تمہیں برا

پرواہ کب سے ہو گئی۔“

”جب تم ہنستی ہو تو مجھے ذرہ برابر بھی تمہاری پرواہ نہیں ہوتی۔ لیکن جب اداس ہو

میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔“

”تم آج آدمیوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“ رشیدہ پھر مسکرائی۔

”رشو۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں میں آج تم سے لڑنے کے لئے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ رشیدہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

”یہی تو میں نہیں جانتا۔“

دوسرے لمحے میں انور دروازے میں کھڑا اسے حیرت سے گھور رہا تھا۔

”یہ کیا خط ہے۔“

”میں باہر جا رہی ہوں۔“

”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

”میں ایک بہت بڑے خطرے کی بوسنگھ رہی ہوں۔“ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان بڑھاتی ہوئی۔

کر بولی۔

”رشو میں کان اکھاڑ لوں گا“ انور نے کہا لیکن رشیدہ پر اس جملے کا کوئی اثر نہ ہوا۔

انور سمجھا تھا کہ وہ پھر اپنے پرانے موڈ میں آ جائے گی مگر اس کے چہرے کی زردی میں کچھ

قسم کا تغیر نہ ہوا۔

”اوبابا تم کچھ بتاؤ نا.....؟“ انور چڑ کر بولا۔

”وقت نہیں ہے۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے کہ سب وہم ہو۔ لیکن بڑے

احتیاط برتنی پڑے گی۔ میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی..... مگر.....!“

باربے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رشیدہ چونک کر مڑی۔ آنے والا رک گیا۔

اندھیرے میں تھا اور رشیدہ کے چہرے پر انور کے کمرے کی روشنی پڑ رہی تھی۔

”کون ہے۔“ انور نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”جی نورارومولی.....!“ ایک تیز قسم کی آواز سنائی دی اور رشیدہ لڑکھڑا کر انور کے بازوؤں

میں آ رہی۔ وہ مڑی طرح کانپ رہی تھی۔

”انور..... جلدی..... انور.....!“ وہ انک انک کر بولی۔ انور نے اسے کمرے کے اندر

کھینچ کر ایک صوفے پر ڈال دیا اور خود دروازے پر جم گیا۔

”تم کون ہو.....؟“

آنے والا اندھیرے سے روشنی میں آ گیا۔ یہ ایک پستہ قد مگر مضبوط جسم کا آدمی تھا۔

اس کی رنگت دیکھ کر بے اختیار چونک پڑا۔ تانبے جیسا سرخی مائل رنگ مگر وہ ڈان ولسٹ کے

ساتھیوں میں سے نہیں تھا۔ انور کو ان سب کی صورتیں بخوبی یاد تھیں۔

”دوست.....!“ اس نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

”یعنی.....؟“ انور نے سوالیہ انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

”مجھے اندر آنے دو میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔“ اس نے کہا اور کمرے میں گھس کر دروازہ

بند کر لیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ انور کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ لیکن دوسرے ہی

لمحے میں اس کا ہاتھ میز پر پڑے ہوئے چاقو پر تھا۔

”جہاں کھڑے ہو وہاں سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرنا۔“ انور تیز لہجے میں بولا۔ ”میرا

بہنہ کبھی خطا نہیں ہوا۔“

اجنبی نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

”جی نورارومولی.....!“ وہ پھر آہستہ سے بولا۔

رشیدہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اجنبی کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش

کر رہی ہو۔

”تم کون ہو۔“ انور پھر گر جا۔

”دوست..... میں دوست ہوں..... ابھی سی نورار خود بتائے گی۔“ اس نے اپنے چہرے پر

لہجہ بھری مٹھی مٹھیں اتار دیں۔

”ڈیگاریکا.....!“ رشیدہ آہستہ سے بولی اور تیزی سے اس کے قریب آ گئی۔ انور کے

نہ سے چاقو پھوٹ گیا۔

اجنبی رشیدہ کے سامنے دوڑا نو ہو گیا۔

انور کی حیرت اپنی انتہائی منزلیں طے کر رہی تھی۔

ان دونوں نے ایک ایسی زبان میں گفتگو شروع کر دی جس کا ایک لفظ بھی انور کی سمجھ میں

نہ آ سکا۔

رشیدہ پہلے تو ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی پھر اچانک خوفزدہ نظر آنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ انور کی طرف مڑی۔

”انور اب تمہیں بہت جلد میرا راز معلوم ہو جائے گا لیکن ہم اس وقت جلدی میں ہیں۔“

لے اچھا اور یک لخت البرونو پر جا پڑا۔ بوڑھا اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن وہ پھر بھی سنبھل گیا۔ دوسرے لمحے میں اس کی فولادی انگلیاں انور کی کلائیوں میں بُری طرح چھ رہی تھیں۔ بوڑھے کی نشست میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے انور کو اپنی انگوٹھوں میں جکڑ لیا اور اب وہ اس کا سر اپنے ہاتھ میں لئے اس طرح اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی چھ ماہ کا شیر خوار بچہ ہو۔

”شور مچانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے انگریزی میں بولا۔

انور پر سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب زندگی بھر اس کی ٹانگوں کی ریت سے آزاد نہ ہو سکے گا۔

”البرونو تمہارا دشمن نہیں۔“ وہ پھر بولا۔ ”اگر وہ دشمن ہوتا تو یہاں ٹھہرتا ہی کیوں؟ تم کوئی فائدہ نہ کرتے ہو۔“

البرونو نے گرفت ڈھیلی کر دی اور انور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ البرونو کی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور پہلے کی طرح ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھیں جذبات سے عاری اور سرد تھیں۔ انور کے سارے جسم میں سنسنی کا دوڑ گئی۔ البرونو نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں البرونو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں جانتا ہوں تم جو کچھ سوچ رہے ہو۔“ البرونو بولا۔

”کیا...؟“ انور نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”نہی کہ کاش اس وقت تمہارا دوست انسپکٹر آصف یہاں آ جاتا۔“

انور بے اختیار چونک پڑا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر البرونو سے اس کا کیا تعلق اور وہ لکے بازے میں اتنی معلومات کیسے رکھتا ہے؟

”تمہیں یہاں میری موجودگی پر حیرت ہو رہی ہے۔“ البرونو پھر مسکرایا۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ دفعتاً انور اٹھ کر چیخا۔

”ممبر... ممبر...!“ البرونو نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”اگر میں موقع پر نہ پہنچ جاتا تو تم

میں اس وقت جا رہی ہوں کل کسی وقت تمہیں میرا ٹھکانہ معلوم ہو جائے گا۔“

انور نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

رشیدہ اور وہ اجنبی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے اور پھر اچانک ایسا معلوم ہوا کہ پھر بہت دیر کی چیز بار بجے پر گر پڑی ہو۔ انور جھپٹ کر باہر نکلا لیکن دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں کے قریب بجلی سی چمکی اور وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

نہ جاننے کتنی دیر بعد وہ اندھیروں کے تانے بانے سے آزاد ہو سکا۔ کئی بُری طرح رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے کا ارادہ کیا لیکن اچانک اس کا ذہن جاگ اٹھا اور کچھ دیر قبل پیش آئے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اس نے بڑا اور پراسرار اجنبی کو باہر جاتے دیکھا تھا پھر ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی پر اچانک حملہ کیا گیا ہو۔ پھر قہر سے باہر نکلا تھا اور شاید وہ کسی کام کا ہی تھا جس نے اس کے سر کی ہڈیاں تک ہلا دی تھیں۔ انور نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ہی کمرے میں تھا لیکن پھر آنکھیں بند کر لیتی پڑیں اور وہ سوچنے لگا کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ بوڑھا البرونو صوفے پر بیٹھا ٹیبل لیپ کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

انور کا سر چکرانے لگا۔ آخر یہ بوڑھا آدمی ہے یا بھوت۔ لیکن اسکی موجودگی کا مطلب اسی نے اس پر حملہ کر کے بے ہوش کر دیا تھا۔ انور کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ کیا رشیدہ لئے خائف تھی وہ پراسرار اجنبی کون تھا جسے دیکھ کر پہلے تو وہ بُری طرح خائف ہو گئی تھی لیکن اس انداز میں گفتگو کرنے لگی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی تھی۔ رنگت کے اعتبار سے اس کا ڈان و نسٹ ہی کا ہم وطن معلوم ہوتا تھا لیکن رشیدہ اپنی زبان کیا جانے۔ وہ اس طرح زبان میں گفتگو کر رہی تھی جیسے وہ اس کی مادری زبان ہو۔ اس کا ذہن پھر البرونو کی طرف کیا سچ مچ البرونو ہی اس غیر ملکی کا قاتل تھا مگر کیوں؟ کیا اس وقت اس نے رشیدہ اور اس کی بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور تو کیا، اس نے رشیدہ کو قتل کر دیا ہوگا۔ رشیدہ کو۔

انور کے دماغ میں آنندھیاں سی چلنے لگیں اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔ البرونو کتاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں ایک موٹا سا سگڑ تھا جو شاید بچہ چکا تھا۔ انور

کہیں اور ہوتے۔“

”وہ لڑکی کہاں گئی؟“ انور بے صبری سے بولا۔

”یہ ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ میں خود نہیں جانتا۔ لیکن وہ خود نہیں گئی زبردستی سے جانا ہے۔“

انور پھر اُسے گھورنے لگا۔

”دیکھو بوڑھے، میں بہت خراب آدمی ہوں۔“ انور بولا۔

”وہ تو تمہاری صورت سے ظاہر ہے۔“

انور پھر جھلا کر اٹھا۔

”دیکھو لڑکے! تم شاید اپنے ہاتھ پیر تروا کر ہی رہو گے۔“

”میں ڈان ولسٹ نہیں ہوں۔“ انور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”میں تمہارا غرور توڑ دوں گا۔“

البرونو نے قہقہہ لگایا۔

”جلد بازی ٹھیک نہیں مسٹر انور۔“ وہ تھوڑی دیر بعد سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے اطلاع ملی

کہ جرائم کی دنیا میں تم ایک بہترین دماغ ہو لیکن شاید وہ محض افواہ تھی۔ تم ایک معمولی آدمی

بھی بدتر معلوم ہوتے ہو۔“

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انور نے اٹھنا چاہا۔

”غصہ کرو.....!“ البرونو اٹھتا ہوا بولا۔ ”شاید یہ فون میرے لئے ہے۔“

اس نے ریسور ہاتھ میں اٹھالیا۔ ”ہیلو..... ٹھیک..... میں یہاں دس منٹ تک اور

کروں گا..... جلدی کرو۔“

اس نے ریسور رکھ کر بجھا ہوا سگار سلگایا اور دیوار سے لگی ہوئی ایک تصویر پر

جمادیں۔ انور بُری طرح بوکھلایا تھا۔ نہ جانے وہ کیوں خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

ساری تیزی اور طراری رخصت ہو گئی تھی۔ وہ بوڑھے کی بے پناہ طاقت کا بھی اندازہ لگا

اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ برق رفتار ہے۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ انور نے پھر اٹھنا چاہا لیکن بوڑھے کے

اٹھنا یہ تینا آٹھ کارپو الور دیکھ کر ہمت جواب دے گئی۔ بوڑھا رپو الور کا رخ انور کی طرف

ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا لیکن وہ داہنے پٹ کی آڑ میں ہو گیا۔

آنے والا انسپکٹر آصف تھا۔ انور اسے اشارہ کرنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ دفعتاً اُسے

البرونو کی آنکھوں میں سفاکی کی جھلک دکھائی دی اور ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کی گردش

کرنے کی صلاحیت ایک لحظہ مفقود ہو گئی ہو اور اب وہ زندگی بھر اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر

سے نہ ہٹا سکے گا۔

”اوہو.....!“ آصف چپک کر بولا۔ ”کیا بت بننے کی مشق کر رہے ہو۔“

اس کے اس جملے پر بھی انور کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور پھر آصف بے خودی میں

بچے کی طرف مڑا۔ اس کا منہ پھیل گیا۔

”شش.....!“ البرونو پرسکون لہجے میں بولا۔ ”شور نہیں..... ورنہ یہ رپو الور تم سے زیادہ

شور مچاتا ہے۔“

آصف کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے حکمانہ لہجے میں بولا۔

آصف بیٹھ گیا۔ کبھی وہ انور کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی البرونو کی طرف۔

”مسٹر آصف کی جیب سے پستول نکال کر سامنے میز پر رکھ دو۔“ البرونو نے انور سے کہا۔

انور نے قہقہہ کی..... لیکن میز کے قریب پہنچ کر وہ دفعتاً گھوم پڑا۔ البرونو کے رپو الور سے

ایک شعلہ نکلا اور انور کے ہاتھ میں دبا ہوا رپو الور اچھل کر دور جا گیا۔

”میں اپنے رپو الور میں بے آواز کا تو س استعمال کرتا ہوں۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔ ”میں

ٹورنٹس پسند کرتا۔“

انور گھبرا کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن البرونو کی گولی پستول کی نال پر پڑی تھی اور

اس کا ہاتھ محفوظ تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ البرونو کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں یہاں دوسری کال کا انتظار

کر رہا ہوں مجھے تم لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

نبرہ
”بچہ پرس نے حملہ کیا تھا۔“
”میں یہ نہیں بتا سکتا۔“

”اس طرح تم ایک بہت بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔“ آصف نے کہا۔
”جرائم تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔“ البرونو لا پرواہی سے بولا۔
”اتنے میں پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ البرونو نے بڑھ کر ریسور اٹھالیا لیکن ریوالور کا رخ ابھی آصف اور انور ہی کی طرف تھا۔

”ہیلو.....!“ وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”تم بہت دیر کر رہے ہو۔ کہو کیا رہا..... وہ ٹھیک ہے
نے کی امید تو نہیں..... ٹھیک بہت اچھا..... تم وہیں ٹھہرو..... میں ابھی آتا ہوں۔“
البرونو ریسور رکھ کر ان کی طرف مڑا۔
”اچھا دوستو! شب بخیر۔ تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ چلو جلدی
برے پاس وقت نہیں ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں قتل بھی کر سکتا ہوں ٹھیک..... ہاں اسی
کڑے رہو۔“

البرونو نے کمرے سے نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پھر بارے میں پچھلی ہوئی
میں اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔
آصف دروازے کی طرف جھپٹا۔

”بیکار ہے۔“ انور مردہ دلی سے بولا۔ ”باہر سے دروازہ بند کر گیا ہے۔“

”بہر حال اس وقت بڑی بے عزتی ہوئی۔“ آصف نے پریشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔
”ابھی اس سے بھی زیادہ بے عزتی ہونی باقی ہے۔“ انور خشک لہجے میں بولا۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”اُس کمرے سے نکلنے کے لئے شور مچا کر خلی منزل والوں کو بلانا پڑے گا۔“

”یہ کہہ کر آصف سناٹے میں آ گیا۔ کم از کم اس عمارت کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔
”جیو جی جیو۔“ انور راسمانہ بنا کر بولا۔ ”ورنہ رات تمہیں یہیں بسر کرنی پڑے گی۔“
”یاریہ تو بڑا برا ہوا۔“

آصف متحیرانہ انداز میں البرونو کو دیکھ رہا تھا۔ انور بے بسی سے بیٹھ گیا۔

”لیکن تم..... یعنی کہ تم.....!“ آصف اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

”اس کمرے میں میری موجودگی کا سبب پوچھنا چاہتے ہو۔“ البرونو مسکرایا۔

آصف جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ڈان ونسٹ کی حالت ابتر ہے۔“

”تو پھر اس سے کیا۔ وہ ایک مقابلے کے دوران زخمی ہوا تھا۔ سب سے پہلے اسی نے؛

پر جارحانہ حملہ کیا تھا۔ خیر ہوگا میں کسی قسم کی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتا۔ مجھے اطمینان ہے کہ جب

وقت چاہوں گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے صرف ڈان ونسٹ کی موت کا انتظار ہے۔“

”یہ تم ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کے سامنے کہہ رہے ہو۔“ آصف اسے گھور کر بولا۔

”میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“ البرونو نے مسکرا کر کہا۔

انسپکٹر آصف کو زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہو جب کسی مجرم نے اس سے

قسم کی گفتگو کی ہو۔ وہ انور سے بھی بھوکھلایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

”لیکن تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔“ آصف ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

”میرا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔“ البرونو نے ریوالور کا رخ آصف کی طرف پھیر دیا۔

”بیٹھ جاؤ.....!“ انور جھٹاکر بولا۔ پھر البرونو سے کہنے لگا۔ ”اگر یہ صحیح ہے کہ تم اس

ابھی قیام کرو گے تو میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ.....!“

”نمئی بات..... نمئی بات۔“ البرونو اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”ذرا ذرا سی باتو

تاراض نہیں ہوا کرتے۔“

”لیکن یہاں اس وقت اس کی موجودگی کا مطلب۔“ آصف نے انور سے پوچھا۔

”ان لوگوں نے رشیدہ کو اغوا کر لیا ہے۔“ انور دانت پیس کر بولا۔

”یہ بکواس ہے۔“ البرونو نے تلخ لہجے میں کہا۔

”پھر وہ کہاں گئی۔“

”کہہ دو یا کہہ میں نہیں جانتا۔“

”میں اس کم بخت سے سمجھ لوں گا۔“ انور بھٹا کر بولا۔

”وہ تو بعد کی باتیں ہیں..... اس وقت کیا کیا جائے؟ اگر چیخ چیخ کر لوگوں کو بلائے۔
خواہ مخواہ احق بننا پڑے گا۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”رشیدہ کا کیا قصہ ہے۔“ آصف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”خود میں ہی نہیں سمجھ سکا تمہیں کیا بتاؤں گا۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس وقت تم آگئے۔“

”ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں۔“

”اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔“

”کون.....؟“

”چائے والا.....!“ باہر سے آواز آئی اور آصف کا چہرہ چمک اٹھا۔

”باہر سے بند ہے کھول لو بھئی۔“ آصف پر مسرت لہجے میں بولا۔

دروازہ کھلا اور قریب کے ہوٹل کا ایک لڑکا کڑے میں چائے لئے ہوئے داخل ہوا۔

”تم سے چائے کے لئے کس نے کہا تھا۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

لڑکا ہنسیا۔

”ایک صاحب منے۔“

”کون تھا.....؟“

”میں پہچانتا نہیں لیکن انہوں نے آپ کا پتہ بتایا تھا۔“

”اس کا حلیہ.....!“ آصف نے پوچھا۔

”بوڑھے تھے، ڈانڈھی تھی۔ ہرے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔“

انور آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا اس نے تمہیں سے کہا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں..... نیجر صاحب سے میں قریب ہی کھڑا تھا۔“

”کیا تم انگریزی سمجھ لیتے ہو۔“

”نہیں نیجر صاحب نے مجھے بتایا تھا، وہ صاحب چائے کے پیسے بھی دے گئے ہیں۔“

”اچھا..... اچھا تھوڑی دیر بعد برتن لے جانا۔“ انور نے کہا۔

لڑکا چلا گیا۔

”یار اس بوڑھے نے سچ کچ دماغ خراب کر دیا ہے۔“ آصف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”میں

بڑے بڑے مجرموں کا سامنا کیا ہے..... لیکن یہ بوڑھا.....“ انور سگریٹ سلگاتے سلگاتے

ہو چنے لگا۔

”کیوں.....؟ کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں! رشیدہ کا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”آخر بات کیا ہے۔“ آصف نے پوچھا۔

”ٹھہرو.....!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”بوڑھا ہمیں مستقل طور پر بیوقوف بنائے جا رہا ہے۔ کیا

چائے پیو گے؟ عجیب احق ہو۔ اٹھو جلدی کرو۔“

آصف کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ آصف اس کے کہنے پر عمل تو کر رہا تھا لیکن بے دلی

اس نے کئی بار انور سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن انور جلدی میں تھا۔ اس نے نیچے آ کر گیراج

ہوڑ سائیکل نکالی اور دونوں اس پر بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔

”کہاں چلو گے؟“ آصف نے پوچھا۔

”ٹیلی فون آکھیج.....!“

”کیوں.....؟“

البرٹو کی دوسری کال ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر آئی تھی۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ

ہاں سے آئی تھی۔

”معلوم تو ہو جائے گا۔“ آصف نے کہا۔ ”لیکن بوڑھا بہت چالاک ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”وہ اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتا جس سے پکڑے جانے کا امکان پیدا ہو سکے۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔ تم اندر جا کر پتہ لگاؤ۔ میرا فون نمبر تو جانتے ہی ہو۔“ انور نے کہا۔
ٹیلی فون آپکچنگ کے قریب پہنچ کر انور نے موٹر سائیکل روک دی اور آصف اتر کر گیارہ
میں داخل ہوا۔

انورنٹ پاتھ پر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رشیدہ کے متعلق آصف کو بتائے یا نہ بتائے۔ خودیڑ
کے رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ کون سی ایسی بات تھی جس کے لئے رشیدہ
راز داری سے کام لے رہی تھی اور یہ بھی خفیہ ہے کہ اس پر اسرار اجنبی کے ساتھ اپنی خوشی
تھی اور پھر اس کے بعد کے واقعات نے معاملے کو اور بھی الجھا دیا تھا۔ آنے والا ڈان وند
ہی کا ہم وطن معلوم ہوتا تھا اور ڈان وندسٹ کے بیان کے مطابق پرچنگالی بوڑھا البر و نو اس کا ڈ
تھا۔ لیکن وہ اجنبی ڈان وندسٹ کے ساتھیوں میں سے نہیں تھا۔ انور کو ان کی شکلیں اچھی طرح
تھیں۔ پھر وہ کون تھا۔ انور سوچنے لگا۔ کہاں سے آیا تھا۔ ان پانچ غیر ملکیوں کے
سفارتخانے میں کسی اور کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ پھر وہ مقتول کون تھا.....؟ اور وہ اجنبی.....؟
انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

تھوڑی دیر میں آصف مدہم سروں میں سیٹی بجاتا ہوا عمارت سے نکلا۔

”میرا خیال عموماً غلط نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا۔

”کیا ہوا.....!“

”دس بجکر پانچ منٹ پر تمہارے فون کی کال دولت گنج پبلک ٹیلی فون پوسٹ سے ہوئی تھی۔“

”اوہ.....!“ انور مایوسانہ انداز میں بولا۔ ”تب تو بیکار ہے۔ وہاں سے کیا معلوم ہو سکے گا۔“

”تم نے رشیدہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تمہیں کیا بتا سکتا ہوں جبکہ خود مجھے ابھی تک کچھ نہیں معلوم۔“

”لیکن ابھی تھوڑی دیر قبل تم البر و نو پر اسکے انواء کا الزام لگا رہے تھے۔“ آصف نے کہا۔

”بھئی معاملہ کچھ عجیب سا ہے۔ رشیدہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار تھی۔ میں اس

ساتھ باہر نکلا تھا کہ کسی نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ میں پبلک

بن اور البر و نو کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔“
”اور رشیدہ.....!“

”میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی۔“

”وہ کہاں جانے کے لئے تیار تھی۔“

”اس نے بتایا نہیں تھا۔“

”عجیب بات ہے۔“ آصف نے کہا اور انور کو گھورنے لگا۔

انور نے ایک سگریٹ سلگائی اور دو تین گہرے گہرے کش لینے کے بعد بولا۔ ”سمجھ میں

نہیں آتا کہ یہ البر و نو کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ ابھی تک اس کی کوئی حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ

بات تو ظاہر ہی ہے کہ وہ ہمیں تنگ نہیں کرنا چاہتا۔!“

”کیوں؟ کیا وہ ابھی تک ہماری پوجہ کرتا رہا ہے۔“ آصف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں..... اگر وہ تنگ کرنا چاہتا..... تو ہم صبح تک کمرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔“

”ادبہ ہوگا۔“ آصف گردن جھٹک کر بولا۔ ”ابھی مجھ سے سروکار ہی کیا.....؟ جب کیس

ٹھیک پہنچے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔“

”جی ہاں..... اس دن تو وہ خود ہی ہاتھ باندھے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر

ہو جائے گا۔“ انور تلخ لہجے میں بولا۔

”خیر..... میں ابھی اس پر رائے زنی کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔“ آصف نے

کہا کر کہا۔ ”اچھا بھئی میں تو چلا..... بس آرہی ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسری بس نہ مل سکے

کی شب بھر۔“

آصف انور کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا بس پر چڑھ گیا۔

انور نے ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگائی اور خیالات میں ڈوبا ہوا کاش پر

تک لیتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ شاید زندگی میں یہی بار اسے اتنی

بے نشانوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بوڑھے البر و نو کا تصور اس کے غصے کی آگ بھڑکا دینے کے لئے

کافی تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ دوسری ملاقات پر وہ بے دریغ اپنا روالہ استعمال کرے گا۔ خواہ

بعد میں پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ڈرائیور بچ کر ٹیکسی میں گھس گیا اور انور نے اپنا ریوالور زمین پر گرا دیا۔ البرونو کا ساتھی اطمینان سے اس کی موٹر سائیکل کے کیریئر پر بیٹھا اس کی کمر میں اپنے پستول کی نال چھو اس نے جھک کر انور کا ریوالور اٹھایا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”اب چلاؤ موٹر سائیکل.....!“ البرونو کا ساتھی اکھڑی اکھڑی انگریزی میں بولا۔

”دورہ برابر بھی میرے حکم کے خلاف کیا تو یہیں ختم کر دوں گا۔ سیدھے چلو۔“

موٹر سائیکل چل پڑی۔ انور نے ہی طرح ہیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ موٹر کی روشت سے ٹکرا دے۔ ایسی شکست اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔

”اپنی طرف موٹر دو.....!“ البرونو کا ساتھی حکمانہ لہجے میں بولا۔

انور نے موٹر سائیکل موڑ دی۔ لیکن کچھ دور جا کر خود بخود بڑبڑانے لگا۔ آخر ایسی بھی کیا

اس نے جھلا کر مشین بند کر دی۔

”چلاؤ.....!“ البرونو کا ساتھی چیخا۔

”نہیں.....!“

”میں شوٹ کر دوں گا۔“

”کر دو.....!“

”میں پھر سمجھتا ہوں۔“

”نہیں سمجھتا..... میں بزدل نہیں۔“

ایک زخمی

ان دونوں میں تکرار ہو رہی تھی کہ کسی طرف سے ایک فائر ہوا اور گولی البرونو کے ساتھی کان کے قریب سے گزر گئی۔

”یہ خوف آدمی بھاگو.....!“ وہ انور کو دھکا دیتا ہوا بولا۔

دفعہ ایک ٹیکسی اس کے قریب سے گزری اور وہ بے اختیار اچھل پڑا۔ البرونو کا نو جوان ساتھی پچھلی نشست پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اس کے قریب سے گزرتے وقت ٹیکسی کی رفتار تھی۔ لیکن آگے جا کر اس کی رفتار تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انور اچھل کر اپنی موٹر سائیکل کی سیٹ پر آ رہا۔ دوسرے لمحے موٹر سائیکل ٹیکسی کا تعاقب کر رہی تھی ٹیکسی شہر سے ایک ویران راستہ پر ہوئی۔ انور بدستور اس کا تعاقب کئے جا رہا تھا۔ انور کا ارادہ محض تعاقب کا تھا مگر پھر ایک خیال نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ البرونو کے ساتھی کو یہیں روک کر پکڑ لیا جائے۔ ممکن ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ کر البرونو سے بھی مدد بھیڑ ہو جائے ایسی صورت میں تنہا کیا کر سکے گا۔

اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور پے در پے فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ٹیکسی رک گئی۔

انور کو توقع تھی کہ ادھر سے بھی فائر ہوں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔

اتنے میں اس کی موٹر سائیکل ٹیکسی کے برابر پہنچ گئی۔ ڈرائیور نیچے اترا آیا لیکن پچھلی سیٹ

خالی تھی۔

”وہ ڈاکو کہاں گیا.....!“ انور گرج کر بولا۔

”ڈڈڈ ڈاکو.....!“ ڈرائیور بوکھلائے ہوئے لہجے میں پکھلایا۔

”ہاں ڈاکو! میں پولیس کا آدمی ہوں۔“

ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا اور ”ارے“ کہہ کر اچھل پڑا۔

”یعنی..... کلکیا..... ڈڈڈ ڈاکو..... ارے ارے۔“ ڈرائیور نے ہی طرح بوکھلایا ہوا تھا۔

”ہاں وہ کہاں گیا۔“

”یہیں تھا..... یہیں۔“ اس نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

انور نے ابھی تک مشین بند نہیں کی تھی اور دونوں طرف زمین پر پیر ٹیکے موٹر سائیکل کا

بیٹھا ہوا تھا۔ دفعہ کوئی چیز اس کی پیٹھ میں چھبی۔

”خبردار.....!“ پیچھے سے آواز آئی۔ ”اپنا ریوالور زمین پر ڈال دو۔“

دوسرا فائر ہوا اور اس نے انور کا ہاتھ پکڑ کر جھڑپوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔
انہیں وہ سمت معلوم ہوگئی تھی جدھر سے فائر ہو رہے تھے۔

”یہ ڈان ونسٹ کے ساتھی معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ پھر انور نے
”شکار کھیلو گے۔“

انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ اس نے سوچا ممکن ہے پولیس
ہوں اور اگر نہ بھی ہوں تو وہ خواہ مخواہ ڈان ونسٹ کے ساتھیوں سے کیوں الجھے۔
البرونو کا ساتھی اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”ہم بھاگ بھی سکتے ہیں مگر تمہاری موٹر
یہیں رہ جائے گی۔ اور اگر ان لوگوں نے اسے پولیس کے سامنے پیش کر دیا تو تم مصیبت
پھنسن جاؤ گے۔“

انور جواب دینے ہی والا تھا کہ پھر فائر ہوا۔

”آدمی ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔“ البرونو کا ساتھی بڑبڑایا۔

”تو پھر تم بھی فائر کیوں نہیں کرتے۔“ انور نے کہا۔

”نہیں اسے یہی سمجھنے دو کہ ہمارے پاس پستول نہیں ہے۔“
”کیوں.....؟“

”میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس طرح وہ سامنے آ جائے گا۔“

”آخر تم لوگوں نے یہ کیا لغویت پھیلارکھی ہے۔“ انور بولا۔

”اسے لغویت نہ کہو۔ وہ دن دور نہیں جب تم ہماری شان میں قصیدے گاتے ہو۔“

انور اسے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے اسے چپ کرادیا۔

”دش..... خاموش وہ موٹر سائیکل کی طرف آ رہا ہے۔“

موٹر سائیکل کے قریب کوئی کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”جلدی کرو..... ورنہ موٹر سائیکل گئی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید ہم بھاگ گئے۔“

اس نے انور کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ حملہ آور موٹر سائیکل پر بیٹھنے ہی والا

اس پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں گتھے ہوئے زمین پر آ رہے۔

”خدا تم دونوں پر اپنی رحمت نازل کرے۔“ انور نے بلند آواز میں کہا اور اچھل کر موٹر
سائیکل پر بیٹھ گیا۔

البرونو کا ساتھی چیخنے لگا۔ مگر موٹر سائیکل اشارت ہو چکی تھی اور اب اونچی اونچی زمین پر
ٹی کوئی آگے بڑھی جا رہی تھی۔ انور راستے کا تعین کئے بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد اچانک پچھلے پیچے کا ٹائر ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا اور اسے
راہ موٹر سائیکل روک دینا پڑی۔ مگر وہ خطرے کی بوسوگھ چکا تھا۔ ٹائر خود بخود نہیں پھٹا تھا بلکہ
اپنی کسی نے فائر کیا تھا۔ انور کو درجہ جھڑپوں کی طرف بھاگنے لگا۔
”شہر.....!“ اسے پشت پر آواز سنائی دی۔

انور نے پلٹ کر دیکھا ایک آدمی راتفل لئے کھڑا تھا۔ اندھیرے میں صورت تو نہیں
دیکھ لی لیکن اس کے قد و قامت سے انور نے یہ اندازہ ضرور لگالیا کہ وہ اس سے پہلے بھی کہیں
دیکھ چکا ہے۔

دفعتاً اس کے چہرے پر نارنج کی روشنی پڑی اور اجنبی نے قہقہہ لگایا۔

”تو یہ تم ہو۔“ اجنبی نے انگریزی میں کہا اور انور نے اسکی آواز پہچان لی۔ یہ البرونو تھا۔

”تم نے مجھ پر گولی کیوں چلائی۔“ انور گرج کر بولا۔

”مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ البرونو نے آہستہ سے کہا اور اس کے قریب آ گیا۔

”لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔“

”تم سے مطلب.....!“

”میں تمہاری دلیری کے قصے سن چکا ہوں۔“ البرونو ہنس کر بولا۔ ”لیکن میرا ایک ہی گھونسا

نہیں بہشت کی سیر کرادے گا۔“

”میں نے بھی تمہارا خاتمہ کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔“

”بہت اچھے۔“ البرونو نے قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”ممکن ہے تم جج کہتے ہو لیکن

میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ موٹر سائیکل سنبھالو اور میرے ہمراہ چلو۔“

”نہیں جاؤں گا۔“ انور جھلا کر بولا۔

”جہاری دعوت کروں گا۔“ البرانو اسے دھکا دیتے ہوئے بولا۔ انور بے تحاشہ پلٹ پڑا۔
 ان کے ہاتھ سے رائل گرگٹی اور انور کا گھونسا اس کی پیشانی پر پڑا۔
 البرنو لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ انور پھر جھپٹا لیکن اس بار البرانو نے بُری طرح
 کی گردن پکڑ لی کہ اسے دوسرے لمحے میں اپنی زندگی محال نظر آنے لگی۔
 ”اتنی کہیں کے..... گدھے۔“ البرانو آہستہ سے بڑبڑایا اور انور کو دھکیل کر اندر کر دیا۔
 اندر مٹی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی مدھم روشنی میں لکڑی کے اس کمرے کی فضا
 بڑے پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ سامنے نظر پڑتے ہی انور بے تحاشہ چونک پڑا۔ ایک چارپائی پر
 اٹھی پڑا دکھائی دیا جس کے ساتھ رشیدہ کہیں جا رہی تھی۔ انور نے پلٹ کر البرانو کی طرف
 مایوسی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔
 ”کیا تم نے اسے مار ڈالا۔“
 ”نہیں..... آہستہ بولو۔ وہ سو رہا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس کے سر میں پٹیاں بندھی
 ہیں۔“
 ”وہ لڑکی کہاں ہے۔“ انور نے بے ساختہ پوچھا۔
 ”اسے ڈان وینٹ کے آدمی لے گئے۔“
 ”کہاں؟“
 ”ابھی یہ نہیں معلوم۔“
 ”تم جھوٹے ہو۔“ انور گرج کر بولا۔
 ”تم پھر چیخنے لگے۔“ البرانو نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”چلو باہر چلو۔“
 دونوں باہر نکل آئے۔
 تھوڑی دیر بعد ایک سایہ دکھائی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھاری وزن اٹھائے
 اسے ان کی طرف آ رہا ہو۔ البرانو نے ٹارچ کی روشنی ڈالی اس کا ساتھی کسی کو پیٹھ پر لادے چلا
 ہوا تھا۔
 ”یہ کیا.....؟“ البرانو نے پوچھا۔

”چلو.....!“ البرانو نے اس کے سینے پر نال رکھ دی۔
 مجبوراً انور نے موٹر سائیکل اٹھائی اور اسے دھکیلتا ہوا البرنو کے ساتھ چلے لگا۔
 شکست پر شکست۔ انور بُری طرح جھلایا ہوا تھا۔ البرنو کی شخصیت حد درجہ پراسرار ہونے
 جا رہی تھی۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ پھر اس کا ذہن البرنو کے ساتھی کی طرف منتقل ہو گیا۔ معلوم
 نہیں اس کا کیا انجام ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ اس پر حملہ آور پولیس ہی کا کوئی آدمی رہا ہو۔ کیا
 البرنو اس سے واقف تھا۔ انور نے سوچا کہ اسے کچھ دیر قبل والا واقعہ بتادے۔ مگر پھر ارادہ بدل
 گیا۔ آخر وہ اسے بتائے ہی کیوں۔
 ”کیا سوچ رہے ہو۔“ البرنو تھوڑی دیر بعد بولا۔
 ”یہی کہ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا؟ نہ جانے کیوں تم لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ رشیدہ
 کو اغواء کرنے کا مطلب کیا تھا۔“
 ”تو ابھی تک یہ خیال تمہارے دل سے نکلا نہیں۔“ البرنو نے کہا۔ ”خیر..... خیر..... ابھی
 تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“
 البرنو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے راستے طے کر رہا تھا۔ کئی کھائیاں اور نالے
 پھلانگنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان کے قریب پہنچ کر رک گیا۔
 ”اندر چلو.....!“ البرنو نے حکمانہ لہجے میں کہا۔
 انور نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی۔ وہ اس مکان کی ساخت پر غور کر رہا تھا جو
 کی تعمیر کے سلسلے میں زیادہ تر لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ قرب و جوار میں کچھ اور بھی نوئے بھونے
 جھونپڑے دکھائی دیے۔ لیکن وہ سب دیران معلوم ہوتے تھے۔ غالباً یہ جھونپڑے خانہ بدوشوں
 کے بنائے ہوئے تھے۔ جن میں وہ وقتاً فوقتاً قیام کرتے رہے ہونگے۔ انور نے اس طرف کے خانہ
 بدوشوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ فصل کٹنے کے زمانے میں وہ ان اطراف میں پھیل جاتے
 تھے دن میں تو کھلیانوں میں محنت مزدوری کرتے اور رات کو چوریاں کرتے تھے۔
 ”دروازہ ادھر ہے۔“ البرنو نے ایک طرف اشارہ کیا۔
 ”آخر تم چاہتے کیا ہو۔“

میں نہیں آیا تھا۔

”لیٹے رہو۔“ البرونو ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”تم نرمی طرح زخمی ہو گئے ہو۔ تمہیں ضرورت ہے۔“

”مگر..... مگر!“

”تمہیں ڈان و سنٹ کے ساتھیوں نے زخمی کر دیا۔ رومولی کو اپنے ساتھ لے کر تمہیں یہاں اٹھالایا۔“

”رومی کو لے گئے۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”بہت بُرا ہوا بہت بُرا ہوا۔“

”لیکن تم اسے کہاں لے جا رہے تھے۔“ انور گرج کر بولا۔

”سی نور.....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم اب بھی ایک اچھے دوست ہو گے۔“

انور متحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ڈی گاریکا۔“ البرونو نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”اوہ تم! میرا نام بھی جانتے ہو۔“ وہ متحیرانہ انداز میں البرونو کی طرف مڑا۔

”ڈان و سنٹ کے دشمنوں کو مجھ سے زیادہ کون جانے گا۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔

”میں نے شمشیر زنی کے مقابلے میں تمہارے کمالات دیکھے تھے۔“

”خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔“ البرونو سگارسگارتا ہوا بولا۔ ”ہمیں سب سے پہلے

پتہ لگانا ہے۔“

”لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تم رومولی میں کیوں دلچسپی لے رہے؟“

گاریکا نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے ہر اس ہستی سے ہمدردی ہے جس سے ڈان و سنٹ

رکتا ہے۔“

”لیکن تم رومولی کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔“ ستون سے بندھے ہوئے آدی۔

ہوئی آواز میں کہا۔

البرونو کا ساتھی اسی کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے دوسرا جملہ نکلنے سے پہلے

زبان کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔

”چپ رہو خرگوش کے بچے۔“ اس نے دوسرا تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

”کوئلے دہک گئے۔“ البرونو نے اس سے پوچھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

”ایک لوہے کی سلاخ آتش دان میں ڈال کر لاؤ۔“ البرونو نے کہا اور وہ باہر چلا گیا۔

ستون سے بندھا ہوا آدی کانپنے لگا۔

”تو کیا..... تم.....!“ ڈی گاریکا ہکلا یا۔

”ہاں میں اس کی جڑبی نکالوں گا لیکن اگر یہ ہمیں رومولی کا پتہ بتا دے گا تو ہم اسے چھوڑ

داں گے۔“

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں“ ستون سے بندھا ہوا آدی خوفزدہ آواز میں چیخا۔

البرونو کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اس کا ساتھی گھبرائے ہوئے انداز میں داخل ہوا۔

”کیا ہے.....؟“ البرونو نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”پولیس..... محاصرہ کیا جا رہا ہے۔“

”کدھر.....!“

”سانے کی جھاڑیوں میں کچھ آدی دکھائی دیئے ہیں۔“

”اوہ..... اچھا.....!“ البرونو نے کہا اور ڈان و سنٹ کے ساتھی کی کینٹی پر ایک زور دار

لوہر رسید کر دیا۔ اس کی گردن ایک طرف جھول گئی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ البرونو اور اس کے

انہما نے جلدی جلدی اسے ستون سے کھول کر الگ کیا۔ انور متحیرانہ انداز میں ان کی یہ ساری

ادائیگیاں دیکھ رہا تھا اور خود الجھن میں مبتلا تھا کہ اس کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔

”تم ادھر آؤ.....!“ البرونو نے اسے ستون کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”کیوں.....؟“

”جلدی کرو..... ورنہ تم بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ تمہاری موٹر سائیکل اس قابل نہیں

ہے کہ تم اسے کہیں لے جا سکو۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔“

البرونو کے ساتھی نے اسے دھکیل کر ستون کے قریب کر دیا اور پھر دونوں مل کر اسے

دوسری لاش

اس سے فارغ ہو کر البرونو نے بے ہوش میکین کو پیٹھ پر لا دیا اور وہ دونوں ڈیبا سمیت دوسری طرف سے باہر نکل گئے۔

انور کی عجیب حالت تھی۔ اس وقت نہ تو اسے غصہ ہی تھا اور نہ رنج۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور کبھی ہڈیاں بکٹنے کو دل چاہتا تھا۔ بوڑھے البرونو نے اس کی عقل ضبط کر دی تھی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہونے لگا۔ اگر البرونو واقعی رشید کا دوست تھا تو اس وقت اس نے اسے ستون سے باندھ کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو پولیس اس کے پیچھے پڑ جاتی اور یہ تو ظاہر ہی تھا کہ وہ موٹر سائیکل وہاں سے نہیں لے جاسکتا تھا۔ ایسی صورت میں پولیس یقیناً اسے تنگ کرتی۔ بیک وقت دو تین فائر ہوئے اور گولیاں دیوار کے باہر ہی جھسے سے ٹکرائیں۔ انور نے آنکھیں بند کر کے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”ارے.....!“ وہ اٹھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا بولا۔ ”مگر میری.....!“

”تم یہاں کہاں.....؟“ جگدیش آگے بڑھ کر بولا۔

”تم نے میری موٹر سائیکل دیکھی ہے؟“ انور نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بوجھا۔

”نہیں..... میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچے۔“

”ایک لمبی داستان ہے.....“ انور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے انہیں گرفتار لیا نہیں۔“

”نہیں وہ نکل گئے۔“

”بہت بُرا ہوا..... بہت بُرا ہوا۔“ انور مضطربانہ انداز میں بڑبڑایا۔

”تم یہاں کس طرح پہنچے۔“ جگدیش نے پھر سوال دہرایا۔

”نہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ البرونو اور اس کے ساتھی رشیدہ کو پکڑ کر لے گئے۔“ انور نے مائل طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ ڈان و سنٹ کے لاشیں سے بھی ایک موجود ہے۔

”اُس کے ساتھی.....؟“ جگدیش نے تھیر آ میز انداز میں دہرایا۔ ”تو کیا وہ کئی ہیں۔“

”میرا تو یہی خیال ہے کیونکہ میں نے یہاں تین آدمیوں کو دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک تو.....“

”تو کیا تمہیں بھی وہ لوگ پکڑائے تھے۔“

”نہیں۔“ انور نے کہا اور پورا واقعہ دہرانے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں

انور کی عجیب حالت تھی۔ اس وقت نہ تو اسے غصہ ہی تھا اور نہ رنج۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور کبھی ہڈیاں بکٹنے کو دل چاہتا تھا۔ بوڑھے البرونو نے اس کی عقل ضبط کر دی تھی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہونے لگا۔ اگر البرونو واقعی رشیدہ کا دوست تھا تو اس وقت اس نے اسے ستون سے باندھ کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو پولیس اس کے پیچھے پڑ جاتی اور یہ تو ظاہر ہی تھا کہ وہ موٹر سائیکل وہاں سے نہیں لے جاسکتا تھا۔ ایسی صورت میں پولیس یقیناً اسے تنگ کرتی۔ بیک وقت دو تین فائر ہوئے اور گولیاں دیوار کے باہر ہی جھسے سے ٹکرائیں۔ انور نے آنکھیں بند کر کے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

”ارے.....!“ جگدیش کی حیرت زدہ آواز انور نے پہچان لی۔ ”یہ تو انور ہے۔“

پھر کسی نے اس کا سر ہلایا۔ انور نے اپنی گردن ایک طرف ڈھلکا دی۔

”بے ہوش ہے۔“ کسی نے کہا۔

”لیکن وہ کہاں گئے۔“

”پیچھے چلو..... پیچھے۔“ کسی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے انور کو کھول کر زمین پر ڈال دیا۔ وہ بدستور بے ہوش بنا رہا۔

”نہ جانے کجنت کدھر نکل گئے۔“ جگدیش کی آواز آئی۔ ”اچھا اسے اٹھا کر لے چلو۔“

انور نے سوچا شاید انہوں نے اس کی موٹر سائیکل نہیں دیکھی لہذا اب اسے ہوش میں آ جانیے۔ ورنہ موٹر سائیکل یہیں رہ جائے گی۔

”تو کیا تمہیں بھی وہ لوگ پکڑائے تھے۔“

”نہیں۔“ انور نے کہا اور پورا واقعہ دہرانے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں

البرنو کے ساتھی کو حملہ آور سے لڑتے چھوڑ کر نکل بھاگا لیکن تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ فائر کے موٹر سائیکل کا پچھلا پیہر بے کار کر دیا اور جب وہ قریب آیا تو میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے جھلا کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعات مجھے یاد نہیں۔

”ڈان ونسٹ کے ساتھیوں میں سے کوئی صاف نہیں دیا۔“ جگدیش نے پھر ہوئے پوچھا۔

”نہیں.....!“ انور نے کہا۔ ”مجھے اپنی موٹر سائیکل تلاش کرنی چاہیے۔“

”موٹر سائیکل تلاش کرو۔“ جگدیش نے دو سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لیکن تم یہاں کس طرح پہنچے۔“ انور نے جگدیش کی طرف سگریٹ بٹ بٹاتے ہوئے پوچھا۔ جگدیش نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور متشکرانہ انداز میں چھت کی طرف دیکھ کر

”مجھے اس نے اطلاع دی تھی کہ“ جگدیش نے ڈان ونسٹ کے ساتھی کی طرف

کر کے کہا۔ ”اس کا بیان ہے کہ البرنو اور اس کا ساتھی کسی لڑکی کو زبردستی اٹھالے جارہے

اس نے اور اس کے ساتھی نے ان کا تعاقب کیا پھر یہ اپنے ساتھی کو یہاں چھوڑ کر ہٹا

دینے کے لئے باہر چلا گیا۔ بہر حال تو وہ لڑکی تمہاری دوست رشیدہ تھی۔ مگر تمہارے بیان

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس اجنبی کے ساتھ اپنی خوشی سے لگی تھی۔“

”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اجنبی البرنو کا ساتھی تھا۔“ انور نے کہا۔

”افسوس تو اس بات کا ہے کہ آصف سے کچھ نہ ہو سکا۔“ جگدیش بولا۔

”آصف.....!“ انور تھیر آ میز لہجے میں بولا۔ ”بے چارہ آصف کیا کر سکتا تھا۔“

جگدیش کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ دونوں کانشیلوں نے واپس آ کر موٹر سائیکل مل جا۔

اطلاع دی۔

”آخر البرنو کا رشیدہ سے کیا تعلق۔“ جگدیش نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”میں کئی گھنٹے سے یہی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”وہ اس کے پیچھے تو نہیں لگ گئی تھی۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”ممکن ہے لیکن ان نے مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“

”مذہب بھی بات ہے۔“ جگدیش کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

وفاقی دیر تک تمہارے یہاں کیوں ٹھہرا رہا۔“

”ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنی غیر معمولی قوتوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔“

جگدیش خاموش ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک تجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر

پہن تک اس طرح سکڑ لئے جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”قرب و جوار کی جھونپڑیاں اجاڑ دو۔“ وہ کانشیلوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”اور اس لکڑی

مکان کو چور چور کر دو۔“

”مگر اس سے فائدہ۔“ انور نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جگدیش نے انکی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس بات کا جواب دینا کسر شان سمجھتا ہو۔

انور نے اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ابھی اسے پولیس ہی کی لاری پر واپس

فائدہ موٹر سائیکل تو بیکار ہی ہو چکی تھی۔

جھونپڑیاں اجاڑی جانے لگیں۔ وہ لوگ باہر نکل آئے تھے اور اب لکڑی کا مکان بھی توڑا

نہ لگا۔ تھوڑی دیر بعد ویران بستی اور زیادہ ویران ہو گئی۔

وہاں سے واپسی پر راستے میں جگدیش نے انور کو پھر چھیڑا۔

”رشیدہ کون ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”تم چھوٹے ہو۔“ جگدیش بگڑ کر بولا۔ ”تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس کا البرنو سے کیا

رابطہ ہے۔“

”اگر میں یہی جانتا ہوتا تو تم مجھے اس حالت میں نہ دیکھتے۔“

”لیکن تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔“ جگدیش منہ سکڑ کر بولا۔

”میں نے تمہیں اس پر مجبور تو نہیں کیا۔“ انور نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں تمہیں بند کر دوں گا۔“

”بڑی کر کے دیکھ لو۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”ڈان ونسٹ کے ساتھی نے البرنو کو کس وقت دیکھا تھا۔“ انور نے جگد لیش سے پوچھا۔
”ساڑھے نو بجے۔“

”اور اس کے ساتھ رشیدہ بھی تھی۔“

”ہاں..... لیکن میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ رشیدہ ہی تھی۔ اس نے تو صرف ایک لڑکی کا
”ایکھا تھا۔“

”بہر حال اس کا یہ بیان حد درجہ دلچسپ ہے جبکہ البرنو ساڑھے نو بجے سے سوا دس بجے
”میرے کمرے میں رہا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تم البرنو سے مل گئے ہو۔“ جگد لیش اُسے گھور کر بولا۔

”تو پھر آصف بھی مل گیا ہوگا۔“ انور نے لا پرواہی سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ میرے اس بیان کی تصدیق آصف سے بھی کی جاسکتی ہے۔“

جگد لیش اُسے پھر گھورنے لگا۔

”اگر یہ صحیح ہے تو ڈان ونسٹ کے ساتھی کو کیا سمجھا جائے۔“

”بڈل.....!“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”میں تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔“ جگد لیش کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ایک عرصے سے

”ایکھا جا رہا ہے کہ شہر میں ہونے والی بڑی وارداتوں میں تمہاری شخصیت کہیں نہ کہیں ضرور الجھتی

”

”یہ بھی تم لوگوں کی خوش قسمتی ہے۔“ انور نے کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

جگد لیش نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دل

”دل میں بیچ و تاب کھا رہا ہے۔“

”تو میری دیر بعد وہ کو تو لای پہنچ گئے۔ جگد لیش نے انور کا بیان قلمبند کرنے کے بعد اسے

”اس کی اجازت دے دی۔ انور نے موٹر سائیکل وہیں کو تو لای میں چھوڑی اور ایک ٹیکسی کر کے

”اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت شاید ہی کوئی ہوٹل

”میں جو کہتا ہوں گزر رہا ہوں۔“

”مجھے اس کا حال بھی خوب معلوم ہے۔ دعائیں دو فریدی صاحب کو جن کی بدولت

”انچارج بنے ہو۔“

”کیا مطلب.....!“

”یہ کہانی بہت جلد اخبارات میں آنے والی ہے۔“

”مجھ پر تمہاری دھمکی کارگر نہیں ہو سکتی۔“ جگد لیش جھلا کر بولا۔

”کسی کو دھمکی دینا شریفیوں کا کام نہیں۔“ انور نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”میں تو

”وہ حقائق پبلک کے سامنے لاؤں گا جن کی بناء پر تم نے ترقی کی ہے۔“

”میں فریدی صاحب کے خیال سے تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ ورنہ تم اب تک سڑ گئے ہوتے

”میری استدعا ہے کہ تم فریدی صاحب کا خیال کرنا چھوڑ دو۔“ انور نے ملتی جلتی انداز

”کہا اور جگد لیش دانت پیسنے لگا۔

”تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

”تمہیں میرے ساتھ کو تو لای چلنا پڑے گا۔“

”وہ تو میں خود ہی چلوں گا۔“ انور نے کہا۔ ”کیا تم البرنو کے خلاف میری رپورٹ

”گئے۔“

”اسی لئے لے چلوں گا۔“

پھر خاموشی چھا گئی۔ لاری کے انجن کی آواز سنائے میں دور دور تک پھیل رہی تھی۔

”سگریٹ سلگا کر خیالات میں ڈوب گیا۔ رشیدہ اسے بُری طرح یاد آ رہی تھی۔ ابھی تک ”

”سے لا پرواہی برتاؤ آیا تھا مگر اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ رشیدہ کے بغیر زندگی نہیں

”سکتا۔ آخر ڈان ونسٹ کے آدمیوں سے اس کا کیا تعلق؟ کیا واقعی رشیدہ کی ذات سے کوئی

”راز وابستہ ہے لیکن ان غیر ملکیوں سے اس کا کیا تعلق؟ اچانک انور چونک پڑا۔ ایک خیال

”سے اُس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس نے جگد لیش کی طرف دیکھا جو باہر پھیلی ہوئی تاریکی

”گھور رہا تھا۔“

کھلا ہو کیونکہ دو بج رہے تھے۔

گھر پہنچ کر اس نے اسٹوپ جلا یا اور ہوٹل سے آئی ہوئی ٹھنڈی چائے کو دوبارہ گرم کر لگا۔

اس وقت سچ سچ اس کی حالت بالکل پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ ذہن بُری طرح الجھا تھا۔ یکے بعد دیگرے بے شمار سوالات ذہن کے تاریک گوشوں سے ابھرتے اور پھر ڈوب جاتے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوتی جا رہی ہوں کہ اب رشیدہ کو کبھی نہ پاسکے گا۔

پے در پے چائے کے دو تین کپ خالی کرنے کے بعد وہ پلنگ پر گر گیا۔

دوسرے دن صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اسے اپنی رات کی حماقت کا احساس اس نے رات کو توالی سے گھر واپس آنے کی بجائے ڈان ونسٹ کے اس ساتھی کا تعاقب نہ کیا جو پولیس والوں کے ساتھ تھا۔ البرونو کی تحریک کن حرکتیں خواہ کتنی ہی پراسرار کیوں نہ رہی لیکن رشیدہ کے معاملے میں اس کا بیان کچھ نہ کچھ سچائی ضرور رکھتا تھا۔ انور سوچنے لگا کہ ڈیگاریکا البرونو ہی کا گرگا تھا تو اس نے ہوش میں آنے کے بعد البرونو کی موجودگی پر حیرت کیوں کی تھی۔ اس کا وہ انداز استعجاب قطعی مصنوعی نہیں تھا۔

انور بے اختیار اٹھ بیٹھا۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ڈان ونسٹ آصف کے بیان کے مطابق زندگی کی آگھڑیاں گزار رہا تھا۔ کو توالی راستے میں ہی پڑتی تھی۔ اس نے سوچا کہ لگے ہاتھ موٹر سائیکل لیتا چلے۔ وہ کو توالی کے پھانک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اس کا راستہ روک لیا۔

”کس سے ملنا چاہتے ہو۔“ سپاہی نے پوچھا۔

”میں اخبار کار پورٹر ہوں۔“

”اندر جانے کا آرڈر نہیں۔“

”کب سے۔“

”آج سے ابھی سے۔“

”لیکن میں اخبار کار پورٹر ہوں۔“ انور نے احتجاجاً کہا۔

”بٹ ہو ہی رہی تھی کہ اندر آصف دکھائی دیا اور انور کو دیکھتے ہی اس نے اسے آنے کا کہا اور سپاہی ایک طرف ہٹ گیا۔

آصف کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

”آج پھرے والے روک کیوں رہے ہیں۔“ انور نے اس سے پوچھا۔

”جگہ میں کی جھک ہے ورنہ اس سے کیا ہوتا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”خزبات کیا ہے؟“

”کوئی نئی بات نہیں۔“ آصف منہ بیتا کر بولا۔ ”یہاں کا قدیم رواج ہے کہ یہاں ایک قتل

ہاں کی بارش ہو جاتی ہے، کیوں؟“

”آج صبح ڈی سالٹ کی لاش ملی ہے۔“

”ڈی سالٹ.....!“ انور چونک کر بولا۔ اس نے یہ نام کبھی سنا تھا۔ ”ڈی سالٹ۔“ اس

بار بار پھر دہرایا۔

”ہاں وہ ڈان ونسٹ کے ساتھیوں میں سے تھا۔“ آصف نے کہا۔

انور کو یاد آ گیا۔ ڈیگاریکا نے اسے ڈی سالٹ ہی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ تو کیا البرونو نے

لہ کر دیا۔

”اور اس کی موت بھی اسی زہریلی سوئی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔“ آصف سگریٹ

اٹھا بولا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ پہلی لاش بھی ڈان ونسٹ ہی کے ساتھی کی تھی۔“ انور نے کہا۔

”دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈان ونسٹ اپنے بقیہ ساتھیوں سمیت کہیں غائب ہو گیا۔“

”کسے.....!“ انور کی لہجے میں تحیر تھا۔ ”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ نقل و حرکت بھی نہیں

کرتا۔“

”اس کی ظاہری حالت تو ایسی ہی تھی اور ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ ایک ماہ سے

لشٹ اٹھ کے گا۔“

”تو ڈاکٹروں نے اسے جانے کیوں دیا۔“

”ڈاکٹروں کو اس کی روانگی کا علم ہی نہیں۔ یہ بات تو لاش ملنے کے بعد معلوم ہوئی۔“
 ونسٹ پر انیویٹ وارڈ میں تھا اور اس کے ساتھی بھی وہیں مقیم تھے۔ لاش ملنے کے بعد
 نے ہسپتال فون کیا تب یہ بات معلوم ہوئی۔“

انور کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ البرونو نے ڈی سالت قتل کیا تھا
 ونسٹ وغیرہ کیوں غائب ہو گئے۔

”کیا سوچ رہے ہو۔“ آصف نے کہا۔ ”ہاں رشیدہ کا کیا۔“
 ”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ انور بے چینی سے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے
 کروں؟“

”ارے یہ تم بول رہے ہو۔“ آصف نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے اس سے قلم نہیں
 پریشان نہیں دیکھا۔“

”میری ساری صلاحیتیں جواب دے گئی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب
 مجھے کبھی نہ ملے گی۔ میں ابھی تک خود کو فریب دیتا رہا ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
 آصف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے انور سے ایسے الفاظ کی توقع نہیں تھی
 تو اسے بالکل جانور اور عورت کے معاملے میں پتھر کی طرح بے جان سمجھتا تھا۔

انور وہاں زیادہ دیر تک نہیں رکا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل اٹھائی اور اسے گھنٹا ہوا
 ہی کے ایک کارخانے تک لایا۔ وہاں اسے مرمت کے لئے چھوڑ کر ایک طرف چل پڑا۔
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ آگے چل کر ایک پبلک ٹیلی فون پوسٹ کے
 پھر رکا۔ آج وہ آفس نہیں جانا چاہتا تھا اور جا کر کرتا بھی کیا۔ جب کہ دماغ قریب قریب
 ہو کر رہ گیا تھا۔

”اس نے فیجر کو فون کر دیا کہ وہ آج دفتر نہ آ سکے گا۔“

”لیکن..... پھر..... اب کہاں جائے اور کیا کرے؟ اب تو اسے اپنی بے بسی پر غصہ
 لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈان ونسٹ کو تلاش کرے یا البرونو کو۔ اور ڈی گاڑا

بروز کے ساتھ تھا۔ ممکن ہے وہ اب بھی اسی کے ساتھ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود کو مضحکہ خیز لگنے
 انٹ پاتھ پر اس طرح گم سم کھڑے رہنا کوئی اچھی علامت نہ تھی۔ وہ گڑبڑا کر پاس کے ایک
 بنورال میں گھس گیا۔ ابھی وہ دروازے میں ہی تھا کہ ایک آدمی اسے دھکا دیتا ہوا تیزی سے
 در داخل ہوا۔ انور کی نگاہیں اس کا تعاقب کرنے لگیں اور یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ وہاں
 لینے کی بجائے وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ انور اسکی صورت
 کی نہ دیکھ سکا۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر فٹ پاتھ پر چلنے والوں میں وہ شخص نہیں
 مائی دیا اور پھر انور کو اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ رہا ہوگا کوئی۔ کسی غلط فہمی کی بناء پر یہاں چلا
 بھاگا اور پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی دوسرے دروازے سے نکل گیا۔

انور ایک خالی میز کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن چونکہ آچکا تھا
 مالے کچھ نہ کچھ منگوانا ہی پڑا۔ چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر دے کر اس نے سگریٹ نکالنے
 لے جب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ کوئی سخت سا کاغذ اس کی انگلیوں میں کڑکڑایا۔ یہ ایک بند
 انور غصے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

لیکن وہ اس کی جیب میں کیسے پہنچا؟ تو کیا اس آدمی نے اسی لئے اسے دھکا دیا تھا۔ انور
 لافانہ چاک کیا۔ اس میں اسی کے نام ایک ٹائپ کیا ہوا خط تھا۔

انور خط ملتے ہی سر کلر روڈ کی عمارت ”آشیانہ“ میں پہنچ جاؤ۔ ”تمہیں کئی بار فون پر بلانے
 ہائوس کی گئی لیکن جواب نہ ملا۔ غالباً تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میں کون ہوں مجھے تم پر اعتماد ہے
 تم اپنے ساتھ پولیس نہیں لاؤ گے۔“

خط پڑھ کر انور نے لافانہ جیب میں رکھ لیا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیرہ چائے رکھ کر چلا
 لیا اس نے جلدی جلدی دو ایک پیسٹریاں کھائیں اور چائے اٹھیل کر بڑے بڑے گھونٹ لینے
 لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ خط کس کا ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مل ادا کر کے باہر آیا۔ ایک
 ٹیسی کی اور سر کلر روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ناقابل یقین

”نہیں اس نے خودکشی کر لی۔“ البرونو بولا۔
”خودکشی.....!“

”ہاں..... اس نے اپنے جسم میں زہریلی سوئی چھولی۔ ہم اس سے رومولی کے متعلق
چرچے تھے۔“
”رومولی..... رومولی.....!“ انور بھنا کر بولا۔ ”اس کا نام رومولی نہیں رشیدہ ہے۔ تم
بے فزاہ خواہ کوئی غیر ملکی نام کیوں دے رہے ہو۔“

”اس کا قومی اور مذہبی نام رومولی ہی ہے۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔
”تم اس سے متعلق مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔“ انور جھلا کر بولا۔ ”نہ جانے تم لوگوں نے
نہم کا جال پھیلا رکھا ہے اور مجھے بھی بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“
”میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ البرونو نے ڈی گاریکا سے کہا۔ ”یہ دشواری ضرور پیش
ہے گی۔“ پھر انور کی طرف مڑ کر بولا۔ ”اچھا تم اس کے متعلق کیا جانتے ہو۔ چلو میں کہتا ہوں
نکا نام رشیدہ ہی تھی۔ پھر وہ کون ہے کس کی بیٹی ہے کس سرزمین سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر تم یہ
بجانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔“

انور کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ خاموشی سے البرونو کی صورت دیکھ رہا تھا۔
”تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔“ البرونو ہنس کر بولا۔ ”اور نہ وہ تمہارے متعلق کچھ
جانتے ہیں۔ لیکن میں تم دونوں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔“
”ہونہ.....!“ انور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”تم میرے متعلق کیا جانتے ہو۔“

”سنو گے۔“ البرونو نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا تو سنو! تم نواب و جاہت علی خاں کے لڑکے ہو۔“
انور بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر البرونو کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”تمہارے چچا شاہت علی خاں نے تمہیں اپنے بھائی کی ناجائز اولاد ثابت کرا کے ان کے
نکسے محروم کر دیا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تمہاری ماں ان کی بیوی تھی۔“
”تم کیسے جانتے ہو۔“ انور مضطربانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”بٹھ جاؤ..... بٹھ جاؤ۔“ البرونو ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی

سرگرم روڈ پر بہت زیادہ عمارتیں نہیں تھیں اس لئے ”آشیانہ“ ڈھونڈنے میں زیادہ ڈھونڈنا
نہیں ہوئی۔ یہ ایک طویل و عریض عمارت تھی۔ سامنے ایک پائیں باغ تھا لیکن ابتر حالت میں
شاید اس کی دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی۔

انور پھانک سے گزرتا ہوا پائیں باغ طے کر کے برآمدے میں آیا۔ یہاں سناٹا تھا اس
نظر دیوار میں لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر پڑی جس پر گھنٹی کا بٹن موجود تھا اس نے کئی بار تھوڑ
تھوڑے وقفے کے ساتھ بٹن دبایا مگر جواب نہ ملا۔

اس نے دو منٹ تک توقف کیا پھر واپس لوٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا ہو
ہے کہ یہ سب کچھ اسے پھنسانے کے لئے کیا گیا ہو۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا
اسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ انور مڑا..... دروازے میں البرونو کھڑا تھا۔

”میں اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ تم تنہا ہی آئے ہو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”اسی لئے جب
انتظار کرنا پڑا۔ اندر آ جاؤ۔“ انور چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر خاموشی سے اندر چلا گیا۔

وہ متعدد کمروں سے گزرتے ہوئے ایک درجن ہال میں پہنچے جہاں ڈی گاریکا اور البرونو
ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انور کو دیکھ کر البرونو کے ساتھی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ البرونو
صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ انور کی نظریں ڈی گاریکا کے چہرے
پر جمی ہوئی تھیں جو بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”ڈی دیر تک خاموشی رہی پھر دفعتاً البرونو بولا۔

”ڈان ڈسٹ اپنے ساتھیوں سمیت کہیں غائب ہو گیا ہے اور ہم میڈموزنیل رومولی
سراغ لگانے میں ناکام رہے۔“

انور اسے گھورنے لگا۔

”تم نے ڈی سالٹ کو مار ڈالا.....!“ انور نے آہستہ سے کہا۔

جانتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا یہ حادثہ تمہیں غلط راستوں پر نکال لے گیا۔ تمہاری نظروں میں عظیم کائنات اور اس میں متحرک زندگی محض ایک ڈھکوسلا اور بے معنی چیز بن کر رہ گئی۔ غم سے ہمدردی ہے۔“

”مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔“ انور ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”تو پھر اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔“ البرونو کے ساتھی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“ البرونو نے اسے ڈانٹا اور وہ پھر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ اب بھی غم آمیز نظروں سے انور کو دیکھ رہا تھا۔

”اور رشیدہ کے متعلق سننے کے بعد تمہیں اپنے پر یقین نہ آئے گا۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔

”لیکن جس طرح میں نے تمہارے متعلق بتایا ہے اسی طرح رشیدہ کے متعلق بھی بتا سکتا ہوں۔“

انور اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ البرونو نے رک کر سرگرمیٹ سلگایا اور تین لم

لینے کے بعد کہا۔

”رشیدہ ایک غیر معروف جزیرے کی شہزادی ہے۔“

انور کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”اب تم مجھے پریوں کے دیس کی کہانی سناؤ گے اور مجھے اپنی ثانی اماں یاد آ جائیں گی۔“

پھر کہانی کے خاتمے پر کہہ دینا کہ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔“ انور نے پھر قہقہہ لگایا۔

البرونو کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”ہی نور، البرونو کا بیان صحیح ہے۔“ ڈی گاریکا آہستہ سے بولا۔

”تم لوگ مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”تم یہاں کوئی بہت ہی خف

ناک جرم کرنا چاہتے ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی مجرموں نے ہمیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہا ہے۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ البرونو تحممانہ لہجے میں بولا۔

انور غیر ارادی طور پر بیٹھ گیا۔

”تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔“ البرونو نے کہا۔ ”اگر میں تمہیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا

تو کل رات ہی ہٹا دیتا۔ تم میری نظروں میں ایک طفل کتب سے زیادہ نہیں ہو۔“

”البرونو ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ انور کا سر چکرانے لگا اور پھر دفعتاً اسے یاد آ گیا کہ رشیدہ اپنے لہجے کو چھپانے کے لئے داراب کے قتل پر کمر بستہ ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی واقعہ

بہا ہو گا لیکن اگر سچ سچ وہ کسی ملک کی شہزادی تھی تو ایک معمولی عورت کی طرح کیوں زندگی بسر رہی تھی اور پھر سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ سو فیصدی ہندوستانی معلوم ہوتی تھی۔

”اگر کسی غیر ملک کی شہزادی کیسے ہو سکتی ہے۔“

”کیا سوچنے لگے۔“ البرونو اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

”میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔۔۔۔۔ میرا دماغ بے کار ہوتا جا رہا ہے۔“ انور نے اکتائے ہوئے لہجے

کہا۔

”سب کچھ سمجھ سکتے ہو بشرطیکہ دوسروں پر اعتماد کرنا سیکھو۔“

انور بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہیں محض اس لئے حیرت ہے کہ تم اس جزیرے کے عجیب و غریب رسم و رواج سے

نہ نہیں ہو۔“ البرونو نے کہا۔ ”وہاں کے تاج اور تخت کا حقدار بچپن ہی سے وہاں سے ہٹا کر

ایک دوسرے ملک میں رکھا جاتا ہے اور سن بلوغ کے پہنچنے پر پھر وہیں واپس چلا جاتا ہے اور

لڑان کے مرنے کے بعد عنان حکومت خود سنبھالتا ہے۔ اگر حکمران ولی عہد کی کنسی ہی میں

جائے تو اس کا قریبی عزیز اس کے بالغ ہونے تک امور سلطنت انجام دیتا ہے اور رومولی یا

یہ اپنے باپ کی پہلی اولاد ہونے کی حیثیت سے تخت کی حقدار تھی اس لئے اسے جزیرے سے

ہٹا لیا گیا۔ اسی دوران میں اس کا باپ حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا۔ لہذا رشیدہ کا چچا عارضی طور پر

حکومت کرنے لگا۔ رشیدہ کو میکسیکو میں رکھا گیا تھا۔ ایک دن اچانک اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔

انور گاریکا اس کا اتالیق تھا۔ اسی نے کسی طرح پتہ لگالیا کہ رشیدہ کا چچا اسے ختم کر کے خود ہمیشہ

پیشہ کے لئے تخت کا مالک بننا چاہتا ہے۔ لہذا اس نے دورانہ نشی سے کام لے کر یہ خبر مشہور

کر دی کہ رشیدہ کو کسی نے مار ڈالا اور پھر اسے لے کر ادھر ادھر کی خاک چھانتا رہا۔ نہ جانے

کیوں اسے یہ خیال آیا کہ رشیدہ صرف ہندوستان میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ لہذا تم یہ خود سوچ سکتے

ہو کہ جس بچے کی پرورش ہندوستانی ماحول میں ہوئی ہو وہ سو فیصدی ہندوستانی ہی ہوگی۔ ڈی

”کسی طرح نہیں۔“ انور نے لاپرواہی سے کہا۔ ”الف لیلے کی یہ لمبی چوڑی داستان سننے کے بعد اسے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ البرونو اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ رشیدہ کا رانا بے سروپا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً البرونو اس سے رشیدہ کی آڑ میں کوئی بھیانک جرم کرانا چاہتا ہے۔ البرونو انور کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھا اور انور کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔!“

انور پہلے تو ہچکچایا لیکن پھر اس کے ساتھ ہو گیا۔ البرونو اسے ایک کمرے میں لایا اور دروازہ لڑا۔

”تم نے ابھی کہا تھا کہ تمہیں اس کہانی پر یقین نہیں آ سکتا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔“

”اچھا تو ادھر بیٹھ جاؤ۔“ البرونو نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں اب کوئی شعبہ دکھانے کا ارادہ ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”یہی سمجھ لو۔“ البرونو نے لاپرواہی سے کہا۔

البرونو دوسری طرف چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک ایک میز پر رکھے ہوئے کاغذات التا پلٹاتا رہا اپنے ہاتھ میں ایک اخبار دبائے ہوئے واپس آیا۔ کاغذ کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت پرانا ہے۔ البرونو نے وہ اخبار انور کے سامنے پھیلا دیا اور ایک تصویر پر انگلی رکھ کر انور کی طرف کھینچا۔ یہ ایک مضمونی بیچی کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

”کئی بے درد نے اس معصوم بچی کو قتل کر دیا۔ لاش ایک پبلک پارک میں پائی گئی۔ قتل کی ہولناکی نہیں ہو سکتی۔“

انور تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ اچھل پڑا۔ لیکن شاید اس کا یہ رویہ البرونو کے لئے عجیب تھا۔ وہ انور کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ تو عجیب رشیدہ کے بچپن کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔“ انور نے کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“ البرونو کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”کیا اس کے پاس اس کے بچپن کی تصویر تھی۔“

گاریکا نے اس کی پرورش بالکل ہندوستانی طریقے پر کرائی۔ رشیدہ اپنی اصلیت سے بھی واقف تھی۔ لہذا فطری طور پر کسی ایک ایسے آدمی کی اسے تلاش ہوئی جو اس کی حفاظت کرے۔ اس کے لئے۔۔۔۔۔ نے تمہیں منتخب کیا۔ ڈی گاریکا رشیدہ کو یہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ لیکن اسے دیکھنے کیلئے آتا رہتا تھا۔ اس دوران میں شاید رشیدہ کے چچا کے جاسوسوں کو اس کا علم انہوں نے اسکی اطلاع اس کے چچا کو دی اور اس نے ڈان ونسٹ کو یہاں بھیجا، تاکہ رشیدہ پکڑا سکے۔ اس بار جب ڈی گاریکا اپنے لڑکے اور لڑکی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھی پیچھے لگ گئے تھے۔ اس دن صبح جولاں دیکھی تھی وہ ڈی گاریکا کے لڑکے کی ڈان ونسٹ کے ساتھیوں نے اسے قتل کیا تھا۔“ البرونو خاموش ہو گیا۔

انور کی نگاہیں ڈی گاریکا کی طرف اٹھ گئیں جس کی آنکھوں میں دو موئے موئے تھیں جھلما رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

”نئے چارہ۔“ البرونو نے کہا اور انور کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”لیکن ڈی گاریکا یہاں پہنچا کس طرح۔“ انور نے کہا۔ ”اس کا ریکارڈ کسی سفارت میں نہیں ہے۔“

”وہ باقاعدہ اور جائز طور پر یہاں داخل نہیں ہوا۔“ البرونو نے جواب دیا۔

”اور تم۔۔۔۔۔!“ انور نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”تم کس سفارت خانے کے ذریعے یہاں آئے ہو۔ تمہارا بھی کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔“

”ہم لوگوں کو کسی ذریعے کی ضرورت نہیں۔“ البرونو کے ساتھی نے کہا پھر البرونو مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں نے ڈی گاریکا کی لڑکی کو نہیں دیکھا، کیا وہ کافی حسین ہے۔“

”بکومت۔۔۔۔۔!“ البرونو اسے گھورنے لگا۔

”تو یہ ڈرامہ کب ختم ہوگا۔“ انور نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے اعتباری تھی۔

”تم شاید ابھی تک اسے مذاق ہی سمجھ رہے ہو۔“ البرونو بولا۔

”حقیقت سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“

”آخر تمہیں کس طرح یقین آئے گا۔“

”ہاں..... میں نے اسکے لاکٹ میں دیکھی تھی۔ یہ لاکٹ اس کے ہار میں لگا ہوا ہے۔“
 ”بہر حال اب تمہیں اس پر یقین ہو جانا چاہئے۔“ البرونو نے کہا۔ ”یہ میکیکو کے ٹھکانہ
 بند گاہ ویرا کروڈ کا اخبار ہے۔“

انور نے اخبار اٹھایا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر البرونو کو گھور کر بولا۔

”مگر بس میں کسی شہزادی کا ذکر نہیں۔ تم کہہ رہے تھے کہ ڈی گاریکا نے اس کے قتل کی خبر
 مشہور کر دی تھی۔“

اس کی شہرت اس جزیرے میں ہوئی تھی۔ مہذب دنیا تو یہ بھی نہیں جانتی کہ اس جزیرے
 میں کوئی آبادی بھی ہے۔ دنیا کے ویران جزیروں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہاں کے
 باشندے نہیں چاہتے کہ مہذب دنیا ان کے وجود سے واقف ہو۔ حالانکہ وہ خود بھی کافی ترقی یافتہ
 ہیں اور ترقی یافتہ ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔

”البرونو کیا تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تمہارا مقصد کیا
 ہے لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تمہارے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”مجھے اس دشواری کا علم تھا کہ تم یقین نہ کرو گے۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔ ”خود مجھے
 حیرت ہے کہ اس جزیرے کے باشندے ایسی صورت میں اپنا وجود کیوں کر چھپائے ہوئے ہیں
 جبکہ وہ دوسرے ممالک سے بھی تعلقات رکھتے ہیں۔“

”جب تمہیں خود اس پر یقین نہیں آتا تو مجھے کیوں یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔“
 انور نے کہا۔ ”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے اس پر یقین نہیں۔ یقین ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ
 حیرت بھی۔“

انور خاموش ہو گیا۔ البرونو بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ دفعتاً انور بولا۔
 ”ڈان ونسٹ نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ تمہاری اس سے انگلیٹھ میں لڑائی ہو چکی
 اس لئے تم اس کے جانی دشمن بن گئے ہو۔“

”یہ قطعی غلط ہے۔ اس کا تعاقب میں انگلیٹھ ہی سے کر رہا ہوں لیکن یہاں پہنچنے سے
 شاید اسے اس کا علم بھی نہ ہو۔ تم نہیں جانتے اس نے یہ شوشہ محض اس لئے چھوڑا تھا کہ ڈان

نیرہ
 کے قتل میرے سر قہو پ دیا جائے اور اسے اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ پولیس نے اسے
 بکر میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا اور میں نے بھی دیدہ دانستہ پولیس کو اس کا موقع دیا تھا۔“
 ”کیوں.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”میں اس لئے کہ ڈان ونسٹ جس مقصد کے لئے ہندوستان آیا تھا اسے آسانی سے پورا
 کرے۔“
 ”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”تم سمجھ شاید میں اختلاف بیانی سے کام لے رہا ہوں۔“ البرونو مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ
 جانتا تھا کہ ڈان ونسٹ ہندوستان جا رہا ہے.....“ البرونو خاموش ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا
 اور اس کی باتوں میں دلچسپی لینے کی بجائے دوسری طرف دیکھ رہا ہے۔ البرونو کے ہونٹوں پر
 ہراسہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے چہرے پر لگی ہوئی گھٹی ڈاڑھی
 کڑی۔ انور ابھی تک دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے جہاں سے بات ختم کی تھی وہیں
 پھر شروع کر دی۔ ”میں جانتا تھا کہ ڈان ونسٹ ہندوستان جا رہا تھا لیکن اس کے مقصد سے
 نکل گیا تھا۔ یہاں آ کر.....!“

”بس ختم بھی کرو۔“ انور یک بیک اس کی طرف مڑ کر بولا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں
 اس کے منہ سے ایک تحیر آمیز چیخ نکلی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ.....!“ انور کا منہ پھیل کر رہ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا
 ہے۔ البرونو کی جگہ ایشیا کا جوان سال اور دلیر سراغ رساں انپکٹر فریدی مسکرا رہا تھا۔

”اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔“ انور آہستہ سے بڑبڑایا۔
 ”تمہاری بے یقینی سے خدا ہی بچائے۔“ فریدی نے کہا۔

”کی نہیں..... یہ بات نہیں۔“ انور جلدی سے بولا۔
 ”تم اب زیادہ بدحواسیاں دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہم آج ہی ڈان ونسٹ کے تعاقب
 کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔“

”لیکن آخر آپ اس بھیس میں کیوں ہیں۔“ انور مضطربانہ انداز میں بولا۔

یہ گاریکا کا نام انہیں کی زبان سے سنا تھا۔ وہ اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا بل خاکہ ڈی گاریکا کی منزل ہندوستان ہو ہی نہیں سکتی ممکن ہے وہ وہاں سے کہیں اور بھی جائے کسی بولی کا تذکرہ آ گیا جسے وہ پکڑ کر اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ بہر حال ان کی گڈائی قسم کا معرہ تھی۔

فریدی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”جب آپ کو یہ نہیں معلوم کہ ڈان ونسٹ گیا کہاں تو آپ اس کا تعاقب کس طرح کریں گے۔“

”ظاہر ہے کہ وہ رشیدہ کو پا جانے کے بعد اس جزیرے کا رخ کرے گا اور یہ واضح ہے کہ ہری جیسے یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لئے کوئی غیر معروف ہی راستہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم کہیں سے بھی روانہ ہوں انہیں اس جزیرے میں داخل ہونے پہلے ہی جالیں گے۔“

فریدی اٹھ کر میز کی طرف چلا گیا اور آئینے میں دیکھ دیکھ کر دوبارہ اپنے چہرے پر مصنوعی کی لگانے لگا۔

”تم شاید ابھی تک یقین اور شجے کی کشش میں مبتلا ہو۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”نہیں تو.....!“ انور جلدی سے بولا۔ ”میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو شاید وہ مجھے ختم کر دیتے۔“

”اس میں تو شک نہیں۔“ فریدی نے مڑ کر ہونٹوں میں نیا سگار دباتے ہوئے کہا۔

انور نے پھر کچھ پوچھنا چاہا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔

”اب سوچتا ہوں تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”کوئی صحیح ملنا آئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا جیسی میں نے کی ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے کہ میں ان لوگوں کے پیچھے لندن سے یہاں تک دوڑتا چلا ہوں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے کہ میں ان لوگوں کے پیچھے لندن سے یہاں تک دوڑتا چلا ہوں۔“

”یہ بھیس میں نے یہیں آ کر بدلا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں دراصل خاموشی سے کرنا چاہتا تھا۔ اس دن سڑے پول ہوٹل میں میں نے ہی تم لوگوں کو ایک خط بھجوایا تھا حالانکہ نے غلطی کی تھی اور اسی غلطی کی تلافی کے لئے مجھے رائفل کلب والے مقابلہ میں حصہ لینا پڑا۔ پولیس اسے چھوڑ کر میرے پیچھے لگ گئی۔ اگر ڈان ونسٹ کی نقل و حرکت دیکھی جاتی تو وہ کام نہ کر سکتا۔ کل رات کو بھی عجیب اتفاق پیش آیا تھا۔ ڈی گاریکا سے میں کل رات ہی روانہ ہوا۔ ڈان ونسٹ کے ساتھی اس کا تعاقب کر رہے تھے اور میں ان کے تعاقب میں تھا اور یہ یہ معلوم ہوا کہ انہیں جس لڑکی کی تلاش تھی وہ رشیدہ تھی۔ لہذا اس صورت میں مجھے خاص طرح کی پکسی لینی پڑی۔“

”پولیس والے آپ کی تلاش میں بری طرح سرگرداں ہیں۔“

”ان لوگوں کو بیوقوف بنانا مشکل نہیں۔“ فریدی نے کہا اور بجھا ہوا سگار سلگانے لگا۔

”اچھا تو دوسرے صاحب میاں حمید ہیں۔“

”ظاہر ہے۔“

”رشیدہ کے متعلق آپ کو یہ ساری باتیں ڈی گاریکا سے معلوم ہوئیں۔“

”ہاں..... کل رات کو اس نے مجھے سارا واقعہ بتایا۔“

”وہ آپ کو البرونو ہی کی حیثیت سے جانتا ہے۔“

”ہاں..... اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ ورنہ وہ بھڑک جائے گا۔ میں اس اندیکھے جزیرے سفر کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن آپ ڈان ونسٹ کے پیچھے کس طرح لگ گئے تھے۔“

”ایک دن ہم لوگ لندن کے جفریز ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ہمارے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا چیف انسپکٹر براؤن بھی تھا۔ ہمارے قریب ہی ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ براؤن نے مجھے بتایا کہ یہ ان لوگوں کو مشتبہ سمجھتا ہے اور اس دوران میں انہوں نے کچھ ایسی حرکتیں بھی کیں کہ مجھے دلچسپی لینے پر مجبور ہو جانا پڑا اور پھر مجھے ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ میں تھوڑی بہت اسپینی ہوا۔ سمجھ لیا ہوں۔“

ہندوستان میں کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں جس پر ڈان وٹسٹ نے کہا کہ وہاں سب آرام سے رہتے ہیں وہاں کی پولیس اتنی ذہین نہیں ہے کہ کام میں حارج ہو سکے۔
”اوہ.....!“

”اور پھر میں ان کے پیچھے لگ گیا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اگر ڈی سالٹ خود بھی کر لیتا۔!“

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور فریدی اچانک خاموش ہو گیا۔ آنے والا ڈی گاریکا وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا رہا اور فریدی سر ہلا ہلا کر سنتا رہا۔ بہر حال ڈی گاریکا کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر فریدی نے اس سے کچھ کہا اور وہ مسکرا کر واپس چلا گیا۔
”یار میں حمید سے عاجز آ گیا ہوں۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”کیوں؟ کیا ہوا۔“

”ڈی گاریکا نے شاید اس سے اپنی لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو یہیں کہیں ہوٹل میں ٹھہری ہے۔ لہذا وہ اسے بحفاظت تمام یہاں لانے کا وعدہ کر کے گیا ہے۔ ڈی گاریکا افسوس ظاہر تھا کہ اس نے اس کام کے لئے اپنی خوبصورت ترین ڈاڑھی چھیل کر رکھ دی اور ایک ہفتہ کے بھیس میں گیا ہے۔ اسے اس بات پر حیرت ہے وہ ہم لوگوں سے اس بُری طرح مرعوب ہے کہ ہمیں اپنے پراسرار جزیرے میں لے جانا چاہتا ہے حالانکہ یہ اس قوم کی تاریخ میں واقعہ ہوگا۔ وہاں آج تک کسی غیر ملکی کے قدم نہیں پہنچے۔“

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ انور نے کہا۔

”میری معلومات کا انحصار محض ڈی گاریکا کے بیان پر ہے۔ حقیقت کیا ہے اس کے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈی گاریکا نے بتایا ہے کہ اس جزیرے کے باشندے لڑاؤ میں۔ اسپین کے سپہ سالار کورٹے نے جب میکسیکو پر حملہ کیا تھا اس وقت وہاں موئے زہ حکومت تھی۔ اتفاقاً کورٹے کا ایک سردار اپنے دستے سمیت موئے زوما سے مل گیا۔ اس کا باعث موئے زوما کی حسین لڑکی اوتانی تھی وہ اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ کورٹے نے موئے کو شکست دے دی اور وہ سردار اوتانی اپنے دستے سمیت فلوریڈا ہوتا ہوا جزائر بہامہ کی

ہو گیا۔ پھر انہوں نے ایک غیر آباد جزیرے میں پناہ لی جو جزیرہ اینڈروس اور جزائر وانلنگ درمیان میں واقع ہے۔ چونکہ آج بھی لوگوں کو یقین ہے کہ وہ جزیرہ غیر آباد ہے اسلئے وہ نائی لینڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ ڈی گاریکا کہتا ہے کہ وہ جزیرہ کبھی غیر آباد نہیں تھا۔ وہاں اب بھی جنگلوں میں کہیں کہیں قدیم لٹے ہیں۔ لیکن وہ نیم وحشی ہیں۔ وہاں اب تک شہنشاہیت قائم ہے۔“

انور کے ہونٹوں پر گویا مہر لگ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔ اگر بلی کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اسے الف لیلا کی ہی کوئی داستان سمجھتا۔ مگر اب وہ سوچتا تھا کہ اگر ڈی گاریکا کا بیان غلط بھی ہو تب بھی رشیدہ کی شخصیت پر اسرار ہی رہتی ہے۔ اگر وہ بہتان ہے تو کسی غیر ملکی کا اس میں اس طرح دلچسپی لینا کیا معنی رکھتا ہے۔

”تو پھر تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں رشیدہ کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔“ انور آہستہ سے بولا۔

”ٹھیک مجھے تم سے یہی امید ہے۔ ڈی گاریکا تمہارا احسان مند ہے کہ تم نے رومولی کی فائت کی۔ ڈی گاریکا اکثر اس سے ملتا رہتا ہے۔ رشیدہ نے تمہارے متعلق اسے سب کچھ بتا دیا ہے وہ تمہارے کردار کی بلندی کا معترف ہے۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے متعلق سوچ رہا تھا کہ اس کے یکایک غائب ہونے پر باہر ہو سکتا ہے کہ پولیس اپنا شبہ یقین میں بدل دے۔ وہ کافی دیر تک الجھتا رہا لیکن یہ خیال اس کے پھر اطمینان ہو گیا کہ انسپکٹر فریدی اس کے ساتھ ہوگا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ آج ہی فوراً طور پر اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جائے گا۔ بہانہ رشیدہ کی تلاش کا ہوگا۔ جن کی گمشدگی سائیکل واقف ہو چکے ہیں۔

روانگی

”عجب اتفاقات ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی

و اصل ان لوگوں سے حماقتوں پر حماقتیں سرزد ہوئیں۔ ”فریدی سگار ساگاتا ہوا بولا۔ ”انہو بولکھاٹ میں اسے قتل تو کر دیا لیکن چونکہ باضابطہ طور پر یہاں آئے تھے اور ان کا ریکارڈ غاس لئے خوف دامن گیر ہوا کہ پولیس انہیں تنگ کرے گی لہذا وہ کھلم کھلا سامنے آگئے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اس طرح ڈی گاریکا دھوکا بھی کھا جائے گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ یہ لانے کھانے کے لئے نکلے ہیں لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ڈی گاریکا کے لڑکے کی شکل بگاڑا اس لئے وہ اسے کوئی اتفاقیہ حادثہ سمجھنے کیلئے تیار نہیں تھا اور پھر اچانک ڈان ونسٹ وغیرہ نے آج کل کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی دوسری دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔“

مصنف نے کسی ناول کا پلاٹ بکھیر دیا ہو۔ جو واقعات مجھ پر گزرے ہیں بعض اوقات میں انہی بھی کہانیاں سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ انور کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”تم خود سوچو۔“ فریدی بچھا ہوا سگار ایش ٹرے میں ڈالتا ہوا بولا۔ ”کیا اس وقت میری شخصیت کسی ناول کے پراسرار جاسوس کی شخصیت سے کم ہے۔ اگر کبھی کسی نے یہ واقعہ لکھنے کی کوشش کی تو کیا پڑھنے والے اسے شاندار گپ نہیں سمجھیں گے۔“

”مجھے تو آج کل کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی دوسری دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔“ انور نے کہا۔

”بہر حال ہم حقائق سے دوچار ہیں جنکی صداقت مستقبل کے دھندلکے میں کھوئی ہوئی ہے۔“

”لیکن ہم سفر کس طرح کریں گے؟“ انور نے پوچھا۔

”یہاں سے فلیج فارس تک ہم چوری چھپے جاسکتے ہیں۔ ڈی گاریکا نے اس کا انتظام یہاں ہی کر رکھا ہے۔ اس سے قبل بھی وہ بحرین تک باضابطہ طور پر آیا کرتا تھا اور بحرین سے یہاں تک غیر قانونی طریقے پر۔ ہاں تو ہم یہاں سے بحرین تک معمولی قانون شکنی کرنے والوں کی طرح جائیں گے اور بحرین سے میں انتظام کر لوں گا۔“

”تو اس بار بھی وہ لندن سے بحرین آیا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”لیکن ڈان ونسٹ وغیرہ تو باضابطہ طور پر آئے تھے۔“ انور نے کہا۔ ”اس طرح ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔“

”ہاں..... بے چارہ ڈی گاریکا اس سے ناواقف تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی کا علم ہمیں آ کر ہوا۔ لیکن شاید ڈی گاریکا کا لڑک

اس بات سے پہلے ہی واقف ہو گیا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔“

”مگر اس کے بعد وہ لوگ اچانک منظر عام پر کیوں آ گئے تھے۔ تنج زنی کے مقابلے کی

سے ان لوگوں کی خاصی شہرت ہو گئی تھی۔“

فریدی اور انور کافی دیر تک سفر کیا اسکیم پر بحث کرتے رہے پھر انور واپس آ گیا۔ آفس راس نے اسے لکھا لیکن پھر بذات خود اس نے منجر تک پہنچانے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اسے اس میں زیادہ بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح بات کے قبل از وقت ہی پھیل کا اندیشہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا پولیس انور کے پیچھے پڑ جاتی۔ ڈان ونسٹ غائب ہو چکا تھا رو پلے ہی سے پولیس والوں کے لئے چھلا دایا ہوا تھا۔ اب رشیدہ کی شخصیت بھی پراسرار بنے ہوئے والے حادثات سے منسلک ہو چکی تھی۔ لہذا پولیس کے لئے تاش کا آخری پتہ لیا تھا۔ انور سوچنے لگا کہ اگر اب اس سے کوئی غیر معمولی حرکت سرزد ہوئی تو وہ فریدی کی ہوئی اسکیم میں حصہ لینے سے پہلے ہی پریشانیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ لہذا اس نے یہ طے کیا کہ اپنا اٹھنے بذریعہ ڈاک بھیجے گا۔ رشیدہ کے غائب ہونے کی خبر پھیل چکی تھی۔ دفتر کے لوگ اس کے بارے میں پوچھتے رہے اور وہ انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں ڈالتا رہا۔ تقریباً چھ بجے اور گھر روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب نہ کر رہا ہو۔ لہذا اس نے ہائمر روڈ کے چوراہے سے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چلنے لگا۔“

گھر روڈ سنسان پڑی تھی۔ دور دور تک کسی کا پتہ نہیں تھا۔ انور اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد ”آئینہ“ میں داخل ہو گیا۔ اس بار اس نے گھٹی بجانے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ دروازہ کھولا تو وہاں بے دھڑک اندر گھستا چلا گیا۔

”پردہ ہے اندر زنا نہ ہے۔“ کسی نے قریب ہی سے اردو میں کہا۔

انور نے پلٹ کر دیکھا پیچھے سرجنٹ حمید کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”تو تم جامہ انسانیت میں آ گئے۔“ انور نے کہا۔

”جان من میں کسی لڑکی کے سامنے ایسا حلیہ نہیں بناتا کہ وہ مجھے لفٹ ہی نہ دے۔“

”تو پھر اسی شکل میں اسے بلانے گئے تھے۔“

”قطعی..... میں فریدی صاحب کی طرح بزدل نہیں ہوں۔“ حمید اڑکڑ بولا۔

”خیر چھوڑو ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اس بار تمہاری بھی ساری شیخی ہوا ہوگی۔“

”لوٹے ہو۔“ انور بُرا سامنے بنا کر بولا۔

”میں تو خیر لوٹا ہوں لیکن تم لوٹے سے بھی بدتر ہو۔ کل رات کو میں نے تمہیں چما

تھا۔“

”ایسے اتفاقات بہادروں ہی کو پیش آتے ہیں۔“ انور نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا

”بہادر میاں ذرا اپنے آنسو تو سکھا لو۔ بہت روئیں گے ان کو ہم یاد کر کے چلے دل

جو بر باد کر کے۔“

دفعتاً فریدی ان کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور جھلائے ہوئے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

”تم لوگ سب چوہٹ کر دو گے۔“ پھر حمید کی گردن پکڑ کر کہا۔ ”تمہاری شامت آجائے گا

”شامت بھی اتفاق سے مونت ہے۔“ حمید متہ بنا کر بولا۔

فریدی اسے گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم رشیدہ کا چکر چھوڑ دو۔“ حمید نے انور سے کہا۔

”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں خواہ مخواہ اپنی بھی جان دو گے۔ اگر تم باز آ جاؤ تو میں فریدی صاحب کو کسی

طرح روک ہی لوں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”ویسے تو ہمیشہ انکے سر پر ایڈوینچر کا بھوت سوار رہتا ہے

”اگر فریدی صاحب نہ جائیں تب بھی ڈی گاریکا کی ساتھ میں جاؤں گا۔“

”عشق بُری بلا ہے۔“ حمید منہ سکھا کر بولا۔ ”خدا بروز قیامت تمہیں مجنوں کے دبا

ٹرن کرے۔ آمین چلے تشریف لے چلے۔“

حمید نے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ہال میں ڈی گاریکا اس کی لڑکی اور فریدی بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

”سی نور انور سعید۔“ فریدی نے اٹھ کر تعارف کرایا۔ ”اور سی نور رمونا ڈی گاریکا۔“

رمونا کھڑی ہو کر بڑے پکلیے انداز میں انور کی طرف جھکی جس پر انور نے بھی اس کی تقلید

کی۔ پھر دونوں بیٹھ گئے۔ سرجنٹ حمید رمونا سے اجازت لے کر اپنا پائپ سلگانے لگا۔

”مجھے تمہا کو کے دھوئیں سے نفرت نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ حمید نے کہا اور وہ بھی ایک خالی صوفے کے

تھے پر بیٹھ گیا۔

”ہم ساحل تک کس طرح جائیں گے؟“ ڈی گاریکا نے فریدی سے پوچھا۔

”یہ ساری باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔“

”شاید آپ کو معلوم نہیں۔“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ ”پولیس نے آپ کی گرفتاری کے

لے پانچ ہزار روپے کا انعام مقرر کیا ہے۔ لہذا اس وقت آپ کو کوئی ایسی سڑک نہیں ملے گی جس

پانچاں نہ روکی جا رہی ہوں۔“

”اوہ..... یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ تم لوگ بس دیکھتے رہو۔“ فریدی نے کہا اور اٹھ کر ٹہلنے

لگا۔ پھر حمید کی طرف اشارہ کر کے ڈی گاریکا سے بولا۔ ”میرا دوست اپنی ڈاڑھی صاف کر ہی چکا

ہے اب میری بھی صاف ہو جائے گی۔“

”مجھے بہت افسوس ہوگا۔“ ڈی گاریکا متاثرانہ لہجے میں بولا۔ ”اتنی شاندار ڈاڑھی۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”کوئی بات نہیں پھر آگ آئے گی۔“

حمید اس کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی نظریں رمونا کے ہونٹوں پر جمی

تھیں جن کا سلگتا ہوا ابھار اس کے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔

”جلدی کرو۔۔۔۔۔ تمہارا میک اپ بھی ضروری ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”پولیس تمہاری طرف ملن نہ ہوگی۔“

ایک جھٹنے بعد انور اپنے گھر میں ضروری سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ اس سے فرصت پا کر وہ اپنی مائیکل لے آیا جس کی مرمت ہو چکی تھی۔ اسے کیراج میں بند کرنے کے بعد اس نے اٹھایا لیکن پھر سوچنے لگا سامان سمیت آشیانہ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی لے ہی جائے۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر سامان لے کر نیچے اترا۔ قریب ہی ایک کڑی تھی۔

”ہوٹل آرکچو.....!“ انور نے سامان رکھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے ہی جا رہا تھا کہ غیر ارادی طور پر پیچھے کی طرف مڑا۔ انپکٹر آصف کھڑا رہا تھا۔

”ہوٹل آرکچو کیوں.....؟“ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔
”اوہ آصف.....!“ انور نے کہا۔ ”میں خطرے میں ہوں۔“
”یعنی.....!“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ بتاؤں۔“
”ہوٹل میں آؤ..... جلد لیش نے تمہارے پیچھے آدی لگا رکھے ہیں۔“
”ہوگا بھی..... لیکن وہ آدی میری جان نہیں بچا سکیں گے۔ میں فی الحال گھر میں نہیں رہتا۔“

”درو نہیں۔“ آصف تشفی آمیز لہجے میں بولا۔ ”البرنو اب دوسری حرکت کی ہمت نہ لگا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کی گرفتاری کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔“
”مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر البرنو آدی نہیں بھوت ہے۔“
”یہ تم کہہ رہے ہو۔“ آصف متحیر ہو کر بولا۔

”اُس میں تعجب کی بات نہیں۔ میں البرنو کے مقابلہ میں ہمت ہار چکا ہوں اور پھر ایسی شے جس کی یہ نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے کیوں الجھنا چاہتا ہے۔ میرے لئے بچاؤ کے

اسے معاف کرتا ہوں۔ شاید البرنو نے اسے زیادہ پلا دی۔“

انور دانت پیسنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اسے فریدی کی بات یاد آگئی۔ وہ فوراً ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں نہیں خام نہیں۔“ رمونا جلدی سے بولی۔ ”یہ شہزادی صاحبہ کے دوست ہیں۔“
”خیر ہوگا..... مجھ سے کیا غرض۔“ حمید نے کہا۔ ”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آدی نشتہ بالکل چغہ ہو جاتا ہے۔“

”میں نشتہ میں ہوں۔“ انور بگڑ کر بولا۔

”خیر خیر..... میں کم رتبہ آدمیوں کو منہ لگانا نہیں پسند کرتا۔“

”کم رتبہ۔“ انور آستین چڑھاتا ہوا بولا اور رمونا ان کے درمیان میں آگئی۔

”تم لوگ یہ کیا کرنے لگے۔“ رمونا نے کہا۔ ”یہ جھگڑا کرنے کا وقت نہیں۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا اور پیچھے ہٹ گیا۔ انور تھوڑی دیر تک اسے گھورتا رہا۔ پھر مٹھیاں بھینچتا ہوا اندر واپس آیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سرجنٹ حمید سے اس کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور وہ آخر وقت تک ڈنٹا رہتا تھا۔ مگر آج اس کی روح غم گہرائیوں میں غوطے کھا رہی تھی۔ اس کی ساری ظرافت اور بذلہ سخی رخصت ہو گئی تھی۔ طنز زہریلے تیرکند ہو گئے تھے اور پھر وہ خود کو ایک معمولی آدی تصور کرنے لگا تھا۔ اس کا دماغ مرزا رشیدہ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ذہانت اب کبھی واپس نہ لے جیسے وہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو گیا ہو۔

ہال میں پہنچ کر وہ ٹہلنے لگا۔ اتنے میں فریدی نے اسے دوسرے کمرے میں آواز دی۔
”تم نے اپنے انتظامات مکمل کر لئے۔“

”مجھے کوئی خاص انتظام نہیں کرنا ہے۔“ انور نے کہا۔ ”ضروریات کے لئے صرف اب

سوٹ اور ایک بستر کافی ہوگا۔“

”تو وہ سب کہاں ہیں۔“

”میں ابھی لاتا ہوں۔“

امکانات ختم ہو گئے ہیں۔“

”تم کل تک اس کی لاش دیکھو گے۔“ آصف نے کہا۔ ”وہ جہاں بھی دکھائی دیا اسے کل ماری جائے گی۔ کیونکہ وہ غیر قانونی طریقے پر ملک میں داخل ہوا ہے۔“

”خیر بھی..... اسے اپنے ہی تک رکھنا کہ میں آرکچو میں مقیم ہوں۔ تم مجھ سے وہاں مل سکتے ہو کمرہ نمبر بانویں۔“

انور نے ٹیکسی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

اسکے منہ سے خواہ مخواہ آرکچو نکل گیا ورنہ ارادہ کچھ اور تھا..... بہر حال اسے اس اتفاق پر خوشی ہو رہی تھی کہ آصف دھوکہ کھا گیا۔ ڈرائیور دوسری طرف ٹیکسی موڑنے والا تھا کہ انور بولا۔
”آرکچو نہیں..... گجراج گھاٹ۔“

ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ انور کا خیال تھا کہ وہ لوگ گجراج گھاٹ ہی کی طرف جائیں گے۔ کیونکہ وہ ادھر سے غیر ممالک کی ناجائز درآمد و برآمد کے متعلق پہلے ہی سنا تھا۔ گجراج گھاٹ پہنچ کر اس نے سامان ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اتارا اور اسی ٹیکسی پر بٹن کی طرف روانہ ہوا۔ سرکلر روڈ کے موڑ پر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ دس دس کے پانچ نوٹ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”میں کہاں اترا ہوں۔“ انور نے ڈرائیور سے پوچھا جو ان نوٹوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
”آرکچو ہوٹل میں۔“ ڈرائیور مسکرا کر بولا۔

”بہت خوب! سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ انور نے اس کا شانہ چھپکتے ہوئے کہا۔
”جی..... میں جانتا ہوں کہ پولیس والوں سے آپ کی چلتی رہتی ہے۔“

”کیا تم مجھے پہچانتے ہو.....؟“ انور چونک کر بولا۔

”ارے صاحب میں آپ کے قریب ہی رہتا ہوں۔“

”ٹھیک! بہت اچھے۔ ہاں میں نے تمہیں کم تو نہیں دیا۔“

”نہیں صاحب بہت ہے۔“ ڈرائیور اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔

”تم ٹیکسی بیک کی اور انور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے چل کر وہ مڑا..... بہت دور ٹیکسی کی سرخ روشنی

رہی میں غم ہوتی جا رہی تھی۔

دو فلاگ بیدل چلنے کے بعد وہ آشیانہ کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔

فریدی وغیرہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انور نے رمونا کو پہلے نہ دیکھا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ غلطی سے کسی دوسری عمارت میں گھس آیا ہے۔ کیونکہ فریدی حمید اور ڈی گاریکا کی شکلیں بالکل

لی ہوئی تھیں۔ فریدی کو اس نے آواز سے پہچانا ورنہ یہ معلوم کرنا بھی دشوار تھا کہ ان میں سے بی کی کون ہے۔ اس نے ہندوستانی رجواڑوں کے رانچوت سرداروں جیسی شکل بنا رکھی تھی۔

بن حمید اور ڈی گاریکا فوجی لباس میں تھے۔ انور کو سب سے زیادہ حیرت ڈی گاریکا کی رنگت

پر ہوئی۔ فریدی نے اسے گندی رنگت کا ایک ہندوستانی بنا دیا تھا۔ سرجنٹ حمید اینگلو انڈین

لوم ہوتا تھا۔
انور نے دیر سے پہنچنے کا سبب بیان کیا اور فریدی ہنسنے لگا۔
”تمہارا اندازہ سو فیصدی صحیح ہے۔ ہم گجراج گھاٹ ہی کی طرف روانہ ہوں گے۔“

”لیکن آپ لوگوں کے ساتھ میری موجودگی درست نہیں معلوم ہوتی۔“ انور نے کہا۔
”گھبراؤ نہیں۔ تمہارا بھی میک اپ کیا جائے گا۔ تمہارا وہی پادری والا پرانا میک اپ زیادہ

ست رہے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔“
فریدی انور کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میک اپ کا سامان ایک بڑی سی میز پر بکھرا ہوا

فریدی نے انور کے سر کے بالوں کی مناسبت سے اس کے چہرے پر سرخی مائل ڈاڑھی

پائی اور سوٹ کیس سے کتھی رنگ کا ایک گاؤن نکال کر پہنا دیا۔
اور مگر جب وہ باہر آئے تو ڈی گاریکا بے اختیار اچھل پڑا۔
”اگر تو تم جیج اس قابل ہو کہ پوجے جاؤ۔“

”میں نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“ رمونا بولی۔
”اور مجھ جیسا آدمی.....!“ حمید نے پوچھا۔

”تم آدمی کب ہو۔“

”کیا مطلب.....!“

”مطلب یہ کہ تم آدمی نہیں شہزادے ہو۔“ رمونا نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

فریدی پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس لٹکائے ہوئے

واپس آیا۔

”ہمارا ضروری سامان پہلے ہی گجراج پہنچ چکا ہے۔“ فریدی نے انور سے کہا۔

وہ سب مکان سے باہر آئے۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کے : انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔

راتے میں کئی پولیس والوں نے انہیں روکا اور ڈی گاریا کو یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی کہ البرٹو ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کر سکتا ہے۔

گجراج گھاٹ پہنچ کر انور کو پھر اپنی صحیح شکل میں آ جانا پڑا۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا

سامان نہیں لے سکتا تھا۔

ایک کافی بڑی موٹر بوٹ سمندر کی پرسکون سطح پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ سامان بار کر دیا گیا

اور وہ اطمینان سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ موٹر بوٹ کافی طویل و عریض تھی جس کے

درمیان میں ایک بڑا سا کیمین تھا۔ کیمین دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ مسافروں کے لئے تھا

اور دوسرا موٹر بوٹ کے عملہ کے لئے۔

اسٹرو کرنے انجن اشارت کیا ہی تھا کہ گھاٹ پر کئی ٹارچوں کی روشنیاں دکھائی دیں یہ کہ

قسم کا اشارہ تھا جس پر انجن بند کر دیا گیا۔ بھاری بھاری قدموں کی آوازیں نزدیک آتی محسوس

ہو رہی تھیں۔ دفعتاً دو پولیس انسپکٹر اور کچھ کانسٹیبل موٹر بوٹ پر چڑھ آئے۔

”کہاں جائے گا۔“ ایک پولیس انسپکٹر نے بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔

”ریاست دیر گڑھ۔“ فریدی پر غرور آواز میں بولا۔ ”یہ ریاست کی سرکاری موٹر بوٹ ہے۔“

”سامان کدھر ہے۔“

”کیوں اپنا اور ہمارا وقت برباد کرتے ہو۔ ہم کوئی چیز ناجائز طور پر نہیں لے جا رہے

ہیں۔“ فریدی نے کہا اور انسپکٹر اسے گھورنے لگا۔

”تمہارا نام.....!“

زلی گھوراج سنگھ.....!“ فریدی پر وقار انداز میں اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

”معاف کیجئے گا..... راجہ صاحب۔“

ہی والے موٹر بوٹ سے اتر گئے۔ انجن پھر اشارت ہوا اور موٹر بوٹ سمندر کے پھرے

نے بھرنے لگی۔

ایا بات تھی۔“ ڈی گاریکا نے پوچھا۔

ایا خاص بات نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں نے انہیں ہکا دیا۔“

خواہ خواہ جاگتے رہنا فضول ہے۔“ رمونا اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف

بلا۔

تمہارے اس خیال کی قدر کرتا ہوں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”مگر البرٹو کھڑے کھڑے

اڑی ہے۔“

کھڑے کھڑے.....!“ رمونا نے متحیر ہو کر پوچھا۔

ایا اور ایک آنکھ سے جاگتا رہتا ہے یعنی کہ یوں۔“ حمید نے رمونا کی طرف دیکھ کر

بذکرتے ہوئے کہا اور رمونا جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

رے کم بخت تم اس کے باپ کے سامنے اسے آنکھ مار رہے ہو۔“ فریدی جھلا کر اردو

بلا۔

ای گاریکا..... البرٹو اس طرح سوتا ہے۔“ حمید نے ڈی گاریکا کو بھی آنکھ ماری اور ڈی

بانتھارہٹس پڑا۔

البرٹو تمہارا ساتھی بہت پیارا ہے۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

نہت.....!“ فریدی ہونٹ سکڑ کر بولا۔

نہانے ایک سوٹ کیس سے شب خوابی کا لباس نکالا اور غسل خانے کی طرف چل پڑی۔

البرٹو تم کتنی زبانیں جانتے ہو۔“ ڈی گاریکا نے فریدی سے پوچھا۔

انہا کی کئی مشہور زبانیں..... میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہوں۔“

تمہارے حیرت ہے۔“

”یورپ کی زبانیں قریب قریب ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے یورپ
لئے ان کا سیکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن مشرقی زبانیں تم نے کس طرح سیکھیں۔ جبکہ ان
الخط یورپین رسم الخط سے بالکل مختلف ہے۔“

”میں صرف بول سکتا ہوں لکھ نہیں سکتا۔“ فریدی نے کہا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم عرصے تک مشرق میں رہے ہو۔“

”ہاں..... آں..... میں تو ایک سیلانی آدمی ہوں۔ مشرق و مغرب شمال و جنوب

لئے ایسے ہیں جیسے کسی مکان کے چار کمرے۔“

ڈی گاریکا اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو پھر تھوڑی دیر
بولا۔ ”تم بہر حال ایک حیرت انگیز آدمی ہو۔“

رمونا شب خوابی کے لباس میں غسل خانے سے برآمد ہوئی۔ اس کی بڑی بڑی بنو
آنکھیں نیند سے بوجھل نظر آ رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کا ریشمی لباس اس کی نقری گردن میں ایسا
ہو رہا تھا جیسے کالی رات ابھرتے ہوئے اجالے کو ڈنکے کی کوشش کر رہی ہو۔ حمید نے ایک لمبا
انگڑائی لی اور انور کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کے کان میں آہستہ سے بولا۔

”قیامت ہے۔“

”تم چنچہ ہو۔“ انور نے اسامہ بنا کر بولا۔

”اور تم.....!“

”اُلو کا پٹھا.....!“ انور جھلا کر بولا۔ اس کا دماغ پتھر کی سل ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔
یہ سفر انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا تھا۔ الف لیلے کے سند باد جہازی کا سفر۔ کسی سترے
کے ہیر و کار و اسی سفر..... ایسا سفر جو پڑھنے والوں کی گھٹیا مذاق کی تسکین کیلئے تشکیل دیا جاتا ہے
اسے اپنی ذات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے ہی مذہب میں جاتا ہو گیا ہے اگر وہ کسی ایسے
کے متعلق کسی کتاب میں پڑھتا تو بے شک اسے کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیتا۔

ہم شہنشاہ

بحرین پہنچ کر فریدی اور حمید اپنی اصل شکلوں میں آ گئے۔ انور نے بھی پادری کا لباس اتار
لیکن ڈی گاریکا کو احتیاطاً ایک ہندوستانی ہی کے لباس میں رہنے دیا گیا۔ ڈی گاریکا کے
اس کے بیٹے اور بیٹی کے پاسپورٹ تھے۔ یہاں سے فریدی اور حمید بھی اپنے بین الاقوامی
ورث استعمال کر سکتے تھے۔ اب سوال انور کا رہ گیا تھا۔ اس کے لئے شاید فریدی نے کوئی
برونج لی تھی۔ غالباً اسی لئے ڈی گاریکا وغیرہ کو اطمینان دلانا رہا تھا۔

فریدی کا خیال تھا کہ ڈان ونسٹ وغیرہ بھی فرار کے لئے بحرین کا راستہ اختیار کریں
۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ یہاں سے گزر گئے یا ابھی پہنچے ہی نہیں۔

انور ڈی گاریکا اور رمونا کو ایک ہوٹل میں چھوڑ کر فریدی اور حمید ڈان ونسٹ کا پتہ لگانے
لئے نکل گئے۔ انور دن بھر ڈی گاریکا سے اٹلے سیدھے سوالات کرتا رہا۔ وہ دراصل ڈی
گاریکا کے بیان کی طرف سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”ہم لوگ جمہوریت کو مضحکہ خیز تصور کرتے ہیں۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔ ”اسی لئے ہمارے
ماہی تک شہنشاہیت قائم ہے۔ لیکن ہماری شہنشاہیت تمہاری جمہوریت سے کہیں زیادہ بہتر

”اسی لئے تمہارا موجودہ حکمران تخت کے جائز وارث کے قتل کی کوشش کر رہا ہے۔“ انور
لہجے میں بولا۔

”اوہ..... کیا تمہاری جمہوریت کا دامن اس بدنما داغ سے پاک ہے؟ کیا تمہارے یہاں
انوار لایف رول نہیں کئے جاتے۔ شہنشاہیت میں تو صرف ایک نالائق سے دو چار ہونا پڑتا ہے
جمہوریت میں نالائقوں کی ایک پوری ٹیم وبال جان بن جاتی ہے۔ ایک نالائق سے چھپا
آسمان ہے لیکن پوری ٹیم سے پنپنا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر ہمارے ملک کا دستور کچھ اس
طرح ہے کہ شہنشاہ اور رعایا ہر حال میں ایک دوسرے کے پابند ہوتے ہیں تم دیکھو گے کہ ہم کس

آسانی سے اپنے موجودہ حکمران کو معزول کر دیتے ہیں۔“

انور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

”لین تمہاری قوم کب تک پیپی رہے گی۔“

”اس کے تعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ ڈی گاریکا فکر مند انداز میں بولا۔

”ہو سکتا ہے تم ہی لوگوں کا جو ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے

ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ البرونوئی مدد کے بغیر ہم شہزادی بونہ پاسلیں گے۔“

”حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اب بھی تمہارے بیان پر شبہ ہے۔“

”یعنی۔۔۔۔۔!“

”تمہارا بیان کردہ جزیرہ مجھے بالشتیوں کی سرزمین معلوم ہو رہا ہے۔“

”تم خود دیکھ لو گے۔“ ڈی گاریکا مسکرا کر بولا۔

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اور اگر میرا بیان درست ہے تو پھر میں چند غیر ملکیوں کو خواہ مخواہ کیوں پریشان کرنا

ہوں۔ کیا تم مجھے صحیح الدماغ نہیں سمجھتے۔“ ڈی گاریکا نے سنجیدگی سے کہا۔

پانچ بجے شام کو فریدی اور حمید واپس آئے۔ حمید نے اپنے فلت بیٹ میں کانڈ کا ایک

بہت بڑا پھول لگا رکھا تھا اور دونوں جیسیں چاکلیوں اور ٹافیوں سے بھر رکھی تھیں۔

”اس وقت تم کچ مجھ روٹی شہزادے معلوم ہو رہے ہو۔“ رمونا طنز یہ لہجے میں بولی۔

”روٹی شہزادے۔“ فریدی حمید کی طرف تعجب آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

گڑبڑ مت کیجئے۔“ انور آہستہ سے اردو میں بولا۔ ”حمید اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ زارا

روس کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“

فریدی نے برا سامنہ بنایا اور ڈی گاریکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھی کل یہاں پہنچے تھے اور کل ہی کسی نامعلوم جگہ کے لئے

روانہ ہو گئے۔ وہ پانچ تھے۔“

”پانچ۔۔۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن ان میں کوئی عورت نہیں تھی۔“

”اوہ تو کیا انہوں نے اسے مار ڈالا ہے۔“ ڈی گاریکا بے چینی سے بولا۔

”نہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک بوڑھا مریض تھا جو بحرین کے ماسل

ہوٹی کی حالت میں اتارا گیا تھا۔“

”بوڑھا مریض۔۔۔۔۔!“ ڈی گاریکا حیرت ظاہر کرتا ہوا بولا۔ ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے رشیدہ کو بیہوش کر کے اس پر بوڑھے کا میک اپ کر دیا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ ڈی گاریکا کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ڈان ونسٹ شاہی محکمہ سراغ رسانی کا افسر

ہے۔“

”وہ لوگ انصار کمپنی کی ایک دخانی کشتی میں روانہ ہوئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ

لبنی کی کشتیاں صرف بحر روم تک چلتی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ ڈی گاریکا اچھل کر بولا۔ ”تب وہ یقیناً جبرالٹر میں اتریں گے۔ جبرالٹر میں

نابلیک خفیہ ایجنسی ہے۔“

”تو پھر آج رات کو ہم بھی روانہ ہو رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”مگر انور کا کیا ہو گا وہ کس طرح سفر کرے گا۔“ ڈی گاریکا تشویش آمیز لہجے میں بولا۔

”میں سب کچھ کر لوں گا۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ایک بات یہ بتاؤ

اے بیٹے کی آنکھوں کی رنگت کیسی تھی۔“

”بہتر۔۔۔۔۔!“ ڈی گاریکا تھوڑی دیر بعد گلوگیر آواز میں بولا۔

”اور بالوں کی۔۔۔۔۔؟“

”سرخی مائل۔“

فریدی تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر غسل خانے میں چلا گیا۔ اس دوران میں حمید

”روٹا ٹافیاں کھاتے رہے۔ حمید نے دو چار انور کی طرف بھی بڑھائیں لیکن اس نے ہونٹ

لہڑا کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

”البرونو تو اب بالکل جوان معلوم ہوتا ہے۔“ رمونا نے کہا۔

ہم کہتا ہے۔“ البرونو نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

البرونو ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ ڈی گاریکا کچھ سوچتا ہوا بولا۔“ آخر تم میرے لئے
ہمیں اٹھا رہے ہو۔“

میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔“ مجھے ڈان ونسٹ اور
گریمز تو ڈنی ہیں۔ انہوں نے لندن کے ایک ٹائٹ کلب میں میری سخت توہین کی تھی۔“
ڈان ونسٹ کا یہ بیان صحیح تھا کہ اسکا لندن میں چند پرتگالیوں سے بھگڑا ہو گیا تھا۔

بالکل صحیح تھا۔“ فریدی نے کہا۔“ تم ذرا اپنا پاسپورٹ مجھے دے دو۔“

کیوں؟ کیا کرو گے۔“

مجھے تمہارے لڑکے کی تصویر چاہئے۔“

ڈی گاریکا نے فریدی کو پاسپورٹ دے دیا۔

انور ادر آؤ۔“ فریدی نے انور کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر دوسرے کمرے
راں کی طرف مڑا۔“ مجھے خوشی ہے کہ اس وقت آنکھوں کی رنگت کام آگئی۔“

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

تمہاری آنکھیں بھی سبز ہیں۔ میں تمہیں ڈی گاریکا کا لڑکا بتاؤں گا۔۔۔۔۔ اس طرح تم اس
ورٹ پر سفر کر سکو گے۔“

انور جرت سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فریدی پھر بولا۔

میں خود اس گھٹیا قسم کے بہروپ سے تنگ آ گیا ہوں۔ مگر کیا کروں بعض اوقات مجبور

ہوتا ہے۔ بہر حال ڈان ونسٹ کی حماقتیں ہمارے کام آ رہی ہیں۔“

یعنی۔۔۔۔۔!“

”اگر وہ ڈی گاریکا کے لڑکے کو قتل کر کے اس کی شکل نہ بگاڑ دیتا تو میں کبھی اس کی ہمت

نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مقتول کی تصویریں اخبارات میں ضرور شائع ہوتیں اور پھر تم اس کے

ٹکے ذریعے سفر نہ کر سکتے۔“

فریدی نے سوٹ کیس سے میک اپ کا سامان نکالنا شروع کیا۔ پھر انہیں ایک میز پر پھیلا

”قطعاً نہیں۔۔۔۔۔ وہ پچاس برس کا ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”بعض اوقات تم سفید جھوٹ بولتے ہو۔“ رمونا نے منہ بنا کر کہا۔

”بحرین بڑی حسین جگہ ہے۔“ انور نے بات اڑادی۔

”مجھے تو پسند نہیں۔“

”پھر تمہیں کیا پسند ہے۔“

”ختم کام رہ۔۔۔۔۔!“ رمونا نے کہا اور حمید بے ساختہ ہنس پڑا۔

اتنے میں فریدی واپس آ گیا اور رمونا نے شرارت آمیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”البرونو۔۔۔۔۔ یہ کہتا ہے کہ تم پچاس برس کے ہو۔“

”ٹھیک کہتا ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”البرونو میں تمہاری اصل شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”تم مجھے اس وقت یہ اصل ہی صورت میں دیکھ رہے ہو۔“

”تب تو تم تیس سال سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے۔“ رمونا نے کہا۔

”مسلّم ہے تمہارا خیال صحیح ہو۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ حمید کی طرف مڑی۔ ”تمہارا جھوٹ ظاہر ہو گیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔! تو اگر تیس ہی سال کے ہیں تو کون سے بڑے تیس مارخاں ہیں۔“ حمید نے

منہ بنا کر کہا۔

”تیس مارخاں کیا چیز۔“

”تیس مارخاں ہماری طرف اسے کہتے ہیں جو روزانہ تیس کھیاں مار لیتا ہو۔ اس لئے ذرا

صحت کو بھی تیس مارخاں کہتے ہیں۔“

رمونا ہنسنے لگی۔

”مجھے اب تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں رہا۔“ رمونا نے کہا پھر فریدی کو مخاطب کر کے

بولی۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک معمولی کسان کے بیٹے ہو اور خود یہ زار روس کے خاندان سے تعلق

رکھتا ہے۔“

کر انور کی طرف مڑا۔

”بعض اوقات مجھے اس بھان متی کے سوا نگ پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ کیا حائفہ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”خیر اس کی کرسی پر بیٹھ جاؤ..... ممکن ہے تمہیں تھوڑی سی تکلیف بھی ہو، پلاننگ میڈل میں کبھی کبھی زخم بھی آ جاتے ہیں۔ مگر میں حتی الامکان احتیاط برتوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد انور کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ہونٹ چھیلے جا رہے ہوں۔ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد فریدی نے اسے ایک آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بے اختیار چونک پڑا۔ ڈی گاریکا کا پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کبھی وہ اس کے لیے تصویر کی طرف دیکھتا اور کبھی آئینے کی طرف۔

”کمال کر دیا.....!“ وہ فریدی کی طرف مڑ کر بولا۔ ”اس فن میں بھی شاید ہی کوئی آپ نکر کا نکلے۔“

پھر وہ دونوں اس کمرے میں آئے جہاں ڈی گاریکا وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انور کی ڈی گاریکا اور رمونا اچھل پڑے۔

”میرا بچہ.....!“ ڈی گاریکا بے اختیار چیخا اور پھر تھیر ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”یہ انور ہے۔“ فریدی نے کہا اور ڈی گاریکا کے چہرے پر گہری اداسی پھیل گئی۔ رمونا رو رہی تھی۔ ڈی گاریکا کے ہونٹ کپکپانے لگے اور اس نے اپنا چہرہ دونوں سے چھپایا۔

”ڈی گاریکا.....!“ فریدی غناک آواز میں بولا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن اس کے کوئی چارہ نہیں تھا۔“

”میں اس حالت میں سفر کیسے کر سکوں گا۔“ ڈی گاریکا گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”ہمت سے کام لو۔“ فریدی نے کہا۔ ”تم مرد ہو..... اور ایک جنگ جو سپاہی۔“

”رمونا کیسے زندہ رہ سکے گی۔ اس کے مردہ بھائی کا ہم شیوہ!“ ڈی گاریکا کی آواز میں پھنس گئی۔

”میں دل پر پتھر رکھ لوں گی۔“ رمونا تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے غم کی آنچ نکل رہی تھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور پھر پردقار آواز میں بولی۔

”ہمیں اولیاری کے قتل کا انتقام لینا ہے۔ میں ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھیوں کے خون سے اپنے ہتھکھریا لے بالوں کو سرخ کروں گی۔ ان کی ہڈیاں چباؤں گی اولیاری کا ہم شکل میرے زخم ہزارہ رکھے گا۔ انتقام کی آگ بھڑک اٹھے گی اور میں ڈان ونسٹ پر ذرہ برابر بھی رحم نہ کروں گی۔“

پھر وہ جوش میں بھری ہوئی بیٹھ گئی۔ ڈی گاریکا کرسی کی پشت سے نکلا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی فضا پر ایک بوجھل سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ انور کو اپنے دل کی دھڑکنوں کی دھک کنپٹیوں میں محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔

پھر کئی گھنٹے تک ان کمروں میں ماتی اثرات چھائے رہے۔ اس دوران میں فریدی بہت زیادہ مشغول رہا۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا نقشہ پھیلا ہوا تھا جس پر وہ پنسل سے نشانات لگا رہا تھا۔ اس نے کئی چارٹ بھی بنائے تھے جنہیں وہ ایک ایک کر کے چھڑ کر پھینکتا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر ایک گارلسا کر اس کمرے میں آیا جہاں ڈی گاریکا وغیرہ دوسرے سفر کی تیاریاں کر رہے تھے۔

”میں اک دخانی کشتی کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے اس سے کہا۔ ”تم اپنے انتظام مکمل رکھو۔“

”میں بھی چلوں۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں.....!“ فریدی نے کہا اور باہر نکل گیا۔

انور محسوس کر رہا تھا کہ ڈی گاریکا اور رمونا اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنچکپاتے ہیں۔ اس لئے اس نے وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔

رات آہستہ آہستہ بھگیٹی جا رہی تھی۔ انور اکتا دینے والی خاموشی سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لاشوں اور سوکھی ہوئی ہڈیوں کے ڈھانچے کے درمیان وقت گزار رہا ہے۔ حالانکہ اسے حمید کے قبہتہوں سے ضد سی تھی لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش وہی اس قبرستانی فضا کا خاتمہ کر دیتا۔

اس کے ملک کی خفیہ ایجنسی کے افراد رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ اور حمید ڈان ولسٹ کی سراغ
یابی میں مصروف ہو گئے۔

انور ڈی گاریکا اور رمونا کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ فرصت کے لمحات میں
بہت زیادہ ترغیر مستقل مزاج اور کھنڈری لڑکی ہے۔ لیکن وہ اس غلط فہمی میں ابھی تک مبتلا تھی۔
بند چمچ زار روس کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

”لیکن مجھے اس پر یقین نہیں کہ البرونو نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔“ رمونا نے انور سے کہا
”میں بھلا اس کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں۔“ انور نے کہا۔

”ہاں یہ میں بھی محسوس کرتی ہوں کہ البرونو ایک لاپرواہ آدمی ہے۔ شاید وہ کبھی سوچتا ہی
نہیں کہ دوسرے اس کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ بعض اوقات میں سوچنے لگتی ہوں کہ وہ شاید
کی دوسری دنیا کا آدمی ہے۔ میں نے ابھی تک اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں دیکھے۔
بالکل اس سفر نے ہمارا کچھ نکال دیا ہے۔“

انور کچھ نہ بولا۔ رمونا تھوڑی دیر بعد پھر کہنے لگی۔

”ڈان ولسٹ میری قوم کا بہادر ترین آدمی ہے۔ تنج زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی
نہایت انگریز صلاحیتوں کے متعلق افسانے مشہور ہیں۔ مگر البرونو نے اسے بھی شکست دے دی تھی
اب وہ ات جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈان الفریڈ وایک مشہور پہلوان ہے لیکن وہ
بعض البرونو کے خوف سے دم دبا کر بھاگ نکلا۔“

انور رشیدہ کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رمونا کو دیکھ کر پوچھا۔

”تم اس سے پہلے بھی سی نور رومولی سے مل چکی ہو۔“

”نہیں میں نے انہیں آج تک نہیں دیکھا۔“

”تو کیا اسے تمہارے جزیرے کا حکمران بنا دیا جائے گا۔“

”ہاں.....!“

”لیکن تم اس کے لئے کیا ثبوت پیش کرو گی کہ وہ شہزادی رومولی ہے۔ کیونکہ تمہاری قوم تو
نہایت ہے کہ وہ بچپن ہی میں قتل کر دی گئی تھی۔“

ایک بجے فریدی واپس آیا تھا۔ کشتی کا انتظام ہو گیا تھا اور اب رات ہی رات وہاں سے
روانگی کی تجویز پر غور کیا جا رہا تھا۔ آخر فریدی ہی کی رائے پر سب کو متفق ہونا پڑا۔ سامان ایک
اسٹیشن وگین پر رکھا گیا اور وہ سب ساحل کو روانہ ہو گئے۔

”تم آخر اتنے خاموش کیوں ہو۔“ انور نے حمید سے پوچھا۔

”تم لوگوں نے میری زندگی برباد کر دی۔“ حمید بسور کر بولا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”فریدی صاحب کو مجھ سے ضد ہو گئی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”آخر بات کیا ہے؟“

”تمہیں اولیاری کی شکل میں لانے کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں تھی۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”ظاہر ہے کہ اب رمونا کی مسکراہٹیں بے جان ہو کر رہ جائیں گی۔“

”اوہ! یہ بات ہے۔ حمید تم بڑے ڈیوٹ ہو۔“

”کسی خوبصورت عورت کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ میری جنت ہے۔“

”تم خاصے احمق ہو۔“ انور منہ بنا کر بولا۔

”اور مجھ سے بھی زیادہ احمق تم ہو کہ ایک عورت ہی کے لئے موت کے منہ میں کودنے
جا رہے ہو۔“ حمید نے تلخ لہجے میں کہا۔ انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ باہر پھیلے ہوئے اندھیرے
میں گھور رہا تھا۔

حمید کا عشق

بحرین سے جبرالٹر تک کے بحری سفر میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ آہستہ آہستہ
رمونا اور ڈی گاریکا کی افسردگی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران میں وہ سب ایک دوسرے سے
کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ جبرالٹر پہنچ کر فریدی نے ڈی گاریکا سے وہ مقامات معلوم کیے جہاں

زندگی کے شکاری کو ارڈر میں کو ایک ایسا خطیلی ملا تھا جس کے سینے پر شاہی نشان تھا۔

”تمہاری بے اعتباری کی وجہ میں نہیں سمجھ سکتا۔“ ڈی گاریکا خشک لہجے میں بولا۔ ”حالانکہ

تمہارے سامنے ہی شہزادی رومولی سے مل چکا ہوں۔ اگر تم اسے سمجھتے ہو تو یہ بتاؤ کہ وہ

رہے ساتھ جانے کیلئے کیوں تیار ہو گئی تھی۔ میرا اس کی ذات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

انور خاموش ہو گیا۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ ڈی گاریکا نے قاعدے کی بات

کی۔ اگر واقعی رشیدہ ہندوستانی تھی تو اس کا ایک غیر ملکی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسے افسوس ہو

اٹا کہ اس نے خواہ مخواہ ڈی گاریکا کو کبیدہ خاطر کر دیا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ انور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”حالات ایسے پیش آرہے ہیں کہ

ادارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ اگر میری باتوں سے تمہیں تکلیف پہنچی ہو تو معافی

ماہوں۔“

”نہیں بیٹے۔ کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اور تمہارے لئے بھی فکر مند ہوں۔ رومولی

بل کی طرح چھوڑنا نہ چاہے گی اور مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں کہ کوئی غیر ملکی تمہارے جزیرے میں نہیں رہ سکتا۔“ انور نے کہا۔ ”میں تو

رشیدہ کی زندگی کا خواہش مند ہوں میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں اور بس۔“

”تم نیک اور شریف آدمی ہو۔“

”لیکن مجھے خوف ہے کہ ڈان ولسٹ اسے راستے ہی میں نہ ختم کر دے۔“ انور نے

یشاک لہجے میں کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ اسے زندہ ہی لے جایگا۔ کیونکہ فاگان ایک بار دھوکہ کھا چکا ہے۔“

”فاگان کون.....؟“ انور نے پوچھا۔

”ہمارا حکمران فاگان کہلاتا ہے۔ رومولی فاگانہ کہلائے گی۔ بیرن آلی لینڈ کی تیرہ

بیر۔“

”تم نشان کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔“ انور تھوڑی دیر خاموش

”ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس قسم کے نشانات صرف شاہی خاندان کے افراد کے لئے

”ہماری قوم کی ایک بہت بڑی شخصیت اس راز سے واقف ہے۔ ہمارا مذہبی پیشوا، متھرا

باپ پطرس.....!“

”اور اگر حاکم وقت نے اسے بھی جھٹلا دیا تو۔“ انور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ مقدس باپ کو جھٹلانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”یہ کہو رائے عامہ بدلتے دیر نہیں لگتی، اب پھر حکمرانوں کے ہتھکنڈے! ہو سکتا ہے کہ

باپ کی ایسی پوزیشن ہو جائے کہ عوام ہی اسے جھوٹا سمجھنے لگیں۔“ رومونا خاموش ہو گئی پھر تھوڑی

بعد بولی۔

”میں اس سے زیادہ نہیں جانتی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی۔ جی تو میرا باپ جدوجہد کر

رہا ہے۔“

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ڈی گاریکا آ گیا۔ انور نے اپنے سوالات دہرانے شروع کیے

ڈی گاریکا خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

”بیٹے اگر اس کے امکانات نہ ہوتے تو میں اتنی جدوجہد کیوں کرتا۔ میں یہ کیوں چاہتا

ڈان ولسٹ کو دارالحکومت پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیا جائے۔ میں اپنے ساتھ غیر ملکیوں کو کیا

لے جاتا جبکہ یہ حرکت بغاوت کے مترادف ہے۔“

”میں انہیں امکانات کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”رومولی کے جسم پر ایک ایسا نشان موجود ہے جو شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ اور

کے جسم پر نہیں ہوتا۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

انور بے اختیار بس پڑا۔

”ڈی گاریکا میں بچہ نہیں ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ البرونو جیسا دانش

آدمی تمہارے پیر میں کس طرح پھنس گیا۔ بہر حال اس نے میری بھی مٹی پلید کی۔“

”کیوں؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ ڈی گاریکا ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”ایسی کہانیاں میں ہالی وڈ کی گھٹیا فلموں میں دیکھ چکا ہوں۔“ انور مسکرا کر بولا۔

ایک کانام تو مجھے اب تک یاد ہے شہنشاہ سلیمان کا خزانہ۔ رائیڈر بیگر ڈب کے ناول کا پلاٹ جتنا

میں پائے جاتے ہیں اور تخت کے وارث کے پر جو نشان ہوتا ہے دوسرے نشانات سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ نشان بچوں کی پیدائش پر ان کے سینوں پر ڈال دیے جاتے ہیں۔ اس رسم سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شاہی بچے سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے دوسرے ممالک میں رہے جاتے ہیں۔

”لیکن فرضی نشان بھی تو بنائے جاسکتے ہیں۔“ انور نے کہا۔

”یہ ناممکن ہے کیونکہ وہ نشانات شاہی مہر کے ہوتے ہیں جو شاہی خزانے میں کافی انوار کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔“

”نشان ڈالنے کا طریقہ کیا ہے۔“

”یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔“ ڈی گاریکا آہستہ سے بولا۔ ”میں اسے پسند نہیں کرتا۔ لیکن بہر حال رسم ہے۔ چاہے وہ وحشیانہ کیوں نہ ہو۔“

”آہ.....!“

”بہت ہی ظالمانہ طریقہ ہے۔ لوہے کی مہر گرم کر کے بچے کے سینے پر داغ لگایا جاتا ہے۔“

”اوہ.....“

”رمونا نے اپنے ہونٹ اس طرح سکڑ لئے جیسے وہ ان داغے جانے والے معصوم کی تکلیف خود اپنے سینے پر محسوس کر رہی ہو۔“

”تمہارا جزیرہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔“ انور آہستہ سے بڑبڑایا۔

ڈی گاریکا کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور فریدی اندر داخل اس کے پیچھے حمید تھا۔ اس نے آتے ہی انور کو گھورتا شروع کر دیا۔ انور سمجھ گیا کہ رمونا کے ٹھہرنا اسے کھل گیا۔

فریدی خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈی گاریکا اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ڈی گاریکا“ فریدی نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہارے ملک کی ایجنسی کے لوگ تم

تلاش میں ہیں۔ ڈان..... سن یہاں سے چلا گیا۔ وہ تین اور ایک بوڑھا مریض جو یہاں بھی

تھا، ہل چار گئے ہیں اور ڈان الفرید وہیں رک گیا ہے۔ غالباً وہ تمہارا راستہ دیکھ رہا ہے۔“

”اوہ.....!“ ڈی گاریکا مٹھیاں بھیج کر بولا۔ ”اسپین میں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ڈان ونسٹ وغیرہ میکسیکو گئے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ لو کہ یہاں میکسیکو کا راستہ ہمارے لئے مخدوش ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ راستہ بدل دیا جائے۔“

”پھر کون سا راستہ اختیار کرو گے۔“ ڈی گاریکا نے پوچھا۔

”کیوں نہ ہم لوگ میکسیکو کے بجائے جمیکا جائیں۔“

”بھلا جمیکا کیسے جاسکیں گے۔ وہ برطانوی حکومت کا ایک حصہ ہے۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”یہ میں ٹھیک کر لوں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”جمیکا سے ہم پھر وائٹنگ کی طرف واپس آئیں

گے اور وائٹنگ سے بیرن آئی لینڈ.....!“

”اور اگر ڈان ونسٹ نکل گیا تو۔“

”یا تو وہ ہم سے پہلے نکل جائے گا یا ہم اس سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ

نبری صورت ناممکن ہے۔“ فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔ ڈی گاریکا تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”مگر میری رائے اس سے مختلف ہے۔“ حمید نے کہا۔

فریدی کے علاوہ اور سب لوگ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”میرا خیال ہے کہ“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”پہلے ہم ٹیکٹو جائیں پھر وہاں سے ہونو لولو کا سفر

کریں۔ اس کے بعد قطب جنوبی سے گزرتے ہوئے جہنم رسید ہو جائیں۔“

”بکومت.....!“ فریدی نے چیخ کر کہا اور حمید نے سہم جانے کی اتنی اچھی ایکٹنگ کی کہ دونوں بے اختیار ہنس پڑی۔

ڈی گاریکا بھی ہنسنے لگا۔ فریدی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رمونا ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”اچھا باتیں بند۔ ابھی ہم لوگوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”شوق سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن کھانا یہیں منگوایا جائے گا۔ ڈائینگ ہال میں کھانا ٹیک نہیں۔“

”کیوں؟ ڈانٹیک ہال میں کیوں نہیں؟ ہم وہاں بینڈ بھی سن سکیں گے۔“ رمونا نے کہا۔
”البرونو کا خیال ٹھیک ہے۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”میں یہیں تمہیں بینڈ سنا دوں گا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

فریدی اسے پھر گھورنے لگا اور حمید نے منہ پھیر لیا۔

پھر ڈی گاریکا نے ویٹر کو بلا کر کمرے ہی میں کھانا لانے کے لئے کہا۔

کھانے کے دوران میں حمید نے لطیفے شروع کر دیئے۔ رمونا ہر بات پر ہنس رہی تھی۔

”اس لڑکی کی خیریت نظر نہیں آتی۔“ انور نے فریدی سے اردو میں کہا۔

”بھئی کیا بتاؤں..... حمید کی یہ عادت میں آج تک نہ چھڑا۔ عورت اس کی سب سے

بڑی کمزوری ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ حدود سے باہر قدم نہیں نکالتا۔“

”تم لوگ نہ جانے کس زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔ ”مجھے الجھن ہوتی

ہے۔“

”انور اپنی زبان میں کہہ رہا ہے کہ اس کا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”میں نے ہر طرح اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”میں بھی سمجھا رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد ڈی گاریکا دوسرے کمرے میں آرام کرنے کے لئے چلا گیا۔

بہت تھک گیا تھا۔ بقیہ لوگ وہیں کافی پیتے رہے۔

فریدی نے ایک سگار نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور سلگانے ہی جا رہا تھا کہ رمونا نے اسے

کھینچ لیا۔

”تم بہت کثرت سے سگار پیتے ہو۔“ رمونا نے کہا۔ ”اب بس۔“ پھپھڑے خراب

ہو جاتے ہیں۔“

فریدی مسکرانے لگا۔

”اور میرے پائپ کے متعلق کیا خیال ہے۔“ حمید نے اپنا پائپ ہونٹوں سے نکال

ہوئے کہا۔

”اس سے بھی پھپھڑے خراب ہو جاتے ہیں۔“ رمونا بولی۔ ”لیکن اگر تمہارے پھپھڑے

ذرا اب بھی ہو گئے تو اس سے کوئی خاص نقصان نہ ہوگا۔“

”کیوں.....؟“ حمید متحیر ہو کر بولا۔

”تم ایک ناکارہ آدمی ہو۔ صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔“ رمونا ہنس کر بولی۔

”اب زندگی بیکار ہے۔“ حمید بیزاری سے بولا اور فریدی بے اختیار ہنس پڑا۔ انور بھی ہنس

پانا۔ شاید اس دوران میں وہ پہلی بار دل کھول کر ہنسا تھا۔

حمید نے اپنی جیب سے ریشمی رومال نکالا اور اسے اپنی گردن میں پھنسا کر دونوں سرے

پہنچنے لگا۔

”تو یہ کیا کرنے لگے۔“ رمونا نے مسکرا کر کہا۔

”خودکشی۔“ حمید گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ اس کا چہرہ سچ مچ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں

اسے ابلی پڑ رہی تھیں۔

”عجب دیوانے آدمی ہو۔“ رمونا نے کہا اور بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”نہیں نہیں..... مجھے مر جانے دو۔“

”کیا فضول حرکتیں کر رہے ہو۔“ رمونا جھلا کر بولی۔

”مر بھی جانے دو۔“ فریدی لاپرواہی سے بولا اور حمید رومال کے گوشے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”اوہ! تو آپ اکسیں دلچسپی لے رہے ہیں۔“ حمید اردو میں بولا۔ ”میں دستبردار ہوتا ہوں۔“

”تم گدھے ہو۔“ فریدی جھلا کر بولا۔ ”مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ ہر لڑکی میں دلچسپی

گول۔ نہ جانے تمہارے دماغ میں کس قسم کے کیڑے کھلاتے رہتے ہیں۔“

”میں احمق نہیں ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ آپ کی طرف جھک رہی ہے۔“

”جھکنے دو۔“ فریدی بیزاری سے بولا۔ ”اس کے جھکنے سے دنیا کا نقشہ نہیں بدل سکتا۔ بین

ذاتی سیاست بھی اپنی جگہ پر رہے گی۔ لیکن تمہیں ٹی۔ بی ضرور ہو جائے گا۔ دماغ ذرا ٹھنڈا رکھو

”نار۔“

”تو آپ اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ تم ہاتھی کی دم پکڑ کر لٹک گئے تھے۔“
 ”ہاں مگر وہ ہاتھی مردہ تھا۔“

”کیوں فضول باتیں کر رہے ہو۔“
 ”ارے تم البرونو کی باتوں میں آئی ہو۔ وہ میرا منہ کھڑا کر رہا تھا۔“
 ”لیکن ڈی سال کو تو تم پکڑ کر لے گئے تھے۔“

”آخر تمہیں پکڑ دھکڑ اور مار پیٹ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔
 ”مجھے بڑا اور بے خوف آدمی اچھے لگتے ہیں۔ البرونو کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔“
 ”اور میری.....!“

”تم نے کیا ہی کیا ہے۔“
 ”اچھا تو میں اب دکھا دوں گا۔“ حمید اکڑ کر بولا۔
 ”کیا دکھا دوں گے۔“

”اپنی زبان.....!“ حمید نے کہا اور اپنی زبان نکال دی۔ رمونا ہنس پڑی۔
 ”تمہاری باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔“
 ”تو ہم دونوں تمہیں اچھے لگتے ہیں۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ رمونا جلدی سے بولی۔ ”تم بڑے شیطان معلوم ہوتے ہو۔“
 ”بڑا نہیں چھوٹا کہو۔ بڑا شیطان تو البرونو ہے۔“

”میں تم دونوں کی عزت کرتی ہوں۔ اچھا مجھے البرونو کے بارے میں بتاؤ۔“
 ”کیا بتاؤں۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”وہ تمہاری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتا۔“
 ”تم پھر بے بنی لگے۔ میں تم سے یہ کب پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس سے
 نکلنے لگی ہوں۔“

”قطعاً نہیں..... قطعاً نہیں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”محبت تو تم مجھ سے.....!“
 ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ رمونا نے جھلا کر کہا اور کمرے میں چلی گئی۔
 حمید اس طرح آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے چرخ کج رفتار کو گھونہ رسید کر دے گا۔

”ابے نہیں چنڈ..... نہیں۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔

”شکریہ۔ میں آپ ہونے والے بال بچوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

انور کیلئے ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا۔ البرونو
 ان دونوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اس نے فریدی کو غصے میں دانت پیستے دیکھا تھا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ رمونا نے تشویشاً لہجے میں پوچھا۔

”تم پر تنگالی زبان نہیں سمجھتیں۔“ فریدی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں بالکل نہیں سمجھتی۔“

انور رمونا کی آواز سنتے ہی کھڑکی کے قریب آ گیا تھا۔

”بات دراصل یہ ہے۔“ فریدی بولا۔ ”تم نے اسے ناکارہ کہہ کر اس کا دل توڑ دیا ہے

یہ کہتا ہے کہ میں واپس لوٹ جاؤں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ ناکارہ آدمی نہیں ہے۔ ابھی اس نے
 کارنا تمہاری نظروں سے نہیں گزرے۔ ایک بار یہ غصے میں ایک جنگلی ہاتھی کی دم پکڑ کر لے
 گیا تھا اور ہاتھی نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔“

”میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔“ رمونا نے معذرت طلب انداز میں کہا۔ پھر وہ مبرا

مخاطب کر کے بولی۔ ”تم بڑا مان گئے۔“

”پہلے بڑا ماننے کا ارادہ کر رہا تھا مگر اب نہیں۔“ حمید نے کہا اور پائپ پینے لگا۔

فریدی نے انور کو آواز دی۔ دونوں سفر کے متعلق گفتگو میں مشغول ہو گئے اور حمید رمونا

ساتھ بالکونی میں چلا گیا۔ فریدی نے اسے بھی مشورے میں شریک کرنا چاہا تھا لیکن پھر یہ

کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ فی الحال حمید کوئی قاعدے کی بات نہیں کر سکتا کیونکہ رمونا اس کے

نرمی طرح سوار تھی۔

حمید بالکونی میں رمونا سے کہہ رہا تھا۔

”تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔“

”اور تم بالکل کجگار معلوم ہوتے ہو۔“ وہ ہونٹ سکڑ کر بولی۔

”چلو میں کجگار وہی سہی لیکن میں زندگی بھر تمہاری تعریف کرتا رہوں گا۔“

ایک دشمن

میں۔ لیکن فریدی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ پانچ بجے کے قریب وہ ریسٹوران میں آیا۔ کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھ گیا۔
 ”اب تم لوگ مجھے البرونو کہہ کر مخاطب نہ کرنا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”کیوں؟“

”ڈان الفریڈو جہاز پر موجود ہے۔“

”ارے.....!“

”ہاں اس نے ڈاڑھی لگا رکھی ہے۔ لیکن میں اسے اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔“

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک باوردی قسم کا بارش آدمی ریسٹوران میں داخل ہوا۔

”ہاں تو صاحبان.....!“ فریدی بلند آواز میں بولا۔ ”آپ لوگوں کو مل کر بڑی خوشی ہوئی

اپنی اور اپنی باشندوں سے عشق ہے۔ میرے ساتھی نے آپ لوگوں کی بڑی تعریف کی ہے۔“

آنکھوں نے ڈیگاریکا پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور قریب کی ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔

فریدی بلند آواز میں بھی کئی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ بہر حال وہ آنے والے پر یہ ظاہر کرنا ناکام تھا کہ وہ ڈیگاریکا سے جہاز پر واقف ہوا ہے۔

دفعتاً آنے والے کی نظریں انور کی طرف اٹھ گئیں جو ادلیاری کے بھیس میں تھا۔ وہ بے

بارچوک پڑا۔ پہلے اس کے ہونٹ تھوڑے سے کھلے پھر آنکھیں پھیل کر رہ گئیں۔ چند لمحے

ایسی حالت میں رہا پھر قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس کی کرسی کی چڑچاہٹ کی آواز سنی

”اگر فریش پر آ رہا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور اس کے گرد بھڑلگ گئی۔“

”انور“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”اپنے کیمین میں جاؤ..... اور اس وقت تک باہر نہ نکلتا

بیک میں نہ آ جاؤں۔“

انور چلا گیا۔ ڈیگاریکا وغیرہ جبرانی سے فریدی کی طرف دیکھنے لگے۔ فریدی بھڑبھاکر

بہوش آدمی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”ہٹ جاؤ..... ہٹ جاؤ۔“ وہ ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”مقدس باپ بیہوش ہو گئے ہیں۔ لڑکے

ایک ٹکاس پانی لاؤ۔“

دوسرے دن صبح وہ لوگ ایک اسٹیر پر جیکا کے لئے روانہ ہو گئے۔ ڈیگاریکا جیکا جانے کی مخالفت کر رہا تھا۔ لیکن فریدی نے اس کی ایک نہ سنی۔ ڈیگاریکا کی پریشانی کا باعث دراصل یہ چیز تھی کہ اس کا پاسپورٹ صرف میکسیکو تک کا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریدی جیکا میں کس طرح اتر سکتا تھا۔

”تم ڈرو نہیں۔“ فریدی نے اس سے کہا۔ ”تمہاری حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ تم دیکھ

کہ میں تمہیں کس صفائی سے نکال لے جاتا ہوں۔“

ڈیگاریکا اس جواب سے مطمئن ہوا تھا یا نہیں لیکن انور کے لئے اس اجمال کی تفصیل

جانی ضروری تھی۔ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریدی ان لوگوں کو جیکا کس طرح لے

جائے گا۔ لہذا اس کے مزید استفسار پر فریدی کو بتانا ہی پڑا۔

”جرمن سائنسدان ولیمین نے کی تباہ کن ایجاد پر سے پردہ اٹھانے کے سلسلے میں میری بہ

اور پوزیشن ہو چکی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں اب دولت مشترکہ کے سارے ممالک میں اپنے

کسی دشواری کے داخل ہو سکتا ہوں۔ میں نے جیکا میں پیش آنے والی دشواریوں سے متعلق اپنے

براؤن کو ایک کیبل روانہ کیا تھا جس کا جواب آ گیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کی طرف سے جیکا کے ٹک

سراغ رسائی کو ہمارے متعلق اطلاع دے دی گئی ہے لہذا وہاں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔“

انور مطمئن ہو گیا۔ ڈیگاریکا بھی کچھ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ البرونو کی غیر معمولی

قوتوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

اسٹیر پر مسافروں کی کثرت نہیں تھی کیونکہ وہ اسٹیر دراصل تجارتی سامان بار کر کے جیکا

کی طرف جا رہا تھا۔ عرثے پر تو ایک متنفس بھی سفر نہیں کر رہا تھا۔ سارے مسافر کیمینوں میں تھے۔

موسم ٹھیک ہونے کی وجہ سے سمندر میں تموج نہیں تھا۔ لہذا اسٹیر سب روی کے ساتھ اپنا

راستہ طے کر رہا تھا۔ دن بھر یہ لوگ اپنے کیمینوں میں رہے اور شام کو ریسٹوران میں آکر

”تم دونوں روسی ہو۔“ پادری نے پوچھا۔

”جی ہاں..... لیکن ہم روسن کیتھولک ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”ہم دونوں پر آسانی باپ برکتیں نازل کرے۔“ پادری نے ہاتھ اٹھا کر دعا دی۔

”ان دونوں کے لئے شگون کی دعا کیجئے۔“ فریدی نے ڈی گاریکا اور رمونا کی طرف

بڑھ کر کہا۔ ”ڈی گاریکا کا بیٹا اس سفر میں اچانک ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔“

”کہاں.....؟“

”ہندوستان میں..... اور یہ میکسیکو جا رہے ہیں۔“

”میکسیکو.....!“ پادری نے حیرت سے کہا۔ ”مگر یہ جہاز تو جیکا جا رہا ہے۔“

”یہ ہسپانولا کی بندرگاہ آپرٹس پر اتاریں گے۔ پھر وہاں سے میکسیکو جائیں گے۔“

”بڑا چکر پڑ جائے گا۔“ پادری نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”کیا کیا جائے۔“ فریدی غم انگیز لہجے میں بولا۔ ”میری ان کی ملاقات اسی جہاز پر ہوئی

ہے۔ ان کی دکھ بھری کہانی سن کر بڑا افسوس ہوا۔ بات یہ ہے کہ ان کے کی ماں ہسپانولا میں ہے یہ

کی فرڈاک کے یا تار کے ذریعہ نہیں سنانا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ پادری نے کہا۔ ”بڑا افسوس ہوا۔ خدا انہیں صبر دے۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر پادری اٹھتا ہوا بولا۔

”اچھا میرے بچو! آسانی باپ تمہاری حفاظت کرے۔“

”آپ کمزوری محسوس کر رہے ہوں گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”چلئے میں آپ کو کیمین تک

لے جاؤں۔“

پادری نہیں نہیں کرتا رہا۔ لیکن فریدی نے سہارے کے لئے اپنا ہاتھ پیش ہی کر دیا۔ پادری

اُس کے کیمین تک پہنچا کر فریدی لوٹ آیا۔ ڈی گاریکا تھخیر تھا۔ اس نے حمید کو بلا کر کچھ

اتحادیں پھر حمید رستوران سے چلا گیا۔

”یہ سب کیا تھا۔“ رمونا بے صبری سے بولی۔ ”انور کہاں گیا۔“

”تم بتاؤ۔“ فریدی کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز

ویٹر لپک کر پانی کا گلاس لایا۔ فریدی نے اس کے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو نہایت

احترام کے ساتھ اس کے سینے پر رکھ دیا اور گلاس لے کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے

لگا۔ تھوڑی دیر بعد پادری کو ہوش آ گیا۔ فریدی نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

”مقدس باپ! اب طبیعت کیسی ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ پادری چاروں طرف دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اچھا تو اٹھئے آپ بہت خیف معلوم ہو رہے ہیں۔“ فریدی اُسے اٹھا کر اپنی میز کے

قریب لایا۔ سب بیٹھ گئے۔ رمونا انور کی کرسی پر بیٹھنے جا رہی تھی مگر فریدی نے اسے دوسری کرسی

پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انور کی کرسی خالی ہی رہی۔

پادری بار بار خالی کرسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”مقدس باپ! آپ بہت خیف معلوم ہو رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”براٹھی منگواؤں۔“

”نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ پادری ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے اختلاج قلب کے

دورے پڑتے ہیں اس وقت بھی دورہ ہی پڑا تھا۔“

فریدی نے اس پر افسوس ظاہر کیا۔

پادری تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہنے کے بعد انور کی کرسی کی طرف اشارہ

کر کے بولا۔ ”یہ کہاں گیا۔ تم سب سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔“

”کون.....؟“ فریدی چونک کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کرسی پر کوئی نہیں تھا۔“

پھر اس نے رمونا کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

پادری کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے لیکن اس نے جلد ہی اپنی حالت پر توجہ

پالیا۔

”ہوگا..... ممکن ہے مجھے دھوکہ ہوا ہو۔ بہر حال آپ لوگوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی

بقیہ سفر آرام سے کٹ جائے گا۔“

”ہم ہر حال میں خدمت کے لئے تیار ہیں۔“ فریدی قدرے جھک کر بولا۔ ”یہی نورا

گاریکا ہیں۔ یہی نور رمونا۔ یہ میرا ساتھی حمید یوف ہے اور میں فریدی یوف۔“

مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”مقدس باپ انور کو اولیاری کا بھوت سمجھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔“

”اوہ! وہ ڈان الفریدو تھا۔“ ڈی گاریکا اچھل کر بولا۔

”ہاں!.....!“

”اس لئے انور کو سچ سچ تم نے بھوت بنا دیا۔“ رمونا اپنی ہنسی ضبط کرتی ہوئی بولی۔

”اور اب میں نے انور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ فی الحال اپنی اصل صورت میں آ جائے۔ ڈان الفریدو بُری طرح خائف ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ آج اپنے ساتھیوں کو واپس لے ذریعے پیغام بھیجنے کی کوشش کرے۔ میرا ساتھی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔“

ڈی گاریکا کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پائے جا رہے تھے۔ رمونا بھی اس کے باپ کی بدلتی ہوئی کیفیت نے برا اثر ڈالا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”میں اس کے چیتھرے اڑا دوں گا۔“

”ممکن ہے وہ تنہا نہ ہو۔“ ڈی گاریکا نے فکرمند لہجے میں کہا۔

”اوہ چھوڑو بھی۔“ فریدی سگار نکال کر ہونٹوں میں دباتا ہوا بولا۔ ”تم کچھ تھکے تھکے

نظر آ رہے ہو۔ جا کر آرام کرو۔ میرا ساتھی الفریدو پر کڑی نظر رکھے گا۔ تھوڑی دیر بعد انور بھی اپنا

کام شروع کر دے گا اور ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ الفریدو تنہا ہے یا اس کے ساتھ کچھ

بھی ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ڈی گاریکا بھی اپنے کیمین کی طرف چلا گیا۔

”رمونا تم بھی ڈر رہی ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں میں باپ کی وجہ سے فکرمند ہوں۔“

”نہی لڑکی تمہارے اندیشے فضول ہیں۔ ہنسو، مسکراؤ، قہقہے لگاؤ۔ زندگی اسی کا نام ہے۔“

”میں ہنس تو رہی ہوں۔“ رمونا کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تمہاری گفتگو سکر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم بہت دلیر ہو۔“

”میں دلیر کہاں ہوں؟“

”خیر..... تم اپنے منہ سے تو اپنی تعریف کرو گے نہیں..... مگر!.....!“

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ حمید آ گیا۔

”کیوں تم کیوں چلے آئے؟“ فریدی اسے گھور کر بولا۔

”آپ مزے کریں اور میں دھکے کھاؤں۔“ حمید نے اردو میں کہا اور بیٹھ گیا۔ ”اب ڈیوٹی

بل جائے تو اچھا ہے۔ آپ جا کر اس الفریدو کے پٹھے کو تاکئے اور میں آپ کے فرائض انجام

دوں گا۔“

فریدی اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”بیہودے“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

”تم اپنی طرح مجھے بھی سمجھتے ہو۔ کسی دن کسی عورت ہی کے ساتھ مارے جاؤ گے۔“

”کیا بات ہے؟“ رمونا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں!.....!“ حمید نے ہنس کر کہا۔ ”ذرا الفریدو کے پیٹ میں درد اٹھا ہے ان سے

کہہ رہا ہوں کہ جا کر کوئی اعلیٰ قسم کا چورن تجویز کر دیں۔“

”ٹھیک سے بتاؤ نا!.....!“ رمونا نے کہا اور فریدی اٹھ کر چلا گیا۔

”چھوڑو بھی!..... البرونو پر خون کی پیاس سوار ہے۔ چلو عرثے پر چلیں!..... اس وقت ڈوبتا

ہو اسورج بڑا حسین لگ رہا ہوگا۔“

تھوڑی دیر بعد رمونا عرثے پر جہاز کی ریلنگ سے ٹکی ہوئی حمید سے کہہ رہی تھی۔

”البرونو کبھی آدمی معلوم ہوتا ہے اور کبھی کچھ اور۔ جب وہ ڈان الفریدو کو سہارا دینے جا رہا

تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خانوار بھیڑیا کسی بکری کے بچے کو سہارا دینے جا رہا ہو۔

نجانے کیوں میں نے سچ سچ اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس دیکھی تھی۔“

”ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

دونوں کافی دیر تک عرثے پر کھڑے رہے پھر رات کی سیاہی نے دیوپیکر موجوں کو آہستہ

آہستہ خوفناک بنا دیا۔ ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جہاز سے نکلنے والی لہروں کی ہلکی ہلکی بوچھا

لٹا کے چہروں پر نئی کھیر نے لگی تھی۔ وہ اپنے کیمینوں کو لوٹ آئے۔

رہی۔ ڈان الفریدو فریدی کی گرفت سے نکل جانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

”روشنی گل کر دو۔“ فریدی پھر بولا۔ ”ڈی گاریکا نے بڑھ کر سوچ آف کر دیا۔ ڈان الفریدو اپنے منہ سے فریدی کا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فریدی نے اسے اپنی کمر پر لا دیا اور تیزی سے باہر نکلا۔ ڈی گاریکا اور رمونا بھی اس کے پیچھے تھے۔ رینگ کے زب پنج کر فریدی جھکا۔ یہاں پھر دونوں میں جدوجہد ہونے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے فریدی ہالہا تھ کھڑا تھا۔

”پھینک دیا۔۔۔۔۔ تم نے اسے پھینک دیا۔“ رمونا زور سے چیخی۔ فریدی جھپٹ کر اس کے زب آیا۔

”بیوقوف احمق۔۔۔۔۔“ اس نے آہستہ سے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چپ رہو۔ چلو ہاگ چلو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔ قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔“

وہ بچوں کے بل کیبن میں گھس گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں اُڑتی تھیں۔

”تم نے بہت بُرا کیا۔“ فریدی نے آہستہ سے رمونا سے کہا جو اس کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

”غلطی ہوئی۔۔۔۔۔ غلطی ہوئی۔ البرونو اگر تم نہ ہوتے۔۔۔۔۔“ اس کی آواز گھٹ گئی اور اس کے ہونٹ فریدی کی پیشانی سے جا لگے۔

”بیوقوف لڑکی۔“ فریدی ایک بیک پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”ہوش میں رہو۔ ہوش میں۔“

”کیا بات ہے۔“ ڈی گاریکا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔!“ رمونا نے کہا۔ ”میرا سر چکرا رہا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد باہر پھر سناٹا چھا گیا۔ صرف لہروں کا شور سنائی دیا۔ فریدی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہوئے ان سے کہتا گیا۔ ”اب چپ چاپ سو رہو۔“

اپنے کیبن میں واپس آ کر وہ انور اور حمید کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ان دونوں آدمیوں کے تعلق سوچ رہا تھا۔

رات ڈھلتی گئی۔ بے کراں سناٹے میں لہروں کا شور اور انجن کا زانا گونجتا رہا۔ فریدی حید اور انور ابھی تک جاگ رہے تھے۔ فریدی ڈان الفریدو کے کیبن کے قریب دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ حمید اور انور عرشے پر رینگ کے قریب اندھیرے میں چپٹ لیٹے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی جن کی صورتیں اندھیرے میں پہچانی نہ جا سکیں ڈان الفریدو کے کیبن کے دروازے پر آ کر رُک گئے۔ چند لمحے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ کسی نے دروازہ کھولا اور وہ اندر چلے گئے۔ پھر اندر سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

دروازہ کھلا دو آدمی اندر سے نکلے۔ پھر تیسرے نے انہیں روک کر آہستہ سے کہا۔

”تم انہیں صرف بیس منٹ تک باتوں میں الجھائے رکھنا۔“

”دونوں پھر اندھیرے میں گم ہو گئے اور تیسرا اندر چلا گیا۔ انور اور حمید ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ فریدی بدستور کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور ایک آدمی نکل کر آہستہ آہستہ کیبنوں کی طرف بڑھنے لگا۔ فریدی رینگ کے سہارے رینگ رہا تھا۔ پراسرار سایہ ڈی گاریکا کے کیبن کے قریب رک گیا۔ فریدی سوچ رہا تھا کہ ڈی گاریکا نے اپنے کیبن کی روشنی کیوں نپیر بچائی؟ کیا وہ دونوں ابھی تک جاگ رہے ہیں۔

وہ آدمی تھوڑی دیر تک کیبن کے دروازے پر جھکا رہا۔ شاید وہ تالے کے سوراخ سے اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے ٹر فریدی کیبن کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ ڈی گاریکا اور رمونا روشنی گل کے بغیر ہی سو گئے تھے۔ فریدی نے پہلی ہی نظر میں ڈان الفریدو کو پہچان لیا وہ اس وقت پادری کے بھیس میں نہیں تھا۔ اس کے اٹھے ہوئے داہنے ہاتھ میں ایک خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے بجلی کی سرعت کیسا تھ بیلار ہاتھ ڈی گاریکا کے منہ پر رکھا اور قبل اس کے داہنا ہاتھ بھی استعمال کرتا فریدی کا بایاں ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور داہنا ہاتھ خنجر والے ہاتھ پر۔ ڈی گاریکا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ڈان الفریدو فرش پر فریدی کے گھٹنے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اتنے میں رمونا بھی جاگ پڑی۔

”خاموش۔۔۔۔۔ خاموش۔۔۔۔۔!“ فریدی آہستہ سے بولا اور رمونا کی چیخ ہونٹوں میں دب کر

ان دنٹ نے اس کی توہین کی تھی۔ یہ بات کسی طرح حلق سے نہیں اترتی۔ آج کی دنیا میں یہ لوگ نہیں ملتے جو صرف توہین کا بدلہ لینے کے لئے اپنی دروسری مول لیں۔

”کچھ بھی ہو۔“ رمونا نے کہا۔ ”لیکن مجھے البرونو کی نیت میں کسی قسم کا فور نہیں معلوم رہا۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ حد درجہ پراسرار ہے۔“

حمید انور اور فریدی بادیانی کشتی کے دوسرے سرے پر بیٹھے بادبانوں کو ہوا کے رخ پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسا کہ وہ ڈانٹنگ آئے تھے اور اب ڈانٹنگ سے منزل مقصود کی طرف جارہے تھے۔ ڈی گاریکا کو حیرت تھی کہ آخر البرونو انہیں پاسپورٹ کے بغیر کس طرح سفر لارہا ہے۔ اس نے فریدی سے اس کے متعلق پوچھا بھی تھا جس کا اس نے کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔

ڈانٹنگ سے وہ سیر و شکار کے بہانے روانہ ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لئے فریدی نے بک بڑی بادیانی کشتی چالیس پونڈ کے عوض خریدی تھی۔ جس پر ضرورت کا سارا سامان بار تھا۔ رات ہوا موافق تھی اور کشتی بیرن آئی لینڈ کی طرف جارہی تھی۔ ایک ایک کر کے ستارے اب چلے اور افق میں اجالے کی ایک پتلی سی لکیر ابھر رہی تھی۔ ہوا میں نرم روی اور لطیف سی خنکی تھی۔ بادبان ٹھیک ہو جانے کے بعد فریدی چت لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی ادھ کھلی آنکھیں تھیں اور جھرتی ہوئی روشن لکیر پر جی رہی تھیں۔

”ہے ہے.....!“ وہ انور کی طرف کروٹ لے کر بولا۔ ”بعض اوقات میں جوش کی پیغمبری ادا کر لیتا ہوں کیا شعر کہہ دیا ہے ظالم نے۔“

”ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت کے لئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی“

”ادھو.....!“ حمید طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔“

پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر رمونا کی طرف دیکھا جو چلو میں پانی لے لے کر اچھال رہی تھی۔

فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں واپس آ گئے۔

”وہ دونوں رات کی ڈیوٹی والے عملہ کو باتوں میں لگائے رکھنے کے لئے گئے تھے۔“ حمید نے کہا۔

”اب وہ کہاں ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”شاید سمندر کی گہرائیاں ناپ رہے ہوں گے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”شاباش.....!“ فریدی جوش میں اٹھتا ہوا بولا۔

”ہم ان کے پیچھے لگے رہے۔“ انور نے کہا۔ ”اور جب وہ ڈانٹنگ کے کین کی طرف پھر واپس آئے تو ہم ان پر ٹوٹ پڑے اور پھر..... حمید کے منع کرنے کے باوجود میں نے انہیں پھینک ہی دینا مناسب سمجھا۔“

”انور میرا سچا شاگرد ہے۔“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیوں آپ منع کیل کر رہے تھے۔“

”میں سمجھا تھا شاید آپ ان سے محبت کرنا پسند کریں۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔

”خود اعتمادی پیدا کرو برخوردار..... کب تک مجھ سے پوچھ پوچھ کر کام کرتے رہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ڈانٹنگ الفریڈو کا کیا ہوا۔“ انور نے پوچھا۔

”وہ اپنے ساتھیوں کی پیشوائی کیلئے پہلے ہی روانہ کر دیا گیا۔“ فریدی نے کہا اور سارا واقعہ دہرا کر بولا۔ ”اب ہمیں اس طرح سو رہنا چاہئے جیسے ہم رہنا چاہتے ناچتے کافی تھک گئے ہوں۔“

دشواریاں

”میں نے البرونو کی مدد حاصل کر کے غلطی نہیں کی تھی۔“ ڈی گاریکا رمونا سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن میں آج بھی متحیر ہوں کہ وہ اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہا ہے۔ محض اس لئے کہ

”شکریہ۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس طرح میں جیت جاؤں گا اور پھر اس سے پندرہ پونڈ بول کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہوگا۔“

”پندرہ پونڈ.....!“ رمونا حیرت سے بولی۔ ”اتنی لمبی شرط۔“
”روسی شہزادہ ہے نا..... بھلا اس کے لئے پندرہ پونڈ کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔ اس کا باپ راس سے کافی دولت لایا تھا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں اسے ایک قطرہ بھی نہ دوں گی۔“ رمونا ہنس کر بولی۔
حمید انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کی گفتگو نہ سن سکا۔ فریدی نے اسٹوپ جلا دیا اور اب رمونا چائے کے لئے پانی رکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد حمید کو بچ مچج تاؤ آ گیا کیونکہ رمونا نے اس کی طرف توجہ تک نہ دی تھی۔ حمید کے علاوہ اور سب چائے پی رہے تھے۔
ڈی گاریکا کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ اس نے رمونا سے پوچھا کہ اس نے اسے چائے کیوں نہیں دی۔

”آج اگست کا پہلا اتوار ہے نا۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”آج یہ کسی عورت کے ہاتھ سے کوئی چیز قبول نہ کرے گا۔“
حمید نے اسے گھور کر دیکھا لیکن انور بولتا رہا۔ ”یہ اس کے خاندان کی پرانی رسم ہے۔ بہت پرانی۔“

ڈی گاریکا نے فریدی کی طرف دیکھا۔
”انور سچ کہتا ہے۔“ فریدی چائے کی پیالی رکھ کر سگار سلگاتا ہوا بولا۔

حمید کا غصہ کافی ہو گیا۔ وہ نرمی طرح جھینپ رہا تھا۔ اس کا اوپری ہونٹ غیر ارادی طور پر پکپکاتے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی سب کے سب اس کی حالت پر ہنس پڑیں گے۔ آخر وہ جی کڑا کر کے اٹھا خود ہی چائے بنائی اور پینے لگا۔

”لاؤ اب نکالو پندرہ پونڈ.....!“ رمونا اس کا شانہ تھپک کر بولی۔
”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”حمید کی جڑ جڑ اہٹ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو۔“ اس نے آہستہ سے انور سے پوچھا۔
انور ہنسنے لگا۔

”رمونا.....!“ فریدی نے آواز دی۔
”کون.....؟“ رمونا چونک کر بولی۔ ”البرٹو کیا تم نے کچھ کہا۔“
”ہاں کیا چائے پلاؤ گی۔“

”تم نے کہا کب تھا۔ ابھی لو۔“ رمونا اپنی جگہ سے ہٹتی ہوئی بولی اس کے لہجے میں پیار تھا۔ حمید نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔
”کیا وضو کر رہے ہو۔“ فریدی نے اسے چھیڑا۔

”جی نہیں..... آپ کے لئے چلو بھر پانی تلاش کر رہا ہوں۔“ حمید جل کر بولا۔
”تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تمہاری آنکھ کا پانی مرچکا ہے۔“ فریدی نے کہا اور اٹھ کر بیڈنگ پھر انور کو مخاطب کر کے بولا۔ ”مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رمونا مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔“
حمید کچھ نہ بولا۔

”حمید تو کہہ رہا تھا کہ وہ اس پر ہزار جان سے باقاعدہ عاشق ہو گئی ہے۔“ انور نے کہا۔
”اچھا تو آپ کا بھی دماغ خراب ہوا۔“ حمید پلٹ کر بولا۔

انور کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ رمونا انہیں کے قریب اسٹوپ اٹھالائی۔
”ذرا دیکھنا تو۔“ وہ حمید کی طرف مڑ کر بولی۔ ”اسٹوپ کام نہیں کر رہا ہے۔“
”ادھر لاؤ.....!“ فریدی بولا۔

”کیا پھر اس کے دماغ کی کوئی رگ بگڑ گئی؟“ رمونا نے آہستہ سے پوچھا۔
”نہیں میں نے اس سے شرط لگائی ہے۔“
”کیسی شرط۔“

”یہی کہ تم اسے چائے نہیں پیش کرو گی۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”کہتا ہے کہ ناممکن ہے۔“

”اچھا تو واقعی میں اسے چائے نہ دوں گی۔“

”نہیں۔۔۔ تم پر یونہی کئی گدھوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔“ رمونا بولی۔

”خیر چلو ایک گدھی۔۔۔ ارے اف۔“ حمید نے اپنا منہ دبایا اور پھر ہکھلانے

”مطلب۔۔۔!“

”نہیں نہیں کہہ لو۔۔۔ گدھی بھی کہہ لو۔ مجھے برا نہیں معلوم ہوا۔“ رمونا نے کہا۔

”غلطی ہوئی کیا بتاؤں۔ بات یہ ہے کہ جب مجھ پر محبت سوار ہوتی ہے تو میں بالکل اُلو

جاتا ہوں۔“

”کیا تم پر ہر وقت محبت سوار رہتی ہے؟“ رمونا نے بھولے پن سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔ کیا میں ہر وقت الو معلوم ہوتا ہوں۔“

”غلطی۔۔۔!“ رمونا نے کہا اور مسکرانے لگی۔ حمید ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش رہا۔

پھر تھوڑی دیر بعد رمونا بولی۔ ”ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جلدی کرو۔“

”تو تم کیا سچ میرا دل توڑ دو گی۔“ حمید ڈرامائی انداز میں بولا۔

”نہیں۔۔۔ ابال کر کھاؤں گی۔“ رمونا نے کہا اور تیز قدم بڑھانے لگی۔

”خیر ایک دن تم میری لاش پر آنسو بہاؤ گی۔“ حمید نے کسی ناکام عاشق کے پرورد لہجے کی

باتاری۔

”اگر تمہاری لاش بھی الو نہ معلوم ہوئی تو۔“

رمونا آگے بڑھ گئی اور حمید بدستور ریٹکتا رہا۔ انور نے پلٹ کر دیکھا اور اس نے بھی اپنی

راست کردی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں دوسروں سے کافی فاصلے پر ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

”فریدی صاحب کی صحبت نے بھی تمہارے کردار پر کوئی اثر نہ ڈالا۔“ انور نے کہا۔

”جی۔۔۔!“ حمید نے داہنے ابرو کو جنبش دی۔ ”فریدی صاحب کی صحبت مجھے کبھی مار کاغذ تو

نہیں لگا کر زد پر آئی ہوئی ہر کبھی بس چپک کر ہی رہ جائے اور پھر میں مرد ہوں۔ ایک اثباتی

نتیجہ تو توں کے پیچھے دوڑنا ہی میرا معراج ہے۔“

”اور مٹی تو میں پلٹ کر تمہارے منہ پر تھکتی بھی نہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”نہ زیادہ بڑھ کر باتیں نہ کرو۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ ایک لڑکی ہی کے لئے تم بھی جھک

”ہٹاؤ جانے دو۔۔۔!“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”ورنہ رو دے گا۔ میں نے پندرہ پونہ

معاف کر دیئے۔“

”واہ شہزادے صاحب۔“ رمونا حمید کے چہرے کے پاس انگلی نچا کر بولی۔ ”ساری

شرارت رخصت ہو گئی۔“

حمید۔ جھلا کر چائے کی پیالی شیخ دی اور کیمین میں گھس گیا۔ فریدی اور انور بے اختیار ہنس

پڑے۔

”واقعی آپ نے کمال کر دیا۔“ انور نے کہا۔ ”یہ حضرت۔۔۔!“

”کیا بات تھی۔“ رمونا نے انور سے پوچھا۔ انور نے سارا واقعہ دہرایا اور رمونا بھی ہنس

پڑی۔ کشتی کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ یہاں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے جزیروں کا

جال سا پھیلا تھا۔ اس لئے موج زیادہ نہیں تھا۔

سہ پہر کو انہیں بیرن آئی لینڈ کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جزیرہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی سبز رنگ کی ڈبیا پر بھورے رنگ کا ڈھکن چڑھا ہوا ہو۔

”وہی ناقابل عبور چٹانیں ہیں۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔ ”ان کے گرد گھنے جنگل ہیں اور ان

کے درمیان میں ہماری بستیاں۔ یہ چٹانیں بظاہر خشک معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے اوپر بھی جنگل

ہیں گھنے اور خوفناک۔“

فریدی انور اور حمید نے اپنی دور بینیں نکال لی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ جزیرے سے قریب

ہوتے گئے۔ سمندر جزیرے میں دور تک گھستا چلا گیا تھا۔ جب انہوں نے اپنی کشتی روکی تو

گھنے جنگلوں کے درمیان میں تھے۔

وہ صرف ضروری سامان اور میگزین کی وافر مقدار اپنے ساتھ لائے تھے۔ کشتی کے بادبا

کھولے گئے اور تھری پلائی ووڈ کا فولڈنگ کیمین تہہ کر کے کشتی سمیت گھنی جھاڑیوں میں چھپا

گیا۔ انور ڈی گاریکا اور حمید نے سامان کے تھیلے لادے۔ کاندھوں پر راتھلیں لٹکائیں اور ج

پڑے۔ رمونا کے ہاتھ میں کھانے کی جھابی تھی۔

”لاؤ یہ مجھے دے دو۔“ حمید نے کہا۔ اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔

مارتے پھر رہے ہو۔“

”لیکن اس میں بھی میں نے اپنا وقار قائم رکھا ہے۔“ انور نے کہا۔

”وقار.....!“ حمید زہر خند کے ساتھ بولا۔ ”تم جیسے لوگوں کے وقار اور مرغیوں کے غرور میں مجھے کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔“

”خیر ہٹاؤ مجھے کیا۔“ انور اکتا کر بولا۔ ”مجھے یہ سب پسند نہیں۔“

”آخا..... تو کیا کچ کچ آپ اس کے بھائی بن گئے ہیں۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“

”اچھا جی! اے انور کے بچے۔ اگر تمہارے دماغ میں کیڑے کلبائے تو اچھا نہ ہوگا۔“

دونوں لہجے پڑے تھے اور ان کی آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ حمید سامان کا تھیلا زمین پر ڈال دیا تھا اور کاندھے سے رائفل اتارنے لگا۔ انور بدستور کمران لڑا۔

فریدی وغیرہ نے ان کی آوازیں سن لی تھیں۔ فریدی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آیا۔ ”کیا حماقت ہے۔ حمید تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔“ فریدی ان کے درمیان ان کی وجہ سے مہذب دنیا اس جزیرے کو غیر آباد سمجھتی ہے۔“

”سمجھتا ہی چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خود مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان چٹانوں کے

آتا ہوا بولا۔

”انور کو منع کیجئے۔“

”کیا بات ہے بھئی۔“ فریدی انور کی طرف مڑ کر بولا۔

”کچھ نہیں.....!“ انور نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید حمید کے بدن میں درد ہو رہا ہے۔“

قبل اس کے کہ حمید کچھ کہتا رمونا نے اس کے قریب پہنچ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”چہ، ہٹاؤ بھی جانے دو۔ درنہ کہیں مجھے کچ کچ تمہاری لاش پر آنسو بہانے پڑا۔“

رمونا سنجیدگی سے بولی اور انور ہنس پڑا۔ ”تم دونوں ضرورت سے زیادہ احمق ہو۔“ فریدی نے حمید اور انور کو مخاطب کر کے کہا۔

لڑنے کا موقع ہے۔“

”بات کیا تھی؟“ ڈی گاریکا نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“ انور جلدی سے بولا۔ ”بہسی کبھی حمید کے سر پر چھپکلی سوار تھی۔“

”سن رہے ہیں آپ۔“ حمید نے فریدی کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

”انور اب فضول باتیں بند کرو۔“

انور خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور رمونا حمید کے کاندھے پر تھیلا لادنے لگی۔

”چلو میرے الو شہزادے آگے بڑھو۔“ رمونا نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

”وہ پھر چل پڑے۔ سورج غروب ہوتے ہوتے چٹانوں کا سلسلہ صرف ایک میل کے

بلے پر رہ گیا تھا۔“

”واقعی نا قابل عبور معلوم ہوتی ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”ایسی چٹانیں آج تک

میرے نظروں سے نہیں گزریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی عظیم الشان قلعے کی دیواریں

سامان کا تھیلا زمین پر ڈال دیا تھا اور کاندھے سے رائفل اتارنے لگا۔ انور بدستور کمران لڑا۔

فریدی وغیرہ نے ان کی آوازیں سن لی تھیں۔ فریدی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آیا۔

”کیا حماقت ہے۔ حمید تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔“ فریدی ان کے درمیان ان کی وجہ سے مہذب دنیا اس جزیرے کو غیر آباد سمجھتی ہے۔“

”سمجھتا ہی چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خود مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان چٹانوں کے

پہنڈنگی کے آثار نہیں ہیں۔“

”رات یہیں کہیں گزاری جائے گی۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”وہ رات انہوں نے ایک درخت کے نیچے بسر کی۔ ڈی گاریکا کے بیان کے مطابق چٹانوں

کا اصرار دینے نہیں پائے جاتے تھے اس لئے انہوں نے دن بھر کی تھکن نہایت اطمینان دور

لے دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد وہ پھر چٹانوں کی طرف چل پڑے اس حصے میں بھی

لے جگہ تھے۔ ڈی گاریکا نے عام راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس لئے انہیں کلبھاڑی کی مدد سے

نئی راستہ بنانا پڑا۔ فریدی نے چوڑے پھل کی ایک چمکدار کلبھاڑی سنبھال رکھی تھی اور راستے

لے آئی ہوئی شاخوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتا جا رہا تھا۔ دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ چٹانوں

کا قریب پہنچ گئے۔ یہاں چٹانوں کے نیچے حد نظر تک بانسوں کا عظیم الشان جنگل پھیلا ہوا تھا۔

فریدی، انور اور حمید ایک ہزار فٹ اونچی چٹانوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایسا

کہ انہوں نے مخالف سمت دوڑنا شروع کر دیا۔ فائر وں کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بدلتی دے رہی تھیں۔

فریدی کا سر پانی کی سطح پر ابھرا اور ساتھ ہی رمونا کے سنہرے بال بھی دکھائی دیئے جنہیں اس نے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رمونا زمین پر چت پڑی ہوئی تھی اور فریدی قریب ہی بیٹھا اس کے ہوش بڑانے کا انتظار کر رہا تھا۔ فائر ابھی تک ہو رہے تھے۔ فریدی نے سمت کا اندازہ لگالیا تھا اوپر کی گولیاں چلا رہا تھا۔ لیکن فریدی ایسی جگہ پر تھا جو گولیوں کی زد سے باہر تھی۔ فریدی نے وہاں کی طرف دیکھا۔ اس کی سانسیں آہستہ آہستہ معمول پر آرہی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آگئی۔ اسی دوران میں سمت مخالف سے بھی فائر ہونے شروع ہوئے تھے۔

”درو نہیں..... تمہارے گولی نہیں لگی تھی۔“ فریدی نے کہا۔ ”تم گھبراہٹ میں گڑھے میں لگی تھیں۔“

”وہ لوگ کہاں ہیں۔“ رمونا نے پوچھا۔

”یہ نہیں..... میں نے تو تمہارے بعد ہی گڑھے میں چھلانگ لگا دی اور جب باہر آیا تو ”یہاں ایک دو فرلانگ لمبی قدرتی سرنگ تھی جس کے دہانے سے کچھ دور ہٹ کر ایک“

”تو وہ لوگ بھاگ گئے۔“ رمونا نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم نہ ہوتے تو میں اسی گڑھے میں لڑ رہا ہوتا۔“

فریدی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ ایک گولی ان کے قریب ہی آکر لگی اور فریدی نے رمونا کو بائیں طرف کھینچ لیا۔

”بس اس چٹان سے چپکی رہو۔“ وہ آہستہ سے بولا اور قریب پڑی ہوئی راسفل اٹھا کر اوپر طرف دیکھنے لگا۔ چٹان کے ایک کناؤ کے درمیان ایک سیاہ سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ ایک متحرک

بم دوسرے لمبے میں فریدی کی راسفل سے شعلہ نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دھبہ نیچے کی طرف گرنے لگا۔ پھر قریب ہی کسی دزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ رمونا جھج کر اچھل پڑی۔ ان

معلوم ہوتا تھا جیسے انسانی ہاتھوں نے ان کی سطح ہموار کی ہو۔ وہ نیچے سے اوپر تک سطح اور پری کھڑی ہوئی تھیں۔ ڈی گاریکا نے ایک طرف اشارہ کیا اور وہ سب بانسوں کے جنگل میں گئے۔

اب وہ چٹانوں کے نیچے مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے تک چلے رہے کے بعد ڈی گاریکا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ یہاں جنگل کافی گھٹنا تھا اور چٹان کے ایک حصے پر جنگلی بیلین پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈی گاریکا نے کلبھاری فریدی کے ہاتھ سے لے لی اور بیلین ہٹانے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ کلبھاری سمیت اچھل کر پیچھے ہٹ آیا۔ کلبھاری کے دستے سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

”کیا ہوا.....؟“ فریدی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”راستہ بند کر دیا گیا۔“ ڈی گاریکا نے مایوسانہ انداز میں کہا اور اس کے ہاتھ سے کلبھاری

چھوٹ پڑی۔ اس کی نظریں اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے اس نے بیلوں کا جھکاڑا ہٹا تھا۔ یہ ایک گڑھا سا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

”غار کا دہانہ.....!“ ڈی گاریکا آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”ڈان و سنٹ یہاں پہنچ گیا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”یہاں ایک دو فرلانگ لمبی قدرتی سرنگ تھی جس کے دہانے سے کچھ دور ہٹ کر ایک“

ندی ہے۔ انہوں نے شاید ندی سے سرنگ کو ملا دیا ہے۔“

ڈی گاریکا خاموش ہو گیا۔ وہ لوگ اس طرح خاموش تھے جیسے کسی لاش کے سرا۔

کھڑے ہوں۔ دفعتاً کسی طرف سے ایک فائر ہوا اور گولی حمید کی پیٹھ پر لدے ہوئے تھا چھیدی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

”پیچھے ہٹو.....!“ فریدی بے اختیار چیخا اور اچھل کر چٹان سے آگے۔ بقیہ لوگ بھی اس

پیچھے بھاگے۔ پھر دوسرا فائر ہوا۔ رمونا کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ غار کے وسیع دہانے میں پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح پر لہراتے ہوئے سنہرے بال بھی غائب ہو گئے۔ اسی ساتھ ہی فریدی نے بھی گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔ بقیہ لوگ اس بُری طرح سے گھبرا گئے۔

سے کچھ فاصلے پر خون میں ڈوبے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ رمونا دوسری چیخ کے ساتھ فریدی سے لپٹ گئی۔

فریدی نے اسے الگ ہٹا کر پھر اوپر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”البرونو.....!“ رمونا پھر چیختی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔

”تم نے بحرین میں کیا کہا تھا.....؟“ فریدی بدستور اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پرسکون لہجے میں بولا۔ ”کیا تم اپنے بھائی کے قاتلوں کے خون سے اپنے بال نہیں رنگو گی۔“

رمونا نے فریدی کے چہرے کی طرف دیکھا جو ہر قسم کے جذبات سے عاری نظر آ رہا تھا۔ رمونا سہم گئی۔

”کیوں.....؟“ فریدی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”فائر ہونے بند ہو گئے تھے۔ مخالف

سمت میں بھی خاموشی تھی۔ رمونا اوپر سے گرنے والی لاش کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ فریدی نے احتیاطاً پھر ایک فائر کیا۔ تھوڑی دیر تک جوانی فائر کا انتظار کرتا رہا لیکن دوسری طرف کلر خاموشی رہی۔ فریدی نے دو تین فائر اور کئے مگر جواب نہ دار۔

”شاید ایک ہی تھا۔“ وہ رمونا کی طرف مڑ کر بولا اور لاش کی طرف بڑھنے لگا۔

”ٹھہرو!“ رمونا گھبرا کر بولی۔ ”کہاں جا رہے ہو۔“

”تجربات میں اضافہ کرنے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ دیکھوں گا کہ ایک ہزار فٹ کی بلندی سے گرنے والے کی لاش کیسی ہو جاتی ہے۔“

رمونا نے فریدی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

فریدی نے مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش دی اور لاش پر جھک پڑا۔ وہ کافی دیر تک اسے الٹا پلٹا رہا۔ پھر رمونا کی طرف لوٹ آیا۔

”آؤ چلیں.....!“ وہ اسی طرف بھاگے ہوں گے۔“ فریدی نے مخالف سمت میں اشارہ کر کے کہا۔

”مجھ میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی ہے۔“ رمونا نحیف آواز میں بولی۔ ”فریدی نے تھیرا اٹھا کر پیٹھ پر لا دا۔ رائفل کا نہرے پر لٹکائی اور زمین پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”لو آؤ تم بھی لادو۔“

بھی جلدی کرو..... یہ وقت تکلفات کا نہیں۔ معلوم نہیں ان پر کیا گزری ہو۔ مجھے حیرت ہے۔

بیراسنجی بھی واپس نہ آیا۔“

اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ مخالف سمت جا رہا تھا۔ تھیلے کے ساتھ ساتھ رمونا بھی اس کی پیٹھ

لدی ہوئی تھی۔ دو تین فرلانگ چلنے کے بعد انہوں نے عجیب مضحکہ خیز منظر دیکھا۔ انور حمید اور

گاریکا بانسوں کے جھٹ میں پھیلی ہوئی بیلوں کے جال میں مڑی طرح پھنسے ہوئے رہائی کے

بنا تھ۔ جیر مار رہے تھے۔ فریدی بے اختیار فانس پڑا۔ ڈی گاریکا نے رمونا کو دیکھ کر چیخ ماری۔

انور اسے سہارا نہ دیتا تو گر پڑا ہوتا۔ پھر بھی تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

بڑا وہ رمونا کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ فریدی رمونا کو اتار کر آگے بڑھا۔

”یہ کیا ہوا.....؟“

”ہم ان خوفناک بیلوں سے بے خبر فائر کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے کہ اچانک

ہم نے ہمیں جکڑ لیا۔“ انور نے کہا۔ ”چاقو اور کلہاڑی آپ کے تھیلے میں رہ گئے تھے۔“

فریدی نے چاقو کی مدد سے انہیں بیلوں کے جال سے آزاد کیا۔ حمید کی نظریں رمونا پر جمی

تھیں جو فریدی کی پیٹھ پر لد کر یہاں تک پہنچی تھی۔ پھر ڈی گاریکا نے آنسوؤں اور آہوں کے

بان رمونا کے فوج جانے کی داستان سنی۔

”لیکن ایک خوشخبری بھی سنئے۔“ انور نے کہا۔ ”اگر ہم اس جال میں نہ پھنستے تو یہ ہماری

بائی بھینسی ہوتی۔“

”یعنی.....!“

”ان بیلوں کے درمیان میں ایک غار موجود ہے اور ڈی گاریکا کا خیال ہے کہ اس کا دہانہ

طرف ہوگا۔“

”صرف خیال ہے یا یقین بھی۔“ فریدی نے ڈی گاریکا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”صرف خیال۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”ہاں..... آں کدھر.....؟“ فریدی بیلوں کے جھکڑوں کی طرف مڑ کر بولا۔

ڈی گاریکا آگے بڑھ کر کلہاڑی کی مدد سے بلیں ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد غار کا دہانہ

دکھائی دیا۔

”اپنی شریساں ہوتا ہے۔“

”سانپوں کے متعلق تم کیا جانو۔“ ڈی گاریکا کے لہجے میں تحیر تھا۔

فریدی کوئی جواب دیئے بغیر بڑھتا رہا۔ آگے چل کر انہیں روشنی دکھائی دی پھر کچھ سرسبز جھاڑیاں نظر آئیں۔ ڈی گاریکا نے سینے پر اپنے ہاتھ سے صلیب کا نشان بنا کر ایک لمبی دعا پڑھی پھر فریدی سے بولا۔ ”بے شک یہ راستہ ایک بالکل ہی نئی دریافت ہے۔“

وہ دونوں واپس لوٹے۔ فریدی نے انور وغیرہ کو بتایا کہ وہ ایک نیا راستہ دریافت کرنے میں سچ کامیاب ہو گئے ہیں۔ پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ ان کی روانگی رات پر ملتوی کر دی جائے یا اسی وقت چٹانیں پار کی جائیں۔

”میرا خیال ہے کہ ہم دن ہی دن نکل چلیں کیونکہ ادھر کا جنگل خطرات سے بھرا پڑا ہے۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمارے دشمنوں میں سے یہاں شاید صرف ایک ہی تھا جسے میں نے ختم کر دیا۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ حمید بولا۔

”قیاس ہے۔ اگر وہ اکیلا نہیں تھا تو اس کی موت پر اس کے ساتھیوں کو کافی اودھم مچانا چاہئے تھا۔ اپنی دانست میں وہ ہمارا راستہ تو بند ہی کر چکے تھے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ چل پڑے۔ رمونا کی نقاہت ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس بار اسے اس کے باپ نے اپنی پیٹھ پر لا کر رکھا تھا۔

”کاش.....!“ حمید آہستہ سے بولا۔

”چپ چپ۔“ انور نے اسے چھیڑا۔ ”تم یوں ہی دھان پان ہو پیارے۔ بھلا یہ نومن کی لاش تم سے کب سنبھلتی۔ اچھا ہی ہوا اور ہا فریدی صاحب کا معاملہ تو آن سعادت بزرور بازو بود۔“

”اچھا اب منہ میں لگام دیجئے۔ ورنہ مجبوراً مجھے نواب چابک نواز جنگ بہادر بننا پڑے گا۔“

غار کے دوسرے دہانے سے نکلنے کے بعد انہوں نے خود کو ڈھلوان چٹانوں کی ایک چھوٹی کناوی میں پایا۔ ڈی گاریکا تھوڑی دیر تک کھڑا سمجھتا تھا کہ اندازہ لگاتا رہا پھر ایک طرف انگلی اٹھا

”تم دونوں رمونا کے ساتھ ٹھہرو۔“ فریدی نے انور اور حمید سے کہا اور تھیلے سے ایک پستول اور نارچ نکال کر ڈی گاریکا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا غار میں اتر گیا۔

کئی حادثے

چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ فریدی نے نارچ روشن کر لی۔ آگے چل کر غار سرنگ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ کافی اور سیلن کی بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ فریدی کو ایسا غور ہو رہا تھا جیسے اس کا ہر قدم جہنم کی طرف اٹھ رہا ہو اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ گرمی کے باوجود اس کے جسم سے پسینے کی ایک بوند بھی نہ پھوٹی۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔ دفعتاً انہیں عجیب قسم کی چھنچھناہٹ سنائی۔ دونوں رک گئے۔ آواز کی طرف فریدی نے روشنی ڈالی اور دوسرے ہی لمحے اس کے پستول سے شعلہ نکلا اور ایک بہت بڑا سانپ اچھل کر ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس نے دو تین بار زمین پر سر پٹخا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

”بڑا سچا نشانہ ہے۔“ ڈی گاریکا مضطربانہ انداز میں بولا۔

فریدی نے ادھر ادھر روشنی ڈالنی شروع کر دی۔ ایک جگہ بہت سارے بڑے بڑے انڈے دکھائی دیئے۔

”بڑی حیرت ہوئی۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”ورنہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی مادہ بڑا خطرناک ہوتی ہے۔“

”مگر اس قسم کا سانپ یہاں خط سلطان پر کیسے؟“

”کیوں.....؟“

”یہ جارا کا سانپ تھا جو صرف جنوبی امریکہ کے استوائی خطوں میں پایا جاتا ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”احتیاط سے چلو۔ ممکن ہے کہ اس کا ساتھی بھی مل جائے۔ یہ اپنی قسم

کر بولا۔ ”ہمیں ادھر سے چڑھنا ہوگا۔“

چٹانوں کی بناوٹ بتا رہی تھی کہ یہاں کبھی آتش فشاں پھوٹے رہے ہوں گے۔ مگر جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے وہ ڈی گاریکا کے بتائے ہوئے راستے پر چڑھنے لگے۔ ڈی گار بُری طرح تھک گیا تھا اور اب اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ رمونا سے چڑھائی پر نہ چل سکے گا۔ مجبوراً فریدی کو اپنی خدمات پیش کرنی پڑیں۔

”البرونو مجھے سخت شرمندگی ہے۔“ رمونا نے آہستہ سے کہا۔

”پرواہ مت کرو۔“ فریدی بولا۔

راستے میں انور ڈی گاریکا اور حمید سستانے کیلئے کئی جگہ رکے۔ مگر فریدی بدستور چلتا رہا۔

”البرونو تم گوشت پوست کے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ رمونا نے کہا۔

”وہ بھی یہی کہتے ہیں جنہیں میں گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہوں۔“

”البرونو تمہیں کشت و خون کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی دلچسپی ہے۔“ رمونا نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں..... مجھے سربسز مرغز اردوں سے پیار ہے۔ میں نیلے آسمان کی بے کر

وسعتوں کو پیار کرتا ہوں۔ مجھے بیلے کی ننھی ننھی کلیوں سے محبت ہے۔ مجھے اس وقت اتنی بڑا

لگتا ہے، جب غروب کے بعد رنگین لہریں آہستہ بہت تارکیوں میں گھلنے لگتے ہیں۔ مجھے

ہری گھاس کی سوندھی خوشبو سے عشق ہے۔ مجھے چاندنی راتوں کا عظیم سناٹا بے حد پسند ہے۔“

”کچھ اور بھی.....!“

”بہت کچھ.....!“

”کیا.....؟“

”اب اس وقت تو یاد نہیں آ رہا ہے پھر کبھی اطمینان سے پوچھنا۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”تم جو کچھ پوچھنا چاہتی ہو یہ کبھی نہ بتائے گا۔“ پیچھے سے حمید کی آواز آئی۔ ”میں

بتاؤں..... اسے عورتوں سے نفرت ہے۔“

”سٹ اپ.....!“ فریدی مڑ کر بولا۔

”رمونا میں تم سے حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“

”کیوں البرونو.....!“ رمونا نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

”ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے عورتوں اور ان سے عشق کے ڈھکوسلوں سے دلچسپی نہیں۔“ فریدی بولا۔

”لیکن نفرت نہیں کرتے۔“ رمونا نے پوچھا۔

”بھلا نفرت کیسے کر سکتا ہوں جبکہ میری ماں بھی عورت ہی تھی۔“

رمونا کچھ سوچنے لگی۔ حمید نے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا تھا۔

”البرونو تم تھک گئے ہو گے۔“ رمونا تھوڑی دیر بعد بولی۔

”فکرت کرو۔“ حمید چپک کر بولا۔ ”البرونو کا دماغ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ یہ تو تم دیکھ ہی چکی

ہو کہ کسی کی جان لے لیتا، اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور کسی کو قتل کرنے کے بعد اسے ذرہ

برابر بھی افسوس نہیں ہوتا۔ لہذا جب تھک جائے گا تو تمہیں بھی کسی گہری کھائی میں پھینک کر اس

طرح مطمئن نظر آئے گا جیسے اس نے اپنے کان پر رنگتی ہوئی چوٹی جھاڑ دی ہو۔

فریدی بے اختیار ہنس پڑا اور رمونا سچ کچھ خائف سی نظر آنے لگی، اچانک اس کے دل

کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ فریدی اس تبدیلی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے حمید کی اس حرکت پر غصہ

آگیا۔

”ظہور.....!“ وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ حمید رک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”اب تم لے چلو گے رمونا کو۔“ فریدی نے کہا۔ اس کی بنجیدگی دیکھ کر حمید سہم گیا۔

”میں..... میں۔“

”چلو اٹھاؤ.....!“ فریدی سخت لہجے میں بولا۔ اس نے رمونا کو نیچے اتار دیا تھا۔

”دیکھئے مذاق کی بات نہیں۔“ حمید گھبرا کر اردو میں بولا۔

”میں بنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور اپنے ہونٹ بھیجنے لے۔

”اوپر پہنچنے سے پہلے ہی مرجاؤں گا۔“

”چلو.....!“ فریدی مکا تان کر بولا۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ حمید رمونا کے آگے جھکتا ہوا بولا۔ فریدی نے رمونا کو اشارہ کیا

اور ”چپ چاپ اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی۔ حمید سیدھا ہوتے وقت بُری طرح ڈگمگایا۔

چٹانوں کی آخری سطح پر پہنچ کر فریدی نے رمونا کو ایک درخت کے تنے کے سہارے بٹھا دیا اور خود ایک سگار سٹگا کر ڈی گاریکا وغیرہ کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں چٹانوں کی سطح بالکل ہموار ہو گئی تھی۔ حد نظر تک گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی چٹانوں پر گھنے جنگل کی موجودگی معجزے سے کم نہ تھی۔ یہاں اسے سنبل کے بے شمار درخت دکھائی دیے جو بڑے بڑے سرخ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

”تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔“ فریدی نے رمونا سے کہا۔

”نہیں تو.....!“ رمونا آہستہ سے بولی۔

”آ خر تم مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”نہیں خوفزدہ تو نہیں۔“ رمونا پھپکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے اس کا افسوس ہے کہ تم رازوں میں جھگڑا ہو گیا۔“

”جھگڑا.....!“ فریدی متحیر ہو کر بولا۔ ”اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ وہ دن ازمیں سینکڑوں بار مجھ سے روٹھتا اور مٹتا ہے۔“

فریدی کچھ اور کہنے جا رہا تھا کہ ڈی گاریکا وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ حمید کی آنکھیں غصے سے لڑن ہو رہی تھیں۔ اس نے فریدی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

”مجھ میں تو اب چلنے کی سکت نہیں رہ گئی ہے۔“ ڈی گاریکا بیٹھتا ہوا بولا۔

”فکرمات کرو۔ میرا ساتھی تمہیں لے چلے گا۔“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لغت ہے ایسی زندگی پر۔“ حمید نے جھلا کر کہا اور تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔

”یہاں نے جھپٹ کر اُسے پکڑ لیا اور دبوچ کر اس کا سر سہلاتا ہوا آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

”چہ چہ..... میرے راج دلارے۔ بر خوردار سلسلہ، یہ تمہاری محبوبہ دانواز کے والد صاحب کے ہیں۔“

”کیا بات ہے۔“ ڈی گاریکا ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”میں عورت نہیں ہوں کہ تمہاری بوجھلہ کر چلوں گا۔“

”اب یہ تم سے باقاعدہ محبت شروع کر دے گی۔“ فریدی زہر خند کے ساتھ بولا۔

”چلو چلو آگے بڑھو۔ اگر تم ذرا بھی رکے تو بڑی شاندار ٹھوکر رسید کروں گا۔“

ہر قدم پر حمید کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ رمونا خاصی تندرست اور دراز قد لڑکی تھی۔ رمونا بھی محسوس کر رہی تھی کہ حمید زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ لیکن وہ خاموشی نہ جانے کیوں۔ اس وقت وہ فریدی سے گفتگو کرنے میں خوف محسوس کرنے لگی تھی۔

”میں رمونا سمیت کسی گہری کھائی میں چھلا بگ لگا دوں گا۔“ حمید فریدی کی طرف مڑ کر ہانپتا ہوا بولا۔

”اچھا خدا حافظ..... قیامت کے دن ملاقات ہوگی۔“ فریدی سلام کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ڈی گاریکا اور انور کافی دور تھے۔ ڈی گاریکا کی وجہ سے انور بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

فریدی تھوڑی دور چلنے کے بعد مڑا۔ حمید رمونا کو اتار کر ڈی گاریکا وغیرہ کی طرف لوٹ رہا تھا اور رمونا گرتی پڑتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ فریدی تیزی سے اس کی طرف لوٹ پڑا۔

”تو اس نے تمہیں اتار دیا۔“ فریدی نے کہا۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔“ رمونا نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ!“ فریدی زمین پر بیٹھتا ہوا بولا۔

”نہیں..... نہیں.....!“ رمونا بے اختیار رو پڑی۔

”بیوقوف لڑکی، ہلکی کہیں کی۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”میں نے اس کی قہقہے کی طرح چلنے والی زبان بند کرنے کی کوشش کی تھی۔“

رمونا بدستور روتی رہی اور فریدی نے اسے پیٹھ پر اٹھالیا۔

”میرے ساتھ ہی پر نرمی طرح عشق کا بھوت سوار رہتا ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”اسے اس وقت میں نے اتار دیا۔“

رمونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی خوفزدہ اور بے بس بچے کی طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

”البرو نو برا آدی ضرور ہے مگر صرف دشمنوں کے لئے۔“ فریدی نے اسے پھر دھتار دیا۔

”ہم دونوں آپس میں مذاق کر رہے ہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا اور حمید کو کھینچا ہوا ہونٹوں کے پاس لایا۔ پھر اس نے حمید کو اس طرح تنگ کرنا شروع کیا کہ وہ بے اختیار چیخنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد رمونا مچھلیوں اور گوشت کے ڈبے کھول رہی تھی۔ مختصر سادہ سرخوان بچہ گیا۔ ”یہ رات ہمیں گزاری جائے۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔ ”یہاں درندے نہیں معلوم ہوتے۔“ اور اگر انہوں نے رومولی کو مار ڈالا تو.....“ انور نے کہا۔ ”یہ تو ظاہر ہے کہ ڈان ولسون یہاں پہنچ گیا ہے ورنہ وہ راستہ نہ بند کرتے۔“

”یہاں رات کو سفر کرنا انتہائی خطرناک ہے اور جب ہم نہ ہوں گے تو رومولی کا کیا بے گا۔ ویسے تو ممکن ہے کہ ہم اسے کسی نہ کسی طرح بچا ہی لیں۔“ وہ رات انہوں نے وہیں بسر کی اور باری باری سے سب لوگ جاگتے رہے۔ دوسری صبح کو سفر پھر شروع ہو گیا۔ وہ کئی گھنٹے تک گھنے جنگلوں سے گزرتے رہے دفعتاً ڈی گاریکا چلتے چلتے رک گیا۔

”میرا اندازہ غلط نکلا۔“ اس نے پرندامت انداز میں کہا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ اس سمت میں چلنے پر ہم جلدی رسیوں کے پل تک پہنچ جائیں گے۔“ ”رسیوں کا پل.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”ہاں چٹانوں کے درمیان ایک گہری کھائی پر بنایا گیا تھا۔ دونوں چٹانوں کا فاصلہ پچیس فٹ سے زیادہ نہیں۔ اس کے آگے پھر کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ یہ پچیس فٹ چوڑی دراڑ میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ فی الحال اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم کسی بہت اونچے درخت پر چڑھ کر گرد و پیش نظر دوڑائیں ورنہ کب تک اس طرح بھٹکتے پھریں گے۔“

حمید نے برا سامنہ بنایا۔

ڈی گاریکا ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”بس یہ ٹھیک رہے گا۔ ہمیں صرف اس دراڑ کا پتہ لگانا ہے۔ اس کے بعد پل میں تلاش کر لوں گا۔“ ”لیکن درخت پر چڑھے گا کون۔“ انور نے کہا۔ ”کم از کم مجھ میں تو اتنے اونچے درخت پر چڑھنے کی ہمت نہیں۔“

”تم میں کسی بات کی ہمت نہیں۔“ حمید نے اپنا تھیلا زمین پر گراتے ہوئے کہا۔ رائفل اتار کر تھیلے سے لٹکادی اور اب اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ فریدی پر تشویش انداز میں حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم چڑھ جاؤ گے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”کیوں نہیں! کیا آپ مجھے بھی انور سمجھتے ہیں۔“ حمید نے اس انداز میں کہا کہ رمونا ہنس پڑی۔

دوسرے لمحے میں وہ بندر کی پھرتی کے ساتھ درخت کے سپاٹ تنے پر چڑھ رہا تھا اور رمونا نے جاری تھی۔ حمید رمونا کی کھٹکتی ہوئی ہنسی سے لطف اندوز ہوتا ہوا ایک شاخ سے دوسری شاخ پر بیدار کھتا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کچھ دور بہ مغرب کی طرف ایک چوڑی سی سیاہ لکیر دکھائی دی جس کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ حمید تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھ کر راستے کا تعین کرتا رہا۔ پھر نیچے اترنے لگا۔ دفعتاً اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے موجود ہو۔ حمید نے پلٹ کر دیکھا دوسرے سرخ آکھیں اس کی آنکھوں میں گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں کے نیچے ایک چوٹی سی ناک تھی۔ نچلا جڑا آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ ٹھوڑی کے گرد سفید بالوں کے بڑے بڑے گچھے تھے۔ حمید ایک شاخ سے پھسل کر دوسری پر آ رہا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اوپر کی شاخ دوبارہ اس کی گرفت میں آگئی ورنہ ہڈیاں سرمہ ہو جاتیں۔ وہ اب تک حمید کی طرف گھور رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنا منہ کھولا۔ ساتھ ہی حمید کا بھی منہ کھل گیا اور بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔

”ڈرو نہیں۔“ نیچے سے فریدی کی آواز آئی۔ ”میں نے اسے دیکھ لیا وہ ایک بے ضرر قسم کا بندر ہے۔“

حمید کی چیخیں سن کر وہ اچھلا اور دوسری شاخ پر چلا گیا۔ حمید نے اب دیکھا کہ اس کے مارے جسم پر بھی ننھے ننھے بال تھے۔ حمید تیزی سے نیچے اترنے لگا اور تقریباً دس فٹ کی بلندی سے بھلا لنگ لگا دی۔

”بیوقوف آدمی وہ بندر تھا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”انتھرہ پواند کہلاتا ہے۔ دیکھو جغرافیہ

بلد نمبر 5
میں ڈوبتی چلی گئیں۔

ہمیں کافی محتاط رہنا پڑا۔ ڈی گاریکا فریدی وغیرہ کی طرف مڑ کر بولا اور چلنے لگا۔
ہاروں کی آوازیں کہیں دور سے آتی معلوم ہو رہی تھیں۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز۔

ایک گھنٹہ بعد وہ دراڑ کے قریب پہنچ گئے۔ فریدی نے کنارے جا کر نیچے کی طرف جھانکا۔
ان کا پاؤں سوٹ سے کم گہرائی نہ رہی ہوگی۔ اور پچیس تیس فٹ کی دوری پر دوسری چٹانوں کا
مسلخ شروع ہو گیا تھا۔ ڈی گاریکا شمال کی طرف چلنے لگا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے تھے
ہاروں کی آوازیں قریب ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔

”ناممکن..... بالکل ناممکن..... اب کیا ہوگا۔“ ڈی گاریکا لڑکھڑاتا ہوا بولا۔ اگر وہ ایک
فٹ کے تنے کا سہارا نہ لے لیتا تو اس کا گر جانا یقینی تھا۔

”کیا ہوا۔“ فریدی چیخا۔ ڈی گاریکا سنبھل چکا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلے..... مگر آواز نہ
لائی۔ فریدی نے آگے بڑھ کر تنے سے جھنجھوڑا اور وہ اس طرح چونک پڑا جیسے سوتے سوتے جاگا

”بل کاٹ دیا گیا۔“ وہ ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے بولا جس کے تنے سے موٹی
اریاں لپٹی ہوئی تھیں۔

”اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔“ وہ اس طرح بڑبڑایا جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

غیر متوقع انجام

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ڈان ونسٹ وغیرہ نے ہمیں یہاں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔“
لانے کہا۔ ”ورنہ بل کے کاٹنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی دانست میں
ٹانڈ کر دیا تھا، لیکن انہوں نے رات ہی کو ہم پر حملہ کیوں نہیں کر دیا۔“
”ممکن ہے انہوں نے آج ہی ہمیں دیکھا ہو۔“ انور نے کہا۔

یاد رکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے ورنہ تم سچ سچ شہید ہو گئے ہوتے، مگر مجھے اب جغرافیہ کی محنت
بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جغرافیہ کی رو سے اس قسم کے بندر خط سلطان پر نہیں پائے جاتے۔
”تم چیخنے کیوں لگے تھے۔“ رمونا ہنس کر بولی۔

”چیخ کب رہا تھا۔“ حمید بسور نے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔ ”میں تو رونے لگا تھا۔“
”کیوں.....؟“ رمونا نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

اس بار لیش اور برگزیدہ بندر کو دیکھ کر بے اختیار دادا جان مرحوم یاد آ گئے تھے۔
”خیر..... خیر.....!“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”غیر دلچسپ باتیں مت کرو۔ کام کی بات کرو۔“
”کام کی بات یہ ہے کہ وہ بندر ہمارے نام اور پتے لکھ کر لے گیا ہے۔ اب باقاعدہ خط
کتابت کرتا رہے گا۔ اس سے طرفین کی خیر و عافیت وغیرہ معلوم ہو جایا کرے گی۔“

”یکو مت.....!“ فریدی چیخ کر بولا اور رمونا پھر ہنسنے لگی۔ فریدی درخت کی طرف بڑھا
خود ہی چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حمید نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔

”اتنے اونچے درخت سے خود کشی بے کار رہے گی کیونکہ سراغ رساں لاش نہ پہچان پائیں
گے کیا فائدہ۔“ اس نے کہا۔

فریدی نے پلٹ کر اس کی گردن پکڑ لی۔
”بب بب بتاتا ہوں۔“ حمید تملاکر چیخا۔ فریدی نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ منہ بنا کر

بولا۔ ”مغرب کی طرف وہ دراڑ موجود ہے۔ شاید دو میل کا فاصلہ ہوگا۔ تو گردن چھوڑ دینا۔
آپ مذاق پر آمادہ ہوں تب بھی میری ہی شامت، اور میں مذاق کروں تو شامت در شامت۔“

فریدی اس کی گردن چھوڑ کر ڈی گاریکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔
پھر وہ لوگ مغرب کی طرف چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ڈی گاریکا کو کچھ شے

لگا۔ فریدی بھی چونک پڑا۔ وہ معنی خیز نظروں سے ڈی گاریکا کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”جنگلی قبائل کا جنگلی تھارہ۔“ ڈی گاریکا زیر لب بڑبڑایا۔ ”یا تو وہ کسی سے جنگ کر رہے

ہیں یا پھر ان کے کسی بڑے تہوار کا موقع ہے۔“
ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ پھر تھارے کی آوازیں لہراتی ہوئی آئیں اور جنگل کی دھنوں

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم کوشش کریں تو جلد ہی انہیں جالیں گے۔“

”مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“ ڈی گاریکا مایوسانہ لہجے میں بولا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”البرونو مایوس ہونا نہیں جانتا۔“ فریدی لاپرواہی سے بولا اور وہ اس اونچے درخت کو پیچھے سے اوپر تک دیکھ رہا تھا جس کے سہارے رسیوں کا بل بنایا گیا تھا۔

”وہ دیکھو.....!“ حمید چیخا۔ سب کی نظریں اس کے ہاتھ کی طرف اٹھ گئیں جو دراز کے اشارہ کر رہا تھا۔ بہت دور ایک ابھری ہوئی چٹان پر کئی آدمی چلتے دکھائی دے رہے تھے۔

”وہی ہوں گے۔“ فریدی نے کہا اور تھملا کھول کر کلبھازی نکالنے لگا۔ بقیہ لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے درخت کے تنے پر کلبھازی سے ضریریں لگانی شروع کر دیں۔

”کیا تمہارا دماغ بھی جواب دے گیا۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”کیوں؟ میں اس دراز پر ایک دوسرا بل بنانے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

ڈی گاریکا کچھ سوچنے لگا۔ پھر دفعتاً اچھل کر بولا۔ ”البرونو تم معمولی آدمی نہیں ہو۔ تم کے فوق البشر ہو۔“

پھر وہ سب باری باری سے درخت پر کلبھازی چلاتے رہے اور شام ہوتے ہوتے انہوں نے اسے گرا ہی لیا۔ درخت دوسری طرف کی چٹانوں سے جا لگا تھا۔

مگر اس کے چکنے تنے پر چلنا آسان کام نہیں۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”سچ مچ تمہارا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہ گیا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ اس نے رائفل کا نہرے پر لٹکائی اور سامان کا تھملا پیٹھ پر باندھا اور درخت کے تنے پر بیٹھ کر دونوں طرف

پیر ادھر ادھر لٹکائے اور پھر اس کی حالت دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ تنے پر دونوں ہاتھ ٹیک کر پھدکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے ان کی طرف دیکھا

قتبہ لگاتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا۔ پھر باری باری سے سب نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر وہ سب دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ رمونا نے اسٹوپ ہا

چڑھا دیا تھا اور اب دودھ کے ڈبے میں سوراخ کر رہی تھی۔

”یہ سوراخ میرے دل میں ہو رہا ہے۔“ حمید نے فریدی کی طہر ف جھک کر آہستہ سے کہا۔

”اور اگر میں تمہارے سر میں بھی سوراخ کر دوں تو۔“ فریدی نے بجھا ہوا سر پھینک کر کہا۔

”خدا کی قسم..... اس کی انگلیاں..... ہے ہے۔“

”بس اب چپ بھی رہو..... ورنہ میں اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں؟ کیوں؟ کیا کیا ہے اس بے چاری نے۔“

”کچھ نہیں.....!“ فریدی حمید کو گھور کر بولا۔ ”یہ اس لئے کروں گا کہ وہ پھر تمہاری پیٹھ پر

مرسز کر سکے اور اس بار میں تمہاری کھال گرا دوں گا احق کہیں کے۔“

انہیں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ ڈان ونسٹ جزیرے میں ان کے داخلے سے لاعلم نہیں

ہے۔ اس لئے ڈی گاریکا کی تجویز پر انہوں نے راستہ بدل دیا ڈی گاریکا کا خیال تھا کہ اس طرح

ڈان ونسٹ کو راستے ہی میں جالیں گے۔

سہ پہر کو وہ ایک ویران حصے سے گزر رہے تھے۔ جنگلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ چاروں

رف کتھی رنگ کی اونچی نیچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ فریدی وغیرہ کی پانی کی بوتلوں میں کافی

نما موجود تھا۔ ورنہ اس سنگلاخ حصے کو دیکھتے ہوئے ان میں سے ایک آدھ کا ہارٹ فل ضرور

جاتا کیونکہ اس قسم کی چٹانوں میں پانی تو بڑی چیز ہے پانی کا فریب دینے والی ریت بھی نہیں

نہ۔

دفعتاً فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر اپنے ساتھیوں

ارکے کا اشارہ کر کے ایک چٹان پر چڑھ گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی آنکھیں پر اسرار طور

بند رہی تھیں۔

”وہ آرہے ہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم لوگ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد انہیں قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔

”وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے کیونکہ کافی نشیب میں ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”تم لوگ اپنے

اوتے اتار لو۔“

وہ سب ننگے پیر چلنے لگے..... چلتے رہے حتیٰ کہ سورج دور کی پہاڑیوں میں جھکنے لگا۔ وہ

چلتے چلتے دفعتاً فریدی نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر گر پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ کچھ آدمی اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ کئی ٹارچوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔
 ”ارے یہ تو الفریدو ہے۔“ کسی نے کہا۔ ”چلو جلدی اسے اٹھاؤ..... لیکن احتیاط سے کسی تدریجی ہو گیا ہے۔“

دو تین آدمی فریدی پر جھک پڑے۔ لیکن انہوں نے ابھی ہاتھ ہی لگائے تھے کہ فریدی اچھل پڑا۔ دوسرے لمحے میں وہ ایک ابھرتی ہوئی چٹان کی اوٹ میں تھا۔
 ”خبردار.....!“ وہ ریوار نکال کر بولا۔ ”پیچھے ہٹو ورنہ سب کو ختم کر دوں گا۔“
 ”الفریدو اس کی ضرورت نہیں۔“ کسی نے دوسری طرف سے کہا۔
 ”ڈان ونسٹ!“ فریدی تھیرا مبرز لہجے میں بولا۔ ”شکر ہے تیرا۔ شکر ہے اے خدا۔“
 اور پھر وہ چٹان کی اوٹ سے نکل آیا۔ ڈان ونسٹ اسے سہارا دے کر کھپ کی طرف لے جانے لگا۔

رشیدہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ ڈان ونسٹ نے فریدی کو ایک چٹان کے سہارے بٹھا دیا۔
 ”میں بیرونی جنگل تک ان کے پیچھے لگا آیا تھا۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔
 ”لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ اندر کیسے داخل ہوئے۔“ ڈان ونسٹ نے کہا۔ ”انہیں دیکھ کر میں نے رسیوں کا پل بھی کاٹ دیا تھا۔“

”انہوں نے بانسوں کے جنگل میں ایک دوسرا راستہ دریافت کر لیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔
 ”اکی راستہ سے میں داخل ہوا ہوں۔ وہ آگے نکل گئے اور میں ایک مصیبت میں پھنس گیا۔ ایک ٹھانسنے میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں کہ میں اس دراڑ میں کیسے جا پڑا۔“

”دراڑ میں۔“ جان ونسٹ حیرت سے بولا۔ ”لیکن پھر تم اس میں سے نکلے کس طرح۔“
 ”یہی تو بتانے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے اپنی پھولی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”میں دیوانہ وار دراڑ میں دوڑ رہا تھا اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہاں جانکا جہاں

برابر قدموں کی آوازیں سنتے رہے تھے اور فریدی کبھی کبھی کسی نہ کسی پوشیدہ مقام سے دوسری طرف جھانکتا آیا تھا۔ ایک بار اس نے رک کر اپنے ساتھیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا۔
 ”وہ لوگ یہاں پڑاؤ ڈال رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمیں بھی رک جانا چاہئے۔“
 تعداد میں در ہیں۔“

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر ڈی گاریکا کو مخاطب کر کے بولا۔ ”کیوں نہ ہم رومولی کو ہمیں چھین لیں۔“
 ”مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم صرف چار ہیں۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔
 ”فکر مت کرو۔ ابھی میرے ہاتھ میں ایک ٹرمپ کارڈ موجود ہے۔“
 ”یعنی.....!“

”ڈان الفریدو.....!“ فریدی نے کہا۔ ”حالانکہ اس چہرے کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ میرک اپ میں دشواری پیش آئے گی مگر خیر میں کوشش کرتا ہوں۔“

فریدی اپنے سامان کا تھیلہ لے کر دائیں طرف کی چٹانوں کے نیچے اتر گیا اور پھر ایک گھٹے کے بعد انہوں نے اسے ڈان الفریدو کی شکل میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے شمار خراشیں معلوم ہو رہی تھیں جن میں خون جم کر سیاہی اختیار کر چکا تھا۔ ہونٹ زخمی تھے۔ پیشانی کے درمیان آنکھوں کو قریب قریب ڈھک لیا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ فریدی نے انہیں اپنی زبان دکھائی جو معمول سے زیادہ موٹی نظر آ رہی تھی۔

”میری زبان بھی زخمی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ظاہر ہے ایسی صورت میں ڈان ونسٹ مجھ سے میرے صحیح لہجے اور آواز کی توقع نہ رکھے گا۔“

”تم ایک خطرناک کام کرنے جا رہے ہو۔“ ڈی گاریکا پر تشویش لہجے میں بولا۔
 ”تو میں کھیاں کب مارتا رہا ہوں۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”خیر..... تم لوگ آرام کرو۔“
 ”میں بھی چلتا ہوں۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بڑے بہادر نظر آ رہے ہو۔ جی نہیں تشریف رکھئے۔“ فریدی نے کہا اور اونچی نیچی چٹانیں پھلانگتا دوسری طرف اتر گیا۔ ڈان ونسٹ کے کھپ میں روشنی ہو رہی تھی۔

رسیوں کا پل تھا۔ مگر میں نے کیا دیکھا؟ فریدی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا دیکھا.....؟“ ڈان ونسٹ کے لہجے میں اضطراب تھا۔

”پل والا بڑا درخت دراڑ کے آ پار پڑا تھا اور اس کی رسی دراڑ میں لٹک رہی تھی۔“

ڈان ونسٹ پہلے تو کچھ نہ سمجھا لیکن پھر دفعتاً اچھل پڑا۔ فریدی اس کی طرف دھیان دینے بغیر بولتا رہا۔ ”وہ چیز میرے لئے تائید غیبی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح چڑھتا اور پھسلتا ہوا رسی تک پہنچ گیا۔ اب مجھے اس وقت اچھی طرح یاد نہیں کہ میں رسی کے سہارے کی طرح اوپر پہنچا۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اسی درخت کے سہارے دراڑ کے اس پار آ گئے ہیں۔“ ڈان ونسٹ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تم نے مجھے وائر لیس کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ تمہیں اولیاری کا بھوت دکھائی دیا تھا۔“

”یہ ان کی ایک خطرناک حرکت تھی۔“ فریدی نے کراہ کر کہا۔ ”وہ رومولی کا ساتھی انور تھا۔ انہوں نے اس پر اولیاری کا میک اپ کر دیا تھا۔“

”انور.....!“ رشید بے اختیار چیخی اور پھر ہنس پڑی۔

”خاموش رہو۔“ ڈان ونسٹ نے اسے ڈانٹا۔

”اس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”البرٹو اور اس کا ساتھی؟“ ڈان ونسٹ نے پوچھا۔

”ہاں! لیکن جانتے ہو البرٹو کون ہے؟“

”نہیں۔“

”میں الاوامی شہرت کا مالک انیسٹر فریدی جس نے مصر میں ولین کی مشینی آندھی کا پتہ

لگایا تھا۔“

”غدار..... ڈی گاریکا۔“ ڈان ونسٹ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ”لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”اس کے پاسپورٹ سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن تمہیں اس کی اطلاع نہ دے گا۔“

”کیونکہ انہوں نے میری نگرانی شروع کر دی تھی۔“

رشید نے پھر قہقہہ لگایا اور چیخ کر بولی۔ ”اگر واقعی ان کے ساتھ فریدی بھی ہے تو یہ بچا

کڑھاری موت تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔“

”خاموش رہو۔“ ڈان ونسٹ اسے مکا دکھا کر چیخا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں۔“ فریدی مضطرب آواز میں بولا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

میں آج تک زندہ نہ رہ سکوں گا۔“

”مگ بھلا دو.....!“ ڈان ونسٹ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ساری روشنیاں گل کر دو۔“

تھوڑی دیر بعد وہاں اندھیرا پھیل گیا۔

”ڈان ونسٹ میں تھک گیا ہوں۔ مجھے براغزی چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

”براغزی..... ہمارے پاس صرف دو بوتلیں رہ گئیں ہیں۔ زیادہ پینے کی کوشش نہ کرنا ہم

ب تھکے ہوئے ہیں۔“

ڈان ونسٹ نے اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھما دی۔ فریدی نے تھوڑی سی براغزی

دھیرے میں گرا دی پھر اس کی جیب سے ایک پڑیا نکلی دوسرے لمحے میں پڑیا کا سارا سفوف

بال میں تھا۔

”شکریہ.....!“ فریدی ایسے انداز میں بولا جیسے وہ ابھی تک سانس روکے ہوئے بوتل

میں نہ لگائے رہا ہو اور پھر اس نے ٹول کر بوتل ڈان ونسٹ کو واپس کر دی۔ بوتل ڈان ونسٹ

اس کے ساتھیوں میں گردش کرتی رہی۔ فریدی چھیڑ چھیڑ کر ان سے گفتگو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر

مک وہ بولتے رہے پھر ان کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ فریدی نے دو تین بار ڈان ونسٹ کو زور

از سے پکارا لیکن جواب نہ وارد پھر وہ آہستہ آہستہ ٹوٹتا ہوا رشید کی طرف بڑھنے لگا۔ رشید

بیک پڑی۔

”یہ کیا حرکت؟“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”چپ چپ..... میں ہوں فریدی۔“

”اوہ.....!“ رشید قریب قریب چیخ پڑی۔

”بے وقوف لڑکی خاموش رہو۔“ فریدی نے کہا اور اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چٹانوں سے گزر رہے تھے۔

پھر دوسرا غار کیا اور بھاگا۔

آدمیوں کے بھاگنے کی آوازیں اسے سنائی دی۔ فریدی اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں ڈی گاریکا
دلاشوں کے بیچ میں پڑا تھا۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ فریدی نے آہستہ سے اسے جنبش دی۔

”البرونو.....!“ ڈی گاریکا چلایا۔ ”کیا وہ لوگ بھاگ گئے۔“

”ہاں یہ کیا پاگل پن تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی تم چلے آئے۔“

”مگر یہ بہت بُرا ہوا..... وہ لوگ بچ کر نکل گئے۔ اب ہماری جان کی خیر نہیں۔“

”کوئی پرواہ نہیں۔“ فریدی نے اسے اٹھایا۔ ”تمہیں چوٹ تو نہیں آئی۔“

”نہیں البرونو..... مجھے اولیاری کے انتقام نے اندھا کر دیا تھا۔ جب تم لوگ سو گئے تو میں
اٹا یہ سب بیہوش پڑے تھے۔ میں نے ایک کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ اس کی چیخ سے دوسروں
کی آنکھ کھل گئی۔ جب تک وہ ہوشیار ہوں میں دوسرے کو بھی ختم کر چکا تھا کہ اچانک ان لوگوں
نے مجھے پکڑ لیا۔ میں بے قابو ہو گیا مگر تعجب ہے البرونو ان میں کسی کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ

تھا۔“

فریدی اور ڈی گاریکا جب پہنچے تو انور اور حمید وغیرہ جاگ چکے تھے۔ رمونا کا چہرہ زرد ہو
رہا تھا۔ ڈی گاریکا کو دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔

”البرونو تم بہت اچھے ہو۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

”میرے متعلق کیا خیال ہے۔“ حمید نے دخل دیا۔

رمونا نے اسے گھور کر دیکھا۔ حمید نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔

”سب لوگ تیاری میں مصروف ہو گئے اور سورج نکلنے نکلنے یہ چھوٹا سا قافلہ سنگاخ
ہٹانوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

متواتر دو دن تک سفر جاری رہا۔ اس دوران میں کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا۔ آہستہ

آہستہ جنگلوں اور پہاڑوں کے آثار ختم ہوتے جا رہے تھے۔ ڈی گاریکا کی تجویز پر ایک جگہ رک
کر فریدی، حمید اور انور نے اپنی شکلیں تبدیل کر لیں۔ انور ڈی گاریکا کے لڑکے اولیاری کی شکل
لے لیا۔ فریدی اور حمید نے ڈی گاریکا کی دی ہوئی دو تصاویر کے مطابق میک اپ کیا تھا۔ ڈی

”ڈی گاریکا اور اس کی لڑکی کو میری اصلیت نہ معلوم ہونے پائے۔“ فریدی نے کہا۔
”مجھے صرف البرونو سمجھتے ہیں۔“

ڈی گاریکا وغیرہ رشیدہ کو دیکھ کر اچھل پڑے۔ رشیدہ انور کے شانے سے لگی ہوئی تھی
طرح رور ہی تھی۔

”تم بھی کبھی اس طرح روئی ہو۔“ حمید نے آہستہ سے رمونا سے پوچھا۔

”میں کیوں روتی۔“

”البرونو میں کس طرح تمہارا شکر یہ ادا کروں۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”بعد کی باتیں ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”صبح ہمیں ڈان ونسٹ سے سمجھتا ہے۔“

”کیوں نہ انہیں اسی وقت ٹھکانے لگا دیا جائے۔“ رمونا نے کہا۔

”یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں نیند یا بیہوشی میں کسی کو مارنے کا قائل نہیں۔“

”اور اگر وہ رات ہی کو نکل گئے تو۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”صبح سے پہلے ان کی آنکھ کھلی محال ہے۔“ فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

”لیکن ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ رات میں باری باری سے ہم پہرہ دیتے رہیں گے۔“

ڈی گاریکا نے کہا۔

رات کی تاریکی بڑھی جا رہی تھی۔ سب لوگ سو گئے۔ سوتے میں اچانک فریدی کی آنکھ کھل

گئی۔ حمید رمونا اور انور کے بیچ میں رشیدہ سو رہی تھی۔ لیکن ڈی گاریکا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ فریدی کا

ماتھا ٹھنکا۔ وہ تیزی سے چٹانوں پر چڑھنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ یکایک اسے ایک بچا

سنائی دی۔ فریدی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ آواز کی طرف جھپٹا پھر دوسری چیخ سنائی دی

پھر تیسری اور ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ وہ جگہ جہاں اس نے ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھیوں کو

چھوڑا تھا دکھائی دے رہی تھی۔

”وہ حماقت کر رہی بیٹھا۔“ فریدی بڑبڑایا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون

اتر آیا۔ ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھیوں نے ڈی گاریکا کو جکڑ رکھا تھا۔ ڈان ونسٹ پوری قوت

سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ فریدی نے رائفل چھپتائی ”دھائیں“ چٹانیں گونج اٹھیں۔ فریدی نے

ایک عجیب بات دکھائی دی کہ ساری عمارتیں سبز رنگ سے رنگی ہوئی تھیں اور عمارتوں کی چھتوں پر پودے اور جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ انہیں کوئی ایسی عمارت نظر نہ آئی جس کی چھت پر چھوٹے پھول درخت نہ دکھائی دیتے رہے ہوں۔ ڈی گاریکا حمید اور انور کی حیرت پر ہنسا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس جزیرے پر پرواز کرنے والے غیر ملکی ہوائی جہاز سے محفوظ رہنے کے لئے تم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔“

”لیکن بعض بدقسمت ہوائی جہاز“ ڈی گاریکا نے ہنس کر کہا۔ ”جن کی پرواز نیچی ہوتی ہے اور گرائے جاتے ہیں تم نے اکثر اپنی طرف کے اخبارات میں اس قسم کی خبریں پڑھی ہوں گی کہ فلاں طیارہ بحر اٹلانٹک اور بحر کرپین کے درمیان پرواز کرتا ہوا پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ وہ پراسرار طریقہ ہماری نیارہ شکن بندوٹوں کا پین منت ہے۔“

”بہت خوب.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میرا دل چاہتا ہے کہ بقیہ زندگی اسی پراسرار جزیرے میں گزار دوں۔“

”جج.....!“ رمونا پر مسرت لہجے میں چینی۔

”قطعی.....!“ فریدی سنجیدگی سے بولا اور حمید کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”اگر ایسا ہو سکے تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ غیر ملکی یہاں رہ سکتے ہی نہیں؟ آخر کب تک اس حالت میں رہوں گا۔“ فریدی نے پوچھا۔ ڈی گاریکا گڑبڑا گیا۔

”البرونو ہمارے یہاں اگر فاناگن اور مقدس باپ مل کر کوئی حکم دے دیں تو اسے سب مان لیتے ہیں۔“ ڈی گاریکا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

صبح کے ہلکے ہلکے پھلتے ہوئے دھندلکے میں وہ شہر کے غیر آباد حصہ سے گزرتے رہے۔ ڈی گاریکا کی اسکیم کے مطابق ان لوگوں کو سب سے پہلے مقدس باپ کے حضور میں حاضر ہونا تھا۔

صبح ہو چکی تھی اور شہر سے باہر نکل کر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں یہ قافلہ پہنچ چکا تھا۔ پہاڑی کے نشیب میں چٹانوں سے ڈھکا ہوا ایک قلعہ دکھائی دے رہا تھا لال لال فیتے لگائے ہوئے۔ سپاہیوں کی دو روہیہ قطار پہرہ پر تھی۔ اس قافلہ کو آتے دیکھ کر انہوں نے اپنی

گاریکا نے انہیں بتایا کہ شہر میں داخلے کے وقت باہر سے آنے والوں کے متعلق کافی چھان بین کی جاتی ہے۔

”مجھے خوف ہے کہ کہیں ڈان ونسٹ نے شاہی محکمہ سراخ رسائی کو اپنی آمد سے مطلع نہ کر دیا ہو۔“ ڈی گاریکا نے کہا۔

”کس طرح.....!“ فریدی نے پوچھا۔

”وائریس کے ذریعہ۔“

”وائریس.....!“

”ہاں..... تم کیا سمجھتے ہو۔ ہم لوگ کافی ترقی یافتہ ہیں۔ اس معاملے میں کسی یورپین ملک سے پیچھے نہیں۔“

”خبر کہاں سے بھیجی ہوگی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میکسیکو کی بندرگاہ ویراکروز سے۔“

”لیکن کیا یہ چیز خطرناک نہیں۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”تمہارے پیغامات دوسرے بھی سن سکتے ہیں۔“

”یہی تو خاص بات ہے۔“ ڈی گاریکا نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمارے ٹرانس میٹر سب سے الگ تھلگ ہیں۔ ہمارے ٹرانسمیٹر پر نشر کئے ہوئے پیغامات صرف ہماری ہی ریسیونگ مشینوں پر سنے جاسکتے ہیں۔“

”تو پھر اب کیا کہتے ہو۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”ہم ایک خفیہ راستے سے شہر میں داخل ہوں گے۔“ ڈی گاریکا نے کہا ”اور ایسی صورت میں انور کے لئے اولیاری کا میک اپ مندوش ہے۔ خود مجھے اور رمونا کو بھی اپنے حلقے تبدیل کرنے پڑیں گے۔“

دوسری اسکیم کے مطابق انہوں نے احتیاطی تدابیر کرنے کے بعد راستہ بدل دیا۔ اس طرح انہیں چھتیں گھنٹے تک اور سفر جاری رکھنا پڑا اور جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو فریدی وغیرہ کی آنکھیں کھلی گئیں۔ چاروں طرف بڑی عالیشان عمارتوں کا جال سا بکھرا ہوا تھا۔ لیکن انہیں

نہ دور سے فریدی نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی جھلک رہی تھی۔ فریدی نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ یہ شخص ڈان ولسٹ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

خونناک جنگ

فوج سامنے آ کر رک گئی۔ مقدس باپ وہیں سے چلایا۔
”فہرہ۔“

لبے لبے قدم بڑھاتا ہوا صفوں کے بیچ سے گزر کر وہ فاگان کے سامنے پہنچا۔
فریدی نے حیرت سے دیکھا کہ فاگان کے سپاہی بھی اسے دیکھ کر تعظیماً جھک گئے۔
”کیا چاہتے ہو۔“

”آپ کے پاس جو آدمی آئے ہیں یہ سب غدار اور بدیسی ہیں۔“
فاگان کے ساتھی ایک ساتھ چلائے۔

”یانا تا کی چوٹی پر ڈی گاریکا کو پھانسی دو۔“
مجموعیہ ہی خاموش ہوا مقدس باپ نے کہا۔

”انہیں سے کوئی بدیسی نہیں۔ یہ لوگ سی نورا رومولی کیساتھ آئے ہیں۔ سی نورا رومولی جو بلیہ ہے۔ مگر تمہیں یقین نہیں ہے تو اس کا نشان دیکھو لو۔“ مقدس باپ کی آواز گونجی۔ انہوں نے ہر طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ نے جلدی سے کپڑے ہٹانے شروع کئے۔ مقدس باپ وہاں سی نورا رشیدہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلا۔ ابھی وہ اپنی فوجوں ہی کے درمیان تھا۔

”دھائیں۔۔۔۔۔!“ ایک گولی سرسراتی ہوئی رشیدہ کے کان کے پاس سے نکل گئی اور جب لہو افراز ہو، فریدی نے فائر کیا اور ڈان ولسٹ کا پستول زمین پر تھا دوسری طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ مقدس باپ نے رشیدہ کی طرف دیکھا۔ دونوں نے اشارہ کیا اور ادھر سپاہیوں نے بھی جوابی حملہ شروع کیا۔

رافٹلیں اٹھائیں۔ ڈی گاریکا نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ فریدی اور انور وغیرہ نے اس کی تھلید کی۔ سپاہیوں کے پاس پہنچتے ہی رشیدہ نے بایاں بازو کھولا اور سپاہیوں کے بیچ میں کڑی ہو گئی۔ مکاتان کر اس نے اپنا بازو لہرایا۔

”سی نورا۔۔۔۔۔!“ ایک ان میں سے حیرت سے چیخا اور وہ سب رشیدہ کے گرد آ کر کمرے ہو گئے۔ اس کے بازو پر پڑا ہوا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”فاگان یہ زندہ باد۔۔۔۔۔!“

”سی نورا رومولی زندہ باد۔“

سپاہیوں نے نعرے لگائے اور اپنی سنگینیں جھکا دیں۔

مقدس باپ نعروں کی آواز سن کر باہر نکل آئے تھے۔ فریدی نے دیکھا ایک لمبا ترنگ ہڈا آدمی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی خوبصورت سفید ڈاڑھی اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نے فریدی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آدمی ہوشیار ہے۔

ڈی گاریکا اسے دیکھ کر جھکا۔ احتراماً اس نے مقدس باپ کی عبا کو بوسہ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ رشیدہ کو دیکھ کر اس نے تعظیماً سر ہلایا اور اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اچانک نقاروں کی آواز سنائی دی۔ فریدی چونک پڑا۔ ڈی گاریکا کے چہرے پر ہوا بنا چھوٹنے لگیں۔ نقاروں کی آواز تیز ہوتی گئی۔ مقدس باپ نے مڑ کر ڈی گاریکا کی طرف دیکھا۔
”فاگان۔۔۔۔۔ مگر وہ کس سے لڑے گا۔“

دیکھتے دیکھتے سامنے کا میدان گردوغبار سے اٹ گیا۔ مقدس باپ نے اشارہ کیا اور ایک سپاہی نے پاس پڑے ہوئے نقارہ کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں سپاہیوں کی قطار نکلتے لگی۔

سامنے کا غبار چھٹ گیا تھا۔ اڑتے ہوئے سبز پھریرے نقارے بجاتے ہوئے فوج آ رہی تھی۔ ان کی سنگینوں کی انیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ آگے آگے ایک شخص تنگی کمر ہوا ہوئے تھا جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ غالباً یہ اعلان جنگ تھا۔ سپاہیوں کے میں ایک شخص کے سر پر چاندی کا چھتر لگا ہوا تھا۔ غالباً یہ فاگان تھا اور اسی کے ساتھ ایک شخص

فریدی تھوڑی دیر تک تو حمید وغیرہ سے باتیں کرتا رہا پھر چپکے سے نکل گیا۔ حمید وغیرہ پہلے
 نہ سمجھ سکتے تھے لیکن جب فریدی کی واپسی میں دیر ہوئی تو ان کی تشویش بڑھ گئی۔
 ”آ خر کہاں چلے گئے؟“ رشیدہ بولی۔

”اب یہ سب کچھ مت پوچھو۔“ حمید طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”آخر انہیں تمہاری تاجپوشی کا بھی
 انتظام کرنا ہے۔“

”ملکہ عالم.....!“ انور سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ نالائق ٹھیک کہتا ہے۔“

”اے انور میں چائنا مار دوں گی۔“ رشیدہ جھلا کر بولی۔

”ضرور ضرور..... حضور عالی۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بدتمیز اسی لائق ہے۔“

”حمید صاحب مہربانی کر کے.....“ رشیدہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ابجی ہم صاحب صاحب کہاں، ہم تو خاصے گدھے ہیں۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔ ”فریدی
 صاحب کے ابد و گھوڑے صاحب ہیں۔“

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر جھنجھلا کر کہنے لگا۔ ”فریدی صاحب کو تو خیر قتل ہونا ہی ہے۔
 نہ ہوئے تو خیر کل ہی ہو جائیں گے..... ارے میں..... ارے میری کم بختی کیوں آتی رہتی
 ہے بھی۔ ارے کوئی بتانا بھی..... ارے! ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا کوئی آواز دینا میری طرف سے
 سے بھائی کوئی ہے۔“

حمید اچھل اچھل کر اول فول بک رہا تھا۔ جیسے اچانک دماغ خراب ہو گیا ہے۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا تھا۔“ انور اس کا گریبان پکڑ کر بولا۔ ”مگر اب شاید تمہاری
 امت آئی گئی ہے۔“

”بس بس بکواس مت کرو۔“ حمید نے بگڑ کر کہا۔ ”سب کچھ تم دونوں کی بدولت ہوا۔
 بے غضب خدا کا کہاں یہ منحوس جزیرہ اور کہاں میں۔ ارے کم بخت اتنا تو سوچو کہ ابھی تک
 راکشادی نہیں ہوئی۔ اگر میں یہاں مارا گیا تو میرا بوڑھا باپ گھل گھل کر جوان ہو جائے گا۔
 مجھے شہناز کی یاد مری طرح ستا رہی ہے۔ مگر نہیں تو بہ لال حول ولا قوت..... آج کل کی لڑکیاں
 مل اعتماد نہیں۔ اگر وہ بھی کسی جزیرے کی شہزادی نکل پڑی تو اپنا تو.....!“

دوپہر ہو چکی تھی۔ لڑائی بڑے زور شور سے جاری تھی۔ ڈان و سنٹ اور فانا گان کے راتھی
 تعداد میں زیادہ تھے مگر ادھر لوگ بھی بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے۔ ڈی گاریکا نے حمید، فریدی،
 رشیدہ اور انور کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا۔

لڑائی کا منظر بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ زمین خون سے رنگ گئی تھی۔ فریدی ڈی گاریکا کے
 جانے کے بعد وہاں سے نکلا۔ قلعہ کی ایک چھوٹی سی فصیل پر بیٹھ کر..... نے جنگ کی حالت دیکھ
 شروع کی۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے میں غٹ پٹ ہو گئی تھیں۔ تعداد میں کم ہونے کی بناء پر
 محسوس کر رہا تھا کہ اب پادری کے ساتھی پیچھے ہٹ رہے ہیں اسے اپنی پشت پر کسی کا ہاتھ نہیں
 ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

”البرو! ہم لڑائی ہار گئے۔“ ڈی گاریکا کے لہجے میں اداسی تھی۔

”مگر یہ ایک دم لڑائی کیسے چھڑ گئی۔“

”مقدس باپ اور فانا گان میں بہت دنوں سے ان بن تھی اور دونوں اپنی طرف سے لڑائی
 میں مصروف تھے۔ ذرا سے موقع کی دیر تھی سودہ ہاتھ آ گیا۔“

فریدی خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی نظریں سامنے والے میدان پر تھیں۔ سورج ڈوب رہا
 تھا اور شام کی پھیلتی سرگئیں دھندلاہٹوں میں اس کے ساتھی بھاگ رہے تھے۔ ڈان و سنٹ اور
 فانا گان کے ساتھی فصیل کے نیچے تک پہنچ گئے تھے۔ غبار سے اٹے ہوئے میدان میں ہزار ہا لاشیں
 دکھائی دے رہی تھیں۔ فریدی کانپ اٹھا۔ اتنا انسانی خون بلا وجہ بہایا گیا؟

”اب کیا ہوگا..... البرو! اب کیا ہوگا۔“ ڈی گاریکا کے لہجے میں بدحواسی تھی۔ ”تم آلو“

کے ذمہ دار ہو..... تم.....؟“ وہ اچانک فریدی کے اوپر چلانے لگا۔

”نہ تم ڈان و سنٹ کو چھوڑتے اور نہ آج ہم کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔“ وہ رو پڑا۔

”حوصلہ رکھو ڈی گاریکا۔“ فریدی نے اسے اٹھایا۔

دونوں اپنے کمرے کی طرف لوٹ آئے۔

قلعہ بند کروادیا گیا۔ چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا تھا۔

حمید تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رشید ہنسی کے مارے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

”اب چپ بھی رہو۔ یہاں جان پر بنی ہے اور تمہیں یہ لغویت سوچھ رہی ہے۔“ انور ان

کر بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ رشید ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ”آخر فریدی صاحب کی اسے

غیر سنجیدہ آدمی سے کیسے بنتی ہے۔“

”تم اسے غیر سنجیدہ سمجھتی ہو۔“ انور نے کہا۔ ”ارے باپ رے باپ۔۔۔ اتنا بھیاں

آدمی میری نظر سے گزرا ہی نہیں۔ یہ ہنسی ہنسی میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو بڑے بڑے بخیر

ہو کر بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کم بخت بیوقوف بن کر بیوقوف بناتا ہے۔“

”ہے آدمی پر مذاق، مگر حضرت گئے کہاں۔“ رشید اٹھتے ہوئے بولی۔

آدھی رات سے زائد گزر چکی تھی۔ دن بھر کی دھائیں دھائیں کے بعد اس وقت نفا

پر سکون تھی جیسے طوفان آ کر ختم کیا ہو۔ فریدی کا اب تک کہیں پتہ نہ تھا۔ رشید دروازے کے

قریب جا کر رک گئی۔ سامنے ہی ڈی گاریکا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

”البرؤو کہاں ہے؟“

”ابھی تک نہیں آیا۔“

”اچھا میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔ تمہیں مقدس باپ یاد کر رہے ہیں۔“

رشید ڈی گاریکا کے ہمراہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ایک بڑے سے ہال میں پادری تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اونچے اونچے لمبے فانوس میں کانوری

شمعیں جل رہی تھیں۔ صلیب کا ایک بڑا سا نشان کمرے کے اندر ماں مریم کی تصویر کے اوپر

ہوا تھا۔ پادری کافی متشکر نظر آ رہا تھا۔

”سی نورادو مولی۔۔۔۔۔ مجھے اپنی جان کا ڈر نہیں مگر یہ ہزاروں آدمی مفت مارے جائیں

گے۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

رشید خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”میرے پاس ڈان ونسٹ کا آدمی خط لے کر آیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ فاگان میری ساری

رہیں ماننے کو تیار ہے صرف مجھے ڈی گاریکا اور اس کے ساتھیوں کو تمہارے سمیت اس کے

جائے کر دینا ہوگا۔ میرے خیال میں تم لوگ بھاگ جاؤ۔“ مقدس باپ کہتا رہا۔ رشید کو یہاں

کے تاج تخت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو محض فریدی کی وجہ سے چلی آئی تھی۔ فریدی کیوں آیا

ہا؟ وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ مگر پھر بھی اسے شبہ تھا کہ کوئی ایسی وجہ ضرور ہے جس کی بناء پر فریدی

رہا رہا تھا۔

”مگر ہم اب جا بھی کیسے سکتے ہیں۔ راستہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔“ رشید کچھ

ٹپکتے ہوئے بولی۔

”یہ میرا مذہ۔“ پادری نے تالی بجائی۔ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔

”سی نورادو قلعہ کے باہر لے جاؤ۔“

رشید ابھی چند قدم آگے بڑھی تھی کہ وہ آدمی ٹٹکے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ جھکائے اور

لے قدموں واپس چلے گئے۔ پادری کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”نمک حرام۔۔۔۔۔!“ وہ چلایا۔

”ڈی گاریکا۔۔۔۔۔!“ وہ چیخا۔

جیسے ہی ڈی گاریکا اندر داخل ہوا وہ برس پڑا۔

”کتے۔۔۔۔۔ میں تجھے جلا ڈالوں گا۔ تو میرے خلاف بھڑکاتا ہے۔ سی نورادو واپس جائے

لو اور تو بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ تم سبھوں کو اندھا کر کے نکال دیا جائے گا۔ تاکہ تم پھر یہاں نہ

آؤ۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ڈی گاریکا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”رحم۔۔۔۔۔ مقدس باپ۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”میں نے جو کچھ

کیا وہ آپ ہی کے اشارے پر کیا۔ مجھے مزاحمت دیجئے۔ آپ جو کچھ کہیں گے وہی ہوگا۔“

”صح چار بجے تمہیں تانے کی کان والے راستے سے باہر نکال دیا جائے گا۔“

”اوہ خدا۔۔۔۔۔!“ وہ چیخا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

رشید کی قوت فکر جواب دے رہی تھی۔ وہ سیدھی انور کے پاس پہنچی۔ دروازے میں داخل

چارج کر ۵۳ منٹ پر عمارت اڑا دی جائے گی۔ یعنی اب سے صرف ایک گھنٹہ بعد.....
 مینی صاحب کو کان میں گرتے ہوئے ایک سپاہی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور تم جانتی
 کہ کان آگ اور لاوے کی ایک بھیٹی ہے۔“
 ”آہ.....!“ وہ غد حال ہو کر گر پڑا۔

اچانک رات کا سناٹا دھائیں دھائیں کی ہیبت ناک آوازوں سے ٹوٹ گیا۔
 ساری فضا چنگاریوں اور شعلوں سے سرخ ہو گئی۔ آسمان میں سرخ سرخ بڑے بڑے
 رے روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے۔ زمین دہل اٹھی اور چٹانیں اس طرح ٹوٹ کر رہ
 جیسی شیشے کے ٹکڑے جھنجھٹا جاتے ہیں۔ شور بڑھتا گیا۔ آسمان پر دیوتا ننگے ہو کر تاند و تاج
 پہتے اور رات کی دیوی کے جڑوں سے خون بہہ نکلتا تھا۔ زمین جل اٹھی تھی۔ ماحول لرز کر رہ
 اٹھا۔ ہیبت ناک، مہیب اور بھیانک جزیرہ دھماکوں سے کانپ رہا تھا۔

فریدی کا قتل

فریدی جب باہر نکلا تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حالات نے
 بڑی طرح شکستہ میں کس لیا ہے۔ ابھی تک اس کا سابقہ آدمیوں سے پڑتا رہا تھا مگر یہاں تو
 پوری حکومت سے لڑائی کا سوال تھا؟ محض اپنے اصول کی خاطر اس نے ڈان و سنٹ کو زندہ
 ڈالیا تھا ورنہ یہ ہنگامہ نہ ہوتا۔ فریدی کو اپنے اوپر جھلاہٹ محسوس ہوئی۔ کاش وہ رشیدہ کو پاتے
 لیں چلا جاتا۔ اس نے سوچا، مگر بار بار یہی خیال اس کے دل میں چٹکیاں لیتا رہتا کہ آخر وہ
 ناک کی چیز ہے جس کی بناء پر یہاں کے باشندے دوسری دنیا سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے
 ہیں۔ اس پر اسرار جزیرے کے بارے میں جاننے کا شوق اسے کھینچ لایا تھا۔ لیکن اتنے
 نکل کا خون دیکھ کر وہ دہل اٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہر ممکن قیمت پر آج ہی کی رات میں
 ایک کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔

ہوتے ہوئے اس نے دیکھا۔ انور بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ رشیدہ کو دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھا۔
 ”دھوکا رشو! بڑا زبردست دھوکا۔ اب ہم نہیں بچ سکتے۔ پادری روپیہ اور اقتدار کے لالچ
 میں آ کر فگان سے مل گیا۔ اب کوئی دم میں ہم لوگ مار ڈالے جائیں گے۔“
 چشم زدن میں رشیدہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ پادری فگان سے ساز باز کر رہا تھا مگر
 اپنے سپاہیوں کے ڈر کی وجہ سے کھلم کھلا اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے
 اس نے یہ کھیل کھیلا۔

”مگر تم سے یہ کس نے بتایا۔“ رشیدہ نے پوچھا۔
 ”رمونانے۔“

”فریدی صاحب آئے۔“
 ”نہیں..... کم بخت حمید کا بھی پتہ نہیں ہے۔“
 ”رشو ڈارلنگ.....“ اور رشیدہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”مرنے سے پہلے میں ایک بار..... تم سے کہہ دینا ہی چاہتا ہوں کہ..... مجھے تم سے.....“
 ”کہتے کیوں نہیں بیٹا کہ محبت تھی اور اب اس وقت نہ کہو گے تو کب کہو گے۔“ پیچھے سے
 آواز آئی۔ رشیدہ اور انور دونوں نے چونک کر دیکھا۔ حمید کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا
 سارا چہرہ کچھڑ میں لت پت تھا کئی جگہ سے پٹی ہوئی قمیض سے خون رس رہا تھا۔ اس کے چہرے
 پر بے پناہ اداسی تھی۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ دھڑام سے کرسی پر آگرا اور نے
 پہلی بار حمید کو اتنا اداس دیکھا تھا۔

”یہ کیا ہوا.....؟“ دونوں نے بیک وقت پوچھا۔
 ”انور..... غالباً میں نہیں کہہ سکتا..... میں یقین ہی نہیں کر سکتا..... مگر مگر.....!“
 ”ارے کہو گے بھی.....!“

”خدا خواستہ فریدی صاحب شاید اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“
 ”آئیں.....!“

”ہاں انہیں تاجے کی کان میں دھکیل دیا گیا اور اس قلعے کے نیچے ڈائنامیٹ لگا دیا گیا“

فصیل کے کنارے سپاہیوں کا زبردست پہرہ تھا۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا۔ قلعہ کے چاروں طرف چکر لگا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ سامنے میدان میں سبز بتیاں روشن تھیں اور فصیل کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ ذرا ہی سے فاصلے پر پہاڑوں کی بلندی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی یہ حصہ قدرے محفوظ سمجھ کر فاصلہ انداز کر دیا گیا تھا۔ پہاڑی اور ندی سے گھرا ہونے کی بناء پر اس طرف حملہ کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ایک پراسرار سایہ اسے حرکت کرتا معلوم ہوا۔ وہ چونک پڑا۔ سایہ دھیرے دھیرے فصیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنے کو ایک کنگورے کے آڑ میں چھپا لیا۔ سایہ اسی کے قریب آ کر رک گیا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد اس نے اپنی کمر سے رسی کھولی اور فصیل کے نیچے لٹکا دیا اور پھر خود آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ فریدی بڑی غور سے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ پانی میں پہنچے ہی اس نے اپنے قدم لٹکا دیئے اور دوسرے ہی لمحے میں وہ ایک جھلانگ میں ندی کے اس پار فاماگان کی فوجوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فریدی اسے دیکھتا رہا۔ جب اسے باطمینان ہو گیا کہ وہ کافی آگے جا چکا ہے تو اس نے بھی فصیل سے اترنا شروع کیا۔ ندی میں آدھے فٹ پانی کے نیچے ایک بہت بڑی چٹان تھی۔ فریدی نے اپنے قدم جمادئیے۔ ندی کا لہر گہری تھی اور پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ لیکن چوڑائی کم ہونے کی بناء پر اسے اس پار پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے اندھیرے میں وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ مابہ اس سے کافی دور نکل گیا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر خیموں کی قطاروں کے گرد روشنی میں اور پہرے دار دکھائی دے رہے تھے۔ فریدی رک گیا۔ آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ فوراً پیچھے کی طرف مڑا۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے حرکت شروع کی۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ اس نے ٹٹلا۔ فاماگان کی فوج کے ایک سپاہی کی لاش تھی۔ لال وردی اور ہرے فیتے سے اس نے فوراً پہچان لیا۔ اچانک اسے پہتا کر اس نے سپاہی کی وردی خود چمن لی اور اطمینان سے آگے بڑھا۔ پہرے دار چاروں طرف ٹہل رہے تھے۔ روشنی کی تیز شعاعیں چاروں طرف پڑ رہی تھیں۔ ان سے بچا ہوا وہ ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ باوجود پہاڑی علاقہ ہونے کے اسے یہ جگہ کافی گرم محسوس ہوئی۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زمین کے نیچے کھولتے ہوئے پانی کا سمندر

جس مار رہا ہو۔ اس عجیب طریقے کی بھیانک سرسراہٹ سے تھوڑی دیر کے لئے فریدی جیسا بیمار انسان بھی سہم گیا۔ ٹیلے کی آڑ لیتے ہوئے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر سپاہی رہ گئے تھے۔ خیمہ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ خیمہ کے اوپر ایک بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جس پر ایک رچیچہ کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اچانک خیمہ کا پردہ اٹھا اور ایک آدمی باہر نکلا۔ فریدی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے اس نے قلعہ کی فصیل کی طرف حرکت کرتے دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا واپس قلعہ کی طرف جا رہا تھا۔ خیمہ کا پردہ پھر اٹھا تھا اس بار دو آدمی ایک ساتھ باہر نکلے۔ فریدی چونک اٹھا۔ ان میں ایک ڈان وسمٹ تھا۔ اس نے اپنے انہوں میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ بہت سے آدمی آگئے۔ ان سب کا رخ قلعہ کی طرف تھا۔ ٹیلے سے کچھ دور آگے جب یہ لوگ نکل گئے تو فریدی بھی ان ہی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ فصیل سے صرف تھوڑے ہی فاصلے پر وہ رک گئے۔ فریدی اب ان کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

”سوہارنے دن ہی میں سب کام ختم کر لیا تھا۔“ ڈان وسمٹ نے کہا۔ ”اس وقت وہ خبر اپنے آیا تھا کہ قلعہ کے نیچے بارود بچھا دی گئی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ سوچ مجھ میں پر لگا دیا جائے۔“

”نہیں..... ٹھہرو شاید مقدس باپ کو عقل آ جائے اور وہ ان سب کو ہمارے حوالے کر دے۔ پھر اس کا کیا فائدہ ہوگا۔“ ڈان وسمٹ نے کہا۔

”اس نے ہمیں کب تک وقت دیا ہے۔“ پہلا آدمی بولا۔

”چار بج کر ۵۳ منٹ کا۔“

”تو ٹھیک تو ہے۔ چار بج کر پچپن منٹ پر سوچ لگا دو۔ فاماگان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

پہلا آدمی پھر بولا۔ ”اس کا بورڈ میرے خیمے میں رہے گا۔ پادری کا آدمی وہیں آئے گا اور اس سے فیصلہ کرنے کے بعد میں سوچ آن کر دوں گا۔ سوچ لگانے کے بعد وہیں پر ایک دستہ تعینات کر دیا گیا۔ فریدی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صرف دو گھنٹے کے اندر پتا تو اس کے ساتھی مار ڈالے جائیں گے یا پھر انہیں فاماگان کے حوالے کر دیا جائے گا اور یقیناً وہ کسی بھی صورت میں اسے زندہ

بروٹنی میں بھی اس کا چہرہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔

”کون ہو تم.....؟“ پستول کا رخ فریدی کی طرف کرتے ہوئے وہ گرجا۔

فریدی خاموش رہا۔

”کون ہو تم بتاتے کیوں نہیں..... کیا کرنے آئے تھے؟“ فریدی کا ہاتھ پکڑ کر اس نے ہلایا۔

”اوہ..... البرونو.....!“ ڈان ونسٹ ہاتھ دیکھتے ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم سمجھتے رہے ہو گے کہ میں اس وردی اور میک اپ کی وجہ سے نہ پہچان سکوں گا۔ میں کی خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہوں اور تلوار کے مقابلہ کے روز سے یہ ہاتھ مجھے ہمیشہ سے یاد

کیوں آئے تھے یہاں؟“

فریدی خاموش رہا۔

”اچھا لو! اب تم مرجاؤ..... شاباش..... مگر دیکھو ہنستے ہوئے مرنا۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت ت ہے جو مرتے وقت بھی گڑگڑانے لگیں۔“ ڈان ونسٹ نے تلخی سے کہا اور ٹیگر دبا دیا۔

فریدی زور سے اچھلا اور چشم زدن میں وہ ڈان ونسٹ کے اوپر تھا۔ اس کا پستول گر چکا۔ وہ پھر بورڈ کی طرف لپکا مگر فائر کی آواز سن کر سپاہی خیمہ کے پیچھے حصہ کی طرف سے داخل پکے تھے۔ گولیاں چلنے لگیں تھیں۔ فریدی نے سامنے کے دروازے کی طرف رخ کیا وردی

اس نے کافی فائدہ اٹھایا اور دھکا دیتے ہوئے وہ باہر نکل آیا۔ مگر چاروں طرف سے سیٹیاں لگی تھیں اور ڈان ونسٹ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ برابر پیچھے دوڑتا آ رہا تھا۔ فریدی نے اور تیز لٹا شروع کیا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا جیسے زمین کے نیچے کوہ آتش نشاں پھٹ پڑا ہو۔ اس کو بے جلنے لگے تھے۔ وہ رک گیا۔ ڈان ونسٹ اور اس کے ساتھی گولی چلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ سامنے ایک بہت بڑے غار کا دہانہ سادکھائی دیا۔ ایک گولی سرسراتی ہوئی اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ فریدی نے جوابی فائر کیا اور غار کی طرف نظر ڈالی۔ گرمی اور ماسے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ سامنے غار ایک بھٹی کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا جیسے اس بھٹی کے اندر کچھ پک رہا ہو۔ کھد بکھد بد کی پر شور آواز سارے ماحول پر حاوی تھی۔ بطریق کی بدبودار بھاپ نکل رہی تھی۔ فریدی کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اب

نہ چھوڑے گا۔ فوراً وہ آگے بڑھا اور چٹانوں کی آڑ میں قلعہ کی طرف بچوں کے بل بھاگا۔ ایک ایک منٹ بڑا قیمتی تھا۔ تھوڑی دیر تک دوڑتے کے بعد وہ ٹھہر گیا۔ ناگان کی فوجوں کا پڑاؤ کافی دور رہ گیا تھا۔ دھندلی دھندلی سبز روشنی بھللا رہی تھی اور پادری کی فوجوں کا سرخ نشان روشنی میں جھلک رہا تھا۔ یکایک فریدی کو کسی کی چاپ سٹائی دی۔ وہ فوراً بیٹھ گیا۔ پادری کی فوج کا ایک سپاہی غالباً گشت میں ادھر آ رہا تھا۔ فریدی لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ سپاہی نے فوراً رائفل اٹھائی۔ فریدی نے ایک جھٹکا دیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی وہ اسے گھور رہا تھا جیسے پہچان رہا ہو۔

”میرا نام..... تم نے مجھے سی نورا اور ڈی گاریکا کے ساتھ دیکھا ہوگا اور اگر نہ بھی دیکھا ہو تب بھی یقین کرو کہ میں دوست ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”سپاہی اسے بدستور دیکھ رہا تھا۔ فریدی نے پھر کہا۔“ مجھے اس طرح نہ دیکھو..... تم فوراً جاؤ اور ڈی گاریکا سے کہہ دو کہ پورے کا پورا قلعہ خطرے میں ہے۔ سوسارا نے قلعہ کے نیچے سرنگیں بچھا دی ہیں اسلئے سرنگیں صاف کرنا شروع کر دو۔ جلدی جاؤ اور ابھی حملہ کر دو۔ ڈی گاریکا سے کہہ دینا کہ یہ البرونو نے کہا تھا۔“

فریدی نے دھکا دیتے ہوئے سپاہی سے کہا۔

”سی نورا.....!“ سپاہی چیخا اور تیزی سے قلعہ کی طرف بھاگا۔

فریدی پھر واپس مڑا۔ خطرہ جوں کا توں سر پر تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اتنے کم عرصے میں نہ تو سرنگیں صاف کی جاسکتی ہیں اور نہ لوگ بھاگ سکتے ہیں۔ وہ پھر اسی جگہ پر آ گیا۔ سپاہیوں کا دستہ اسی طرح اپنی جگہ پر موجود تھا۔ ان سے لڑنا بھی بے سود تھا۔ اس لئے کہ بہر حال دو چار کو ختم کر دینے کے بعد بھی وہ قلعہ کو نہ بچا سکتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے ڈان ونسٹ کے خیمے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ خیمے کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ جیب سے چاقو نکال کر اس نے خیمہ کا پردہ پھاڑ دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ خیمہ کے اندر کوئی نہیں تھا۔ ڈان ونسٹ شاید کہیں باہر چلا گیا تھا۔ فریدی نے چاروں طرف سوچ کا مین بورڈ تلاش کرنا شروع کیا۔ میز پر پڑے ہوئے ایک ڈبے پر نظر پڑتے ہی فریدی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ بڑھا اٹھا۔ کسی نے زور سے دھکا دیا اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی لڑکھڑا گیا۔ سامنے ڈان ونسٹ کھڑا تھا۔ دم

اس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے اور دونوں میں موت یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ یا تو غار میں کود پڑے اور یا ڈان و سنٹ کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جائے۔ اس نے پہلے کو دوسرے پر ترجیح دی اور غار میں چھلانگ لگادی۔ قلعہ کی طرف سے اسے کسی کے گولی چلانے کی آواز سنائی دی۔

اٹھتی ہوئی تیز گرم بھاپ سے ہی فریدی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی کان ہے جیالوجی سے دلچسپی رکھنے کی بناء پر اسے پورا علم تھا کہ کچی کان کس حد تک خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے پہلے اس نے ایک بار غور سے غار کی گہرائی کو دیکھا تھا۔ گرتے ہی اندر بڑی ہلکا دراڑ کی ایک چٹان پر اس نے اپنے جیر جما دیے۔ تقریباً سو فٹ نیچے گہرائی میں سرخ پانی بدبودار نالہ بہہ رہا تھا۔ اس کا کھولتا ہوا پانی اور نکلتے ہوئے سفید دھوئیں کی گرمی سے فریدی سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اندر کی لال انگارہ کی طرح سرخ چٹانیں پانی کے پڑتے ہوئے سائے اپنی سرخی کی وجہ سے زیادہ بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ چٹان پر کھڑی کھڑے فریدی نے دائیں طرف زیادہ چوڑائی دیکھ کر کھسکا شروع کیا۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے وہ اسی کی طرف بڑھ رہا۔ قدرت کا بنایا ہوا یہ راستہ بڑی دور تک اندر چلا گیا تھا۔ جب اندھیرا ناقابل برداشت ہو گیا ڈرتے ڈرتے اس نے بائیں طرف چلائی۔ دو فٹ چوڑے ایک سرنگ نما راستے سے وہ گزر رہا تھا۔ پانی کا شور اسے اب بھی ویسا ہی سنائی دے رہا تھا۔ البتہ حدت میں کچھ کمی تھی۔ فریدی چاروں طرف نظر دوڑائی اور آگے بڑھا۔ فوراً اسے اپنے اوپر ایک پتلا سا تار دکھائی دیا۔ فرخوشی سے چھل پڑا۔ اس نے فوراً تار کاٹ دیا۔ ڈائنامیٹ کے مین سوئچ سے کٹ جانے کی سے اب بچھائی ہوئی سرنگ کے پھٹ جانے کا خطرہ دور ہو گیا تھا۔ اسی تار کی سمت فریدی بھی پڑا۔ ظاہر تھا کہ یہ راستہ قلعہ کے اندر تک جاتا تھا۔ اسی سرنگ کے اندر فریدی کافی دور تک نکل گیا تھا۔ صاف ہوا نہ ملنے سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سانس پھول گئی تھی۔ اس کا سر چکرانے چاروں طرف اسے شور سنائی دینے لگا۔ جیسے پانی کی بہت تیز دھار اوپر سے گزر رہی ہو۔ کان اسے بڑی زور کا چکر آیا۔ اس نے سنبھلتا چاہا بغل والی دیوار پر اس کا ہاتھ پڑا اور بھر بھر کر ہوئے تو دے نیچے گرنے لگے۔ فریدی سنبھل کر نیچے سے ہٹا۔۔۔۔۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا انداز

فریدی کے حواس کچھ درست ہوئے۔ اس نے دیکھا چند ہی قدم پر سرخ پانی کی ایک تیز دھار اوپر سے گزر رہی تھی اور پانی نیچے کی طرف گزر کر نالہ کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ اٹھتی ہوئی گیس نے اتنا زبردست اندھیرا پھیلا رکھا تھا کہ فریدی اس کے علاوہ کچھ اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ اچانک اسے نمی سی محسوس ہوئی۔ پانی جیسے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے تحاشہ اس نے پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی بڑی چٹانیں بھی دھکیلتا گیا۔ اس طرف بھاری بھاری پتھر اپنے آپ لڑھک رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے پیچھے ہٹا گیا سرنگ پیچھے کی طرف دبی جا رہی تھی۔ پانی اب نیچے کی طرف گرنے کی بجائے پھیل رہا تھا اور گیس بھر رہی تھی۔ یہ کان پھٹ جانے کے آثار تھے۔ فریدی نے اور تیزی سے پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ وہ پھر غار کے دہانے تک آ گیا تھا۔ گرمی اور حدت سے اس کا بدن پھٹکا جا رہا تھا۔ اس نے اوپر کی طرف اچھلتا چلا۔ ذرا سا اندازہ غلط ہونے پر وہ نیچے گر جاتا۔ اس نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اسے زمین ہلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سارا زور لگا کر وہ اوپر کی طرف اچھلا اور ایک سانس میں وہ باہر تھا۔ غار سے باہر نکلتے ہی اسے اپنے قدم لڑکھڑاتے ہوئے معلوم ہوئے سارا زور لگا کر وہ چلا یا۔

”بھاگ جاؤ۔۔۔۔۔ کان پھٹ رہی ہے۔“ چیختے ہوئے وہ بے تحاشہ بھاگا۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور فریدی نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ایک جھٹکا اور لگا فریدی چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

”لگاتار دو تین گھنٹے تک دھماکے ہوتے رہے۔ زمین دہل کر اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے خزانہ کو اگلتی رہی۔ بڑی بڑی چٹانیں روٹی کے گالوں کی طرح اڑ گئیں۔ فاماگن کی فوہیں کان پھٹنے سے تھوڑی دیر قبل اسی راستے پر قلعہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کان پھٹتے ہی ارد گرد آدھے میل تک کی زمین پھٹ گئی۔ قلعہ کی فصیل تک گر پڑی مگر قلعہ محفوظ رہا۔

فریدی کو جب ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ طوفان رک گیا تھا۔ اس جگہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر ساری زمین ایک بھیانک خندق نما غار میں بدل گئی تھی۔ پانی اوپر تک ابھر آیا تھا۔ فاماگن کے ساتھی جس جگہ پر اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے وہاں سوائے گہرے نہیب غار کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ فریدی کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ اس کے بدن پر آبلے پڑ گئے تھے۔ اس سے اٹھانہ

جاتا تھا۔ ہمت کر کے وہ اٹھا اور گھسٹے گھسٹے قلعہ کی طرف چلا۔ قلعہ کی سامنے والی دیوار گر پڑی تھی اور اب صرف ایک لمبا سارا ستہ نظر آ رہا تھا۔ فریدی نے دیکھا اس کی طرف کوئی آ رہا ہے۔ فریدی اسے دیکھتے ہی چیخا۔

”حمید!“

آواز سنتے ہی حمید نے بھاگنا شروع کیا۔ فریدی کے قریب آ کر وہ ٹھک گیا۔

”ارے.....!“ حمید فریدی کی شکل دیکھ کر چلا اٹھا۔

”گھبراؤ نہیں..... میرا میک اپ بگڑ گیا ہے۔“ فریدی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہم سب لوگ تو آپ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ فریدی کو ابھی آغوش میں لینے کی ہمت زمین میں نہیں ہے۔“ حمید بولا۔ ”ذرا ٹھہریے میں اور لوگوں کو بلا لوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد ڈی گاریکا، رمونا، انور اور رشیدہ آ گئے۔ ڈان ولسٹ اور فاگان کے ہزار ہا ساتھی کان پھٹ جانے سے قلعہ اجل ہو گئے۔ قلعہ کی دیوار کے نیچے دب کر پادری بھی مر گیا تھا۔ رشیدہ نے قلعہ کی اندر کی فوج کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔

تین روز کے اندر فریدی کے زخم بھر گئے۔ پروگرام کے مطابق دوسرے ہی دن شہریوں کے عام جلسہ میں رشیدہ نے باقاعدہ طور پر رمونا کو نئی فاگانیہ بنانے کا اعلان کیا۔ ڈی گاریکا کو مقدس باپ کی جگہ دی گئی۔

اسی روز فریدی نے ڈی گاریکا کو بلا کر کہا۔ ”اب ہم لوگ جائیں گے۔“

”اور میں بھی انہیں لوگوں کیساتھ جاؤں گی۔“ رشیدہ نے کہا۔

”نہیں..... سی نور اتم نہ جاؤ۔“ ڈی گاریکا بولا۔

”میں ضرور جاؤں گی..... نئی فاگانیہ رمونا میری جگہ تمہارا ساتھ دے گی۔ مجھے جانے ہی

دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

ڈی گاریکا اصرار کرتا رہا۔ لیکن رشیدہ کسی طرح ٹھہرنے پر تیار نہیں ہوئی۔

”میں..... میں بھی البرونو کے ساتھ جاؤں گی۔“ رمونا جذبات سے بھرے ہوئے لہجہ میں

بولی۔

”تمہارے وطن کو تمہاری ضرورت ہے اور وطن کی خاطر سب کچھ قربان کر دینا چاہئے۔“ فریدی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”البرونو.....!“ اس نے فریدی کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے تھے۔ ”تم ہمیں یاد رکھو گے۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ فریدی نے گڑبڑا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حمید نے ایک زوردار ہتھکڑیاں لگایا۔



دوسرے روز حمید انور رشیدہ اور فریدی کو پورے شاہی اہتمام کے ساتھ ڈی گاریکا اور رمونا نے رخصت کیا۔ جزیرہ وائلنگ سے آگے نکل کر حمید نے اطمینان کا سانس لیا۔ فریدی کیسٹن سے لگ لگائے بیٹھا پر اسرار جزیرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ آخر رشیدہ کے مل جانے کے بعد پھر ڈی گاریکا کے ساتھ آپ کیوں گئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ایک تو نئی دنیا دیکھنے اور دریافت کرنے کا شوق.....!“

”عالمی آپ دوسرے کو لبس بننا چاہتے تھے۔“ حمید نے فریدی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ بات تو نہیں۔ مگر پھر بھی یہی سمجھ لو۔ اس کے علاوہ ایک بات کا شبہ تھا اور وہ

”رست نگلی۔“

”وہ کیا.....؟“ حمید انور رشیدہ ایک ساتھ بولے۔

”لندن میں میں نے ماہر ارضیات سے سنا تھا کہ وائلنگ کے آگے ایک پر اسرار جزیرے میں پلائٹیم اور تانبے کی کانیں ہیں اور جزیرے میں اترتے ہی مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ یہی وہ جزیرہ ہے جہاں رشیدہ مجھے ملتی تھی وہیں میں نے پلائٹیم کے ذرات پائے تھے، تم جانے ہو دنیا کی سب سے قیمتی دھات پلائٹیم ہوتی ہے۔“

فریدی رکا، انور، رشیدہ اور حمید ٹکلی باندھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ”وہ کانیں جو
 بھٹی تھیں وہ پلائنم اور تانبے کی تھیں۔ یقین کرو ان سے اتنی پلائنم پیدا کی جاسکتی ہے جتنی پوری
 دنیا اس وقت پیدا کر رہی ہے۔ عنقریب بین الاقوامی کمیشن کے تحت وہاں کام شروع کرادوں گا۔“
 فریدی خاموش ہو گیا اور جیب سے سگار نکال کر اس کا کونہ توڑنے لگا۔ پکولے لیتے ہوئے
 کشتی نیلگوں پانی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

تمام شد